سرسیّد احمد خاں
اور
اُن کا عہد
ثریّا حسین
ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

سرسیّد احمد خاں

اور اُن کا عہد

ثریّا حُسین

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

ایڈیشن ——— 2006

سرورق ——— احمد سعید خاں

136125

قیمت ——— ۲۰۰/- روپے

مطبع ——— چودھری آفسٹ پرنٹرس دہلی

SIR SYED AHMAD KHAN AUR UNKA AIHAD

By : Prof. SURRAIYA HUSAIN

Edition - 2006 Price - Rs.200/-

Published by :

Educational Book House

University Market

ALIGARH-202002

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

"لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں، میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے لئے یہ امر چنداں لحاظ کے لایق نہیں ہے کہ اُن کا مذہبی عقیدہ کیا ہے[1]۔"

[1] سر سید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء۔ ص ۱۹۹

ترتیب

تصاویر:

پیش لفظ

اوائلِ انیسویں صدی کے ہندوستان میں جو تاریخ ساز ہستیاں پیدا ہوئیں ان میں سرسیّد احمد خاں کی شخصیت کئی اعتبار سے منفرد اور ان کے مشاغل کی ہمہ جہتی اور تنوع حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے اپنے گرد وپیش کا جائزہ لیا اور اپنے عہد کے دگرگوں سیاسی حالات اور تہذیبی انحطاط بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ صورتِ حال کا معروضی انداز میں مطالعہ کرنے کے بعد ماضی کی تحقیق و تفتیش کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی تعمیرِ نو کا بیڑا اُٹھایا۔ اِس پُر آشوب دَور میں ایک فردِ واحد کا اِتنا بڑا کارنامہ ہماری ذہنی اور تہذیبی تاریخ کا ایک مہتم بالشان اور عجیب و غریب واقعہ ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر اِس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

سرسیّد احمد خاں کے متعلق مفروضات اور غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے وہ انگریز پرست نہیں تھے۔ انھوں نے سرکاری ملازمت کے باوجود یو پی کے گورنر سر ولیم میور سے ٹکر لی اور اسلام کے متعلّق یوروپین مبلّغین کے حملوں کا بے خوفی سے جواب دیتے رہے۔ البتّہ انھوں نے انگریزی تعلیم مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھی کہ جس بے رحمی سے برطانوی حکومت نے انھیں ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد کچلا تھا اس کے باعث یہ شکست خوردہ فرقہ انگریز قوم انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کو ہلاکت آفریں سمجھنے لگا تھا۔ اِن حالات میں سرسیّد نے انگریزوں

سے مفاہمت کی تلقین کی اور مغربی تعلیم کو اس تنزّل پذیر اور افلاس زدہ طبقے کی ترقی اور بقا کا ذریعہ بتایا۔ اس عمل پسند اور حقیقت شناس رویّہ کو ان کی انگریزوں سے بیجا وفاداری نہیں کہا جا سکتا۔ اُس وقت ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے مصلحین بھی انگریزوں کے مخالف نہیں تھے۔

ہم اِس کتاب میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ کیسے پیچیدہ اور بلاخیز حالات میں سرسید اپنی مہم پر نکلے اور کن مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کر کے اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ وہ خوش قسمت تھے کہ انھیں اپنے ہم خیال اور اولوالعزم ساتھی ملے جو علی گڑھ تحریک کے نورتن کہلائے۔ ان کا مختصر تذکرہ بھی اس کہانی میں شامل ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے آخر ۱۹۸۴ء میں "سرسید پروجیکٹ" کی منظوری دی جس میں دو ریسرچ اسکالر شاہدہ بیگم اور ابو صالح تین سال کی مدت کے لئے مقرر کئے گئے۔ بعد میں ڈاکٹر نیلم فرزانہ، ڈاکٹر نسرین ممتاز اور مولانا حسن سبحانی اس منصوبہ سے منسلک رہے۔

ہم بالخصوص جناب حمید اللہ ماہرِ اسلامیات کے شکر گزار ہیں کہ سرسید کے مذہبی معتقدات پر انھوں نے اپنے عالمانہ خیالات سے مستفید کیا۔ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی اور قرۃ العین حیدر کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے تحقیقی مراحل میں مدد بہم پہنچائی۔

ہمارا دارالمطالعہ "سرسید روم" مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھا جہاں مصنف کی تصانیف، مخطوطات اور ان پر تنقیدی کتابیں تقریباً سب ہی موجود ہیں ہم وہاں کے عملے اور خاص طور سے لائبریرین پروفیسر نورالحسن خاں کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمیں تمام چیزیں مہیا کیں۔ اِس کے علاوہ سرسید اکیڈمی کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے تصاویر وغیرہ فراہم کرنے میں مدد دی۔

۳۱ جولائی ۱۹۹۲ء

ثریا حسین

مقدمہ

- سیاسی و سماجی پس منظر
- سوانحی خاکہ

سیاسی و سماجی پس منظر

انیسویں صدی کا ہندوستان سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ پرانا نظام دم توڑ چکا تھا اور ایک جہانِ نو ابھر رہا تھا۔ ان تبدیلیوں کی نوعیت سمجھنے کے لئے تاریخی پس منظر کا مطالعہ اہم ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء — ۱۷۰۷ء) کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ روبہ زوال ہو گئی۔[1] مرکز کے کمزور ہونے سے صوبوں میں خود مختاری کے جذبات ابھرنے لگے اور مختلف طاقتیں

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر کے بعد بہادر شاہ اول ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء

جہاں دار شاہ کو وزیر ذوالفقار نے بادشاہ بنایا ۱۷۱۲ء۔ ۱۷۱۳ء

فرخ سیر کو اس کے وزرا سید برادران عبداللہ خاں اور حسین علی خاں نے تخت پر بٹھایا ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء

محمد شاہ ۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء

ابوالناصر احمد خاں ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء

عالمگیر ثانی ۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء

شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء

اکبر شاہ ثانی۔ ۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء

بہادر شاہ ظفر ۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء

بنگال، حیدرآباد، اودھ اور پنجاب میں خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔

حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اور سکھوں نے اس صورت حال سے فایدہ اٹھایا اور سلطنتِ مغلیہ کی سیاسی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ ۱۳ فروری ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے حکومتِ دہلی کی رہی سہی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۸ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان نو بار حملے کیے بے یقینی اور طوائف الملوکی کی فضا ہر طرف پھیل گئی اور شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔

مغرب میں ہمہ گیر سیاسی انقلابات پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔ انگلستان میں شاہ جیمس دوم کو ہٹانے کے بعد ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے سیاسی اقتدار پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آ گیا حالانکہ شاہی نظامِ حکومت بحال تھا۔

امریکہ نے اٹھارہویں صدی کے اواخر (۱۷۷۵ء تا ۱۷۸۱ء) میں جنگِ آزادی کا علم بلند کیا اور برطانوی سامراج کے شکنجے سے آزاد ہو گیا۔

انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) کے بعد ایسا نظام تشکیل پایا جس کی بنیاد حریت، اخوت اور مساوات پر قایم تھی اس کے دور رس نتائج ثابت ہوئے اور بیرونِ ملک بھی اربابِ فکر اس سے متاثر ہوئے مثلاً انگریزی شاعر ورڈز ورتھ (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۵۰ء) نے فرانس میں ایک پرکشش نئی دنیا کو جنم لیتے دیکھا تو اس کا اظہار دلچسپی سے اپنی شاعری میں کیا۔

ان بین الاقوامی سیاسی تبدیلیوں سے عام ہندوستانی نابلد تھے۔ سیاست کے نام پر ان کے پاس سوائے صوبجاتی تصادم اور خانہ جنگیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ قحط نے عوام کی حالت مزید خراب کر دی۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ ہزاروں لوگوں نے مٹھی بھر اناج کے لئے برطانوی حکام کے بھرے گوداموں کے سامنے دم توڑا۔ شاہی گھرانے کی اِس خستہ حالی پر میر تقی میر نے کہا ؎

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

اور مصحفی نے افسوس کیا کہ:

احوالِ سلاطین لکھوں کیا کہ اب آہ — یعنی کہ مہ عید اب ان کو لبِ ناں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بیچاروں کے اوپر — جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے

دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب، ظلم و بربریت کا شکار ہوا، جامع مسجد سے راجگھاٹ

دروازہ تک معلوم ہوتا تھا کہ ایک صحرا ہو۔ جہاں بربادی اور اینٹوں کے ڈھیر کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شہر کے کنوئیں لاشوں سے پٹے ہوئے تھے اور درختوں پر لٹکی ہوئی نعشوں کے گرد چیلیں اور کوّے منڈلا رہے تھے۔ بقول ظہیر دہلوی یہ عالم تھا کہ بازاروں میں:

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

اِس تاریخی شہر کے مٹنے پر سودا نے اظہارِ افسوس کیا:

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

اس صورتِ حال سے فایدہ اٹھاتے ہوئے بیرونی تجارتی کمپنیوں بالخصوص ولندیزیوں، انگریزوں فرانسیسیوں اور پرتگالیوں نے یہاں کی سیاست میں مداخلت شروع کردی اور آخر کار ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملکی اقتدار حاصل کر لیا[1]۔ اس افراتفری میں ہندوستان کا معاشرہ اور روایتی نظام درہم برہم ہو گیا، معاشرت کے طور طریق بدلے گئے، صنعت و حرفت میں انقلاب آیا، کمپنی کے تاجر دیسی چھوٹے دستکاروں سے کم قیمت پر مال خریدتے تھے اور مشینوں کی ایجاد نے گھریلو دستکاروں کو بے کار کر دیا اور کمپنی کا ملازم بننے پر مجبور کیا۔ دیہی زندگی اور زراعت میں نت نئے مسایل پیدا ہوئے جنکی وجہ سے کاشتکاروں کو پے بہ پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

شاہ عالم ثانی نے بنگال اور بہار کی دیوانی صرف چھبیس لاکھ روپے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو فروخت کر دی اور بعض علاقوں میں لگان وصول کرنے کے لیے نیلامی بھی کی گئی۔

گورنر جنرل کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں استمراری بندوبست (پرمانٹ سیٹلمنٹ) رائج کیا جس کی رو سے لگان وصول کرنے والوں کو زمین کے مالکانہ حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔ اس طریقِ کار سے کمپنی کی آمدنی میں استحکام آیا۔ سماج کے کمزور طبقے، عورتیں، بچے اور نیچی

---

[1] اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں انگریز اور فرانسیسی ہندوستان سے پرتگالیوں اور ولندیزیوں کو نکال دینے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر انگریز نے سیاسی چالوں کی بنا پر فرانسیسیوں سے بھی چھٹکارا پا لیا۔

ذات کے اشخاص مذہبی پابندیوں اور سوشل ریت رواج کی جکڑ میں پھنسے تھے۔ سماج کے نام لیوا اونچے طبقے کے افراد ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرتے۔ کوئی ان کا پُرسان حال اور مددگار نہ تھا۔

اس وقت ہندوستان میں ایک روشن دماغ اور بہادر شخص ٹیپو سلطان (۱۷۴۹ء-۱۷۹۹ء) نظر آتا ہے۔ میسور کا یہ جری حکمراں ٹیپو فرانسیسی انقلابی پارٹی "جیکوبن کلب" کا رکن بنا۔ اس نے امریکہ کے انقلابیوں کی بھی حوصلہ افزائی کی اور اپنی راجدھانی سرنگاپٹم میں شجرِ حریت بطور علامت لگایا اور ایک ہفتہ وار "فوجی اخبار" شروع کیا جس کے اداریوں میں برطانوی سامراج کی زیادتیوں کی مذمت کی جاتی تھی۔ ۱۷۹۲ء سے لڑائیوں کا سلسلہ برابر چلتا رہا اور آخر کو ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان سرنگاپٹم میں بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ "فوجی اخبار" بند ہو گیا۔ اس کے پرانے شمارے تلف کر دیے گئے اور پریس ضبط ہو گیا۔ یہ اردو کا پہلا پریس اور اخبار تھا جس نے اپنے بانی سلطان ٹیپو کی مانند وطن کی آزادی اور سرفروشی کے جذبات کو عام کیا۔

۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کر لیا تو کمپنی نے شاہ عالم ثانی سے ایک نیا معاہدہ کیا جس کے نتیجہ میں سلطنتِ مغلیہ دہلی شہر اور مہرولی تک رہ گئی۔ پھر اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد میں یہ اور سمٹ کر صرف قلعۂ معلّٰی تک محدود ہو گئی۔

ہندوستانیوں کو پستی سے نکالنے اور بے بسی سے نجات دلانے کی جو کوششیں کی گئیں اس کی ابتدا شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کی اصلاح دین کی تحریک سے ہوئی۔ مسلمانوں میں سیاسی شعور شاہ ولی اللہ اور ان کے گھرانے کی بدولت پیدا ہوا۔ انھوں نے شہنشاہیت کے خلاف آواز اٹھائی اور عوام کو بیدار کیا۔ ان کی وہابی تحریک کا ترقی پسند پہلو یہ تھا کہ وہ عوام کی سیاسی نظام میں شرکت ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے بیٹے اور جانشین شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء-۱۸۲۴ء) نے اور آگے بڑھ کر غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ انیسویں صدی میں مولوی شریعت اللہ[1] نے بنگال میں "فرائضی تحریک" کی داغ بیل ۱۸۲۰ء میں ڈالی جس کا

---

[1] شریعت اللہ ضلع فرید پور (بنگال) کے باشندے تھے۔ انسان دوست اور عمل پسند شخص تھے۔ جب وہ ۱۸۲۰ء میں حج کر کے وطن واپس آئے تو قوم کی اصلاح میں منہمک ہو گئے۔

مقصد بھی اصلاحِ مذہب تھا۔ اس میں پیر و مرید کی جگہ استاد اور شاگرد کے لفظوں کا استعمال ہوا۔ یہ جماعت کاشتکاروں، اہلِ حرفہ اور عوام کی فلاح کے لئے ظہور میں آئی۔ جس کے ذریعہ زمیندار اور اونچے طبقے کے استحصال کے خلاف غریب اور بے بس عوام کی حمایت کی گئی۔ شریعت اللہ کے بیٹے دودو میاں اُن کے جانشین ہوئے اور اس مہم کو جاری رکھا مگر فرائضی تحریک زیادہ تر بنگال تک مروج و مقبول ہوئی اور اس کا دائرۂ عمل دوسرے علاقوں تک نہ پھیل سکا۔

بنگال سب سے پہلے انگریزوں کے حلقۂ اقتدار میں آیا، یہیں سے بیشتر اصلاحی اور انقلابی تحریکیں شروع ہوئیں۔ مثلاً راجہ رام موہن رائے[1] نے اصلاحِ قوم کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے مختلف مذاہب اور علوم سے واقفیت پیدا کی اور اسلامی تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا اور عالمی مذہب کا تصور پیش کیا جس کی بناء توحید پر رکھی۔ اس کی تفصیل ان کی کتاب "تحفۃ الموحدین" (۱۸۰۳ء) میں ملتی ہے۔ سید احمد خاں اس غیر معمولی مصلح سے متاثر ہوئے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ

"کلکتہ کے بابو رام موہن رائے کو جو نہایت لائق، ذی علم، متین و مہذب شخص تھے اور برہمو سماج کے بانی تھے اس ارادے سے بلایا گیا کہ بادشاہ[2] کی طرف سے وکیل کر کے لندن بھیجا جاوے چنانچہ وہ دلی آئے اور بادشاہ کی ملازمت کی اور ان کو راجہ کا خطاب بادشاہ کی طرف سے دیا گیا۔ آخر کار وہ بادشاہ کے وکیل ہو کر لندن بھیجے گئے اور

---

[1] رام موہن رائے ۱۷۷۲ء میں ضلع بردوان (بنگال) کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے خدائے واحد کے تصور ماننے پر بیٹے کے خیالات سے ناراض ہو کر انھیں گھر سے نکال دیا انھوں نے بنارس میں رہ کر سنسکرت زبان و ادب میں مہارت حاصل کی پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی اور رنگ پور کے دوران ملازمت مغربی ادبیات و علوم کی تحصیل کی جس میں ان کے دوست جان ڈگبی نے ہر طرح مدد کی۔ ۱۸۱۵ء میں ایک اصلاحی جماعت "آتمیا سبھا" بنائی پھر برہمو سماج کی تحریک شروع کی۔

[2] یہاں بادشاہ سے مراد سراج الدین بہادر شاہ ظفر ہیں۔

۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ھ کے لندن پہنچے اور ۱۸۳۳ء مطابق ۱۲۴۹ھ کے وہیں مر گئے۔[1]

شمالی ہند میں سید احمد بریلوی[2] کی سیاسی تحریک پر شاہ ولی اللہ کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دینے کی سب سے زیادہ منظم کوشش تھی۔ انھوں نے بھی اپنے ملک کو دارالحرب سمجھا۔ اس تحریک کی نوعیت راجہ ہندو راؤ ہولکر کو لکھے گئے ایک خط سے واضح ہو جاتی ہے کہ:

"بیگانگاں بعیدالوطن، ملوک زمین و زمن گردیدہ اند و تاجران متاع فروش بپایہ سلطنت، امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار بر باد نمودہ ... چوں اہل ریاست و سیاست در زاویہ خمول نشستہ اند، ناچار چندے اہل فقر و مسکنت کمر بستہ ... کہ میدان ہندوستان از بیگانگاں و دشمنان خالی گردیدہ و تیر سعی الشاں بر ہدف مراد رسیدہ۔ آیندہ مناصب ریاست و سیاست بطالبیں آں مسلم باد"[3]

"پردیسی سمندر پار کے باشندے دنیا جہاں کے مالک بن گئے اور مال بیچنے والے تاجر سلطنت پر قابض ہو گئے۔ بڑے امیروں اور رئیسوں کی ریاست برباد ہوئی۔ جو حکومت و سیاست کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے بس بیٹھے ہیں اس لیے مجبوراً چند غریب اور اہلِ فقر کمر بستہ ہو گئے۔ جس وقت ہندوستان غیر ملکیوں اور دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں کامیاب ہوں گی تو حکومت

---

[1] سید احمد خاں "سیرۃ فریدیہ" مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء ص ۳۰

[2] سید احمد شہید ۱۷۸۶ء میں شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز سے سلوک و طریقت کی تعلیم حاصل کی اس تحریک کے دو گروہ ہو گئے۔ انھوں نے دونوں گروہوں کے مابین نظریاتی اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مولوی عبدالحئی، کرامت علی اور ان کے پیرو کار اہل سنت والجماعت کہلاتے تھے۔ دوسرے گروہ کے سرخیل مولوی اسماعیل شہید تھے جو چاروں فقہی اماموں کی تقلید سے آزاد اہل حدیث کہلاتے تھے۔

[3] مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" ص ۲۰۳ - ۲۰۴

کے منصب اور عہدے ان کو ملیں گے جو ان کے خواہش مند ہوں گے"۔)

افسوس کہ انگریزوں کی حکمت عملی سے اس تحریک کا رُخ سکھوں کے خلاف جنگ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان کی جماعتِ مجاہدین کے ایک رکن مولوی محمد جعفر تھانیسری کو توڑ لیا گیا جنھوں نے سید احمد بریلوی کے خطوں میں کتر بیونت کی کہ "نصاریٰ" اور "فرنگ" کے الفاظ کو "سکھ" سے بدل دیا[1]۔ یہ تحریک سارے شمالی ہند میں پھیل گئی تھی۔ ان کے پیرو کار عنایت علی، ولایت علی اور اسماعیل شہید نے ان کے مشن کو ختم نہ ہونے دیا اور سید احمد بریلوی شہید کے انتقال کے بعد بھی عرصہ تک جھڑپیں ہوتی رہیں۔

انگریزوں کی آمد نے جہاں تخریبی رجحانات کو بڑھاوا دیا وہیں اس کے کچھ تعمیری پہلو بھی سامنے آئے۔ مثلاً انیسویں صدی میں ریل، تار برقی، بجلی چھاپہ خانہ اور دیگر جدید ایجادات نے ملک کو بالواسطہ فایدہ پہنچایا۔ ہر چند کہ یہ سہولتیں انگریزوں نے اپنے لئے فراہم کی تھیں مگر رفتہ رفتہ ہندوستانی بھی ان سے مستفید ہوئے اور ملک میں جدید تمدن کی راہ ہموار ہوئی۔

(۲)

عیسائی مبلغین ہندوستان میں ۱۶۴۲ء سے آرہے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد تو عیسائیت کی تبلیغ تھا مگر انھوں نے علم و ادب، مذہب و ثقافت پر بھی خاص توجہ کی اور یہاں کی معاشرت اور علوم و فنون پر کتابیں لکھیں۔ ان کے علاوہ کمپنی کے چند اعلیٰ تعلیم یافتہ افسروں نے بھی مشرقی علوم کی بازیافت کی مثلاً "رایل ایشیاٹک سوسائٹی" کے بانی ولیم جونس (۱۷۴۶ء - ۱۷۹۴ء) نے کالیداس کے ناٹک "شکنتلا" کا انگریزی ترجمہ کیا اور دیگر تصانیف کے ساتھ ساتھ ہندوستانی قوانین کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا۔ اشاعت مذہب کے علاوہ اہلِ فرنگ نے خدمتِ خلق کے فرایض انجام دیے۔ تعلیمی ادارے اور ہسپتال کھولے۔ اس سے قبل ملک میں صرف پاٹھ شالائیں اور دینی مدارس تھے جن میں قدیم علوم پر مشتمل سنسکرت، عربی اور فارسی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں بنگال اور بہار کے مدرسوں، دلی کے مدرسہ رحیمیہ، لکھنؤ کے فرنگی محل اور

---

[1] غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید جلد اول شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور اشاعت سوم ۱۹۶۸ء ص ص ۲۴۸ - ۲۴۹

خیر آباد کے مدرسے قابلِ ذکر ہیں۔ بالخصوص فرنگی محل کا "درس نظامی" اپنے بانی ملا نظام الدین کی نسبت سے مشہور ہے جو ۱۷۱۳ء میں رائج ہوا۔ بقول مولانا شبلی۔

" نصاب میں ہندوستان کے علماء کی متعدد کتابیں داخل ہیں مثلاً "نورالانوار مسلم" "مسلم رشیدیہ" اور "شمس بازغہ"[1] حالانکہ اس سے پہلے یہاں کی ایک تصنیف بھی درس میں داخل نہ تھی۔ منطق و فلسفہ کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زیادہ ہیں۔ حدیث کی صرف ایک کتاب ہے یعنی مشکواۃ "[2]

درس نظامی طالب علموں میں ذہنی استعداد پیدا کرنے، اخلاقی جرأت اور مادی ترقی حاصل کرنے کی ایک اہم کوشش تھی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جاگیرداری کا خاتمہ ہو گیا جس سے مدرسوں کو مالی مدد بہم پہنچتی تھی اور اب اوقاف کی آمدنی سے یہ مدرسے انیسویں صدی کے آخر تک برقرار رہے لیکن انگریزی حکومت کے قیام سے ان پر بھی زوال آیا۔

انگریزوں نے سرکاری ملازم تیار کرنے اور دیگر اغراض کی تکمیل کے لیے انگریزی تعلیم کی بنیاد ڈالی ۱۷۸۱ء میں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے اسلامی تمدن کی تدریس کے لئے کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ قائم کیا۔ مشرقی علوم کی ترویج کے لئے "بنگال رایل ایشیاٹک سوسائٹی" ۱۷۸۴ء میں وجود میں آئی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے دس سال بعد ۱۷۹۱ء میں جوناتھن ڈنکن نے ہندو قانون اور فلسفہ کو پڑھانے کے لئے سنسکرت کالج بنارس میں کھولا۔ ماہر سنسکرت لبشپ کیری ۱۷۹۳ء میں تبلیغ عیسائیت کے لیے کلکتہ آیا اور اس کی مدد کے لئے دو نوجوان بپٹسٹ مشنری مارشل اور وارڈ بھی آئے جو سیرام پور بنگال میں بس گئے۔ ان پادریوں نے ۱۷۹۹ء میں نجی مدارس کھولے۔ ۱۸۰۰ء میں "فورٹ ولیم کالج کلکتہ" کا قیام عمل میں آیا جس میں بحکم گورنر جنرل ولزلی سنسکرت کا پروفیسر لبشپ کیری کو مقرر کیا گیا۔ ۱۸۰۰ء کے اعلان کے مطابق کمپنی کی حکومت نے مذہب کے

---

[1] یہ کتابیں بانی مدرسہ ملا نظام الدین کے شاگردوں کی تصانیف تھیں۔

[2] شبلی نعمانی مقالات شبلی (تعلیمی جلد سوم) مطبع معارف ندوۃ المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء ص ۱۲۸

معاملہ میں غیر جانب داری کا رویہ اختیار کیا اور ۱۸۰۹ء میں ایک فلاحی ادارہ کلکتہ میں قایم کیا گیا اور مشنریوں کو ہندوستان میں ۱۸۱۳ء تک رہنے کی اجازت دی گئی۔ ان مختلف اداروں کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو انتظامی امور میں سہولت بہم پہنچائی تھی۔ ۱۸۱۱ء میں گورنر جنرل لارڈ منٹو نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کی توجہ ہندوستان میں تعلیمی ضرورت کی طرف مبذول کرائی۔ ۱۸۱۳ء میں اس مقصد کے لئے ایک لاکھ روپے کی تعلیمی امداد منظور ہوئی۔ لارڈ موآر (MOIR) نے ۲ اکتوبر ۱۸۱۵ء کو حکم جاری کیا کہ ہندوستانیوں کے ذہنی اور اخلاقی سدھار کے لئے اسکول کے نصاب میں حسب ضرورت تبدیلی کی اجازت ہے اور اس سلسلے میں ضروری اقدام کی رپورٹ براہ راست کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے آنی چاہیے تاکہ اس پر بلا تاخیر عمل درآمد ہوسکے۔ وہ نومبر ۱۸۱۵ء میں مشنریوں کی سرگرمیوں کے معائنہ کے لئے سیرام پور گیا اور ان کی ہمت افزائی کی۔

۱۸۱۶ء میں کلکتہ کے شہریوں نے ایک "ودیالہ" یا اینگلو اورینٹل کالج شروع کیا[1] جس سے بنگال میں جدید طریقۂ تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ پہلا انگریزی اسکول تھا جو ہندوستانی بچوں کو انگریزی زبان و ادب پڑھانے کے لئے قایم کیا گیا تھا اور جس کی تاسیس میں رام موہن رائے پیش پیش تھے تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ترقی دیکھ کر انگریز بھی مالی تعاون دینے پر مجبور ہوئے اس اسکول کی معلمی پر ڈیوڈ ہیر[2] ۱۸۱۷ء میں کلکتہ آیا اور اسی سال 'کلکتہ اسکول بک سوسائٹی'، کا وجود عمل میں آیا تاکہ کتابوں کی اشاعت سے ہندوستانیوں کی دماغی اور عملی صلاحیتوں کو ابھارا جاسکے۔

جے نرائن گھوشال نے ۱۸۱۸ء میں ایک 'انگلش اسکول' بنارس میں کھولا۔ کلکتہ سنسکرت کالج ۱۹۲۱ء میں ایچ ایچ ولسن کی سفارش پر قایم ہوا اور اسی سال ہندو کالج پونہ اور آگرہ کالج

---

[1] اسی کو "کلکتہ ہندو کالج" بھی کہتے ہیں۔

[2] ڈیوڈ ہیر تعلیم کے بڑے حامی، ترقی پسند اور مہربان انسان تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے ذہنی طور پر بہت قریب تھے! انھوں نے ہونہار طلباء کا ایک ایسا حلقہ تیار کیا جو طرزِ کہن کا مخالف تھا۔ فرسودہ مذہبی روایات کا مذاق اڑاتا اور جہالت کی مذمت کرتا تھا۔ یہ لوگ "نوجوانِ بنگال" کے نام سے معروف ہوئے۔

۱۸۲۳ء میں شروع ہوئے پھر مدراس اور بمبئی میں اسکول کھلے۔ ۱۸۲۱ء میں جب حکومت نے کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن، کلکتہ میں بنائی تو ولسن رکن مقرر ہوئے اور بعد میں اس کے سکریٹری ہو گئے ۱۸۲۵ء میں انگریزی تعلیم کے فروغ کے لئے "دلی کالج" وجود میں آیا۔

صحافت کی ابتداء نے بھی ملک کی صورتِ حال کو بدلا۔ انگریزی زبان میں تو اخبارات نکل رہے تھے ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے اردو اخبار "جام جہاں نما" کا اجرا ہوا پھر رفتہ رفتہ مختلف شہروں سے اخبارات میں اضافہ ہونے لگا۔ ۱۸۳۶ء میں "دہلی اخبار" جاری ہوا اور یہ سلسلہ پھیلتا گیا جو عوام کی آگاہی اور ذہنی کشادگی کا باعث ہوا۔ دلی کالج کی "ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" نے ۱۸۴۲ء میں علمی کتابوں کے تراجم کی مہم شروع کی جس سے ہندوستان میں عربی علوم وفنون اور ان کا روز رجحان سے واقفیت کا شوق بڑھا اور لوگوں کو وہاں کی کتب کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ وسائل آمدورفت کے بہتر ہونے سے بھی زندگی میں سہولت پیدا ہوئی۔

مغربی علوم وفنون کی اشاعت کے لئے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا ضروری تھا جس کے پیشِ نظر برطانوی پارلیمنٹ نے کچھ قوانین منظور کئے۔ ایک فیصلہ کی رو سے لارڈ میکالے کو گورنر جنرل کی کاؤنسل کا قانونی رکن (مشیر) مقرر کر کے ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ مشرقی علوم سے ناواقف اور ان کا مخالف تھا اس نے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے ۱۸۳۵ء میں ایک یادداشت تیار کی جو اتنی پُرزور تھی کہ اس نے گورنر جنرل لارڈ بنٹنک کو بہت متاثر کیا اور اس کی صدارت میں جب ۷، مارچ ۱۸۳۵ء کی کونسل کی ایک نشست میں یہ پیش ہوئی تو طے کر دیا گیا کہ ہندوستان میں جدید تعلیم انگریزی کے ذریعہ ہوگی۔ اس تاریخی قرارداد کی خاص دفعات حسب ذیل ہیں۔

۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی رائے ہے کہ حکومت برطانیہ کا مقصد اہل ہند میں یورپی ادب اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے، اور تعلیم کے لئے جس قدر رقم مخصوص ہے وہ اب صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہیے۔

اس سے صدر کونسل کا یہ منشا نہیں ہے کہ دیسی تعلیم کے ایسے مدرسے یا کالج کو توڑ دیا جائے جس کی تدریس سے دیسی لوگوں کو فایدہ پہنچتا ہو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل طلبا کو نبرمانۂ تعلیم وظائف دینے کے قطعاً حق میں نہیں ہیں اور جب زیادہ مفید علوم کی تعلیم ہوگی تو خود ہی سبب اس کی

طرف رجوع ہوں گے۔ اس لئے ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی طالب علم کو کوئی وظیفہ نہ دیا جائے۔ جب کبھی مشرقی تعلیم کے پروفیسر کی جگہ خالی ہو تو اس کی رپورٹ حکومت کو کی جائے اور طلباء کی تعداد سے بھی مطلع کیا جائے تاکہ حکومت اس کے جانشین کے تقرر پر غور کر سکے۔

- ہز لارڈ شپ بہ اجلاس کونسل کو اطلاع ملی ہے کہ کمیٹی نے خطیر رقم مشرقی کتب کی اشاعت پر صرف کی ہے آیندہ کے لئے ہدایت کی جاتی ہے کہ اس پر کوئی پیسہ نہ خرچ کیا جائے۔

- ہز لارڈ شپ کی مزید ہدایت ہے کہ ان اصلاحات کی رو سے کمیٹی تمام روپیہ آیندہ دیسی لوگوں میں انگریزی کے ذریعے انگریزی ادب و سائنس کی تعلیم پر صرف کرے اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ حکومت کو پیش کرے[1]

ان تجاویز پر ہنگامہ ہوا مگر تعلیمی کمیٹی کو ان پر عمل کرنا پڑا اور یہ احکامات ملک میں نافذ کر دیئے گئے۔ انیسویں صدی کے وسط تک کالجوں کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہیں تھی کیونکہ حکومت تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر تیار نہ تھی۔ ان میں اہم کلکتہ، بمبئی اور مدراس پریذیڈنسی کالج، لندن یونیورسٹی کے نمونے پر تھے۔ پھر جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی، جولائی ۱۸۵۷ء میں بمبئی یونیورسٹی اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں مدراس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ان تین یونیورسٹیوں کے بعد پنجاب یونیورسٹی کالج لاہور ۱۸۶۶ء میں اور الٰہ آباد یونیورسٹی ۱۸۸۷ء میں قایم ہوئی۔

(۳)

ہندوستانی معاشرہ میں جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اس نے ۱۸۵۷ء میں بڑی تشویشناک صورت اختیار کر لی۔

سید احمد خاں نے اس کا تجزیہ کیا کہ:

---

1) SYED MAHMOOD : A HISTORY OF ENGLISH EDUCATION IN INDIA, BAPTIST PRESS CALCUTTA AND SOLD BY M.A.O. COLLEGE PRESS, 1895, P. 51-52.

"بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہوگیا تھا صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سالِ گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی۔"[1]

اس ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ملک کے مختلف علاقوں کے سپاہی، زمیندار، کسان اور دستکار نے مشترکہ طور پر انگریزوں کے ہندوستان سے اخراج کی کوشش کی۔ اس تصادم کی ایک وجہ امراء اور صوبیداروں میں بے اطمینانی کی لہر تھی کیونکہ انگریزوں نے ان سے من مانے وعدے کرکے توڑ دیے تھے۔ پھر سندھ اور اودھ کا الحاق کر لیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کی دست اندازانہ پالیسی نے ۱۸۵۴ء میں جھانسی کی ریاست کو سلطنتِ انگلشیہ میں شامل کر لیا اور اسی سال پیشوا باجی راؤ دوم کی وفات کے بعد ان کے لے پالک بیٹے کو حکومت نے پنشن دینے سے انکار کر دیا اور شاہی خاندانوں کے دیگر افراد بھی جانشینی سے محروم کر دیے گئے۔ سپاہی شاکی تھے کہ فوج میں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر انگریز فائز تھے اور دیسی سپاہیوں کی تنخواہیں قلیل ہوتی تھیں اور محاذِ جنگ پر بھی کوئی بھتہ نہیں ملتا تھا اور ان کے مذہبی احساسات کو بھی مجروح کیا جاتا تھا۔ ان وجوہ کی بناء پر انگریزوں سے نفرت کا جذبہ بڑھا اور بہادر شاہ ظفر یکجہتی کی علامت قرار دیے گئے اور ملک کی آزادی کی خاطر ہندو مسلمان دوش بدوش لڑے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو شورش میرٹھ سے شروع ہوئی اور چاروں طرف پھیل گئی۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریز فوج نے دہلی پر اور پھر لکھنؤ پر قبضہ کیا۔ حضرت محل اودھ میں تحریک آزادی کی تنظیم کرتی رہیں اور شکست کے بعد نیپال چلی گئیں۔

یہ ایک سیاسی نظام کا خاتمہ ہی نہ تھا بلکہ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کا تہذیبی سرمایہ بھی برباد ہوگیا اور علم و ہنر کے مراکز تباہ ہوگئے۔ غالب نے ایک خط میں اس حالِ زار کا نقشہ کھینچا:

"دلی واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔"[2]

---

[1] سید احمد خاں۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند۔ مفصلائٹ گزٹ پریس آگرہ ۱۸۵۹ء ص ۳

[2] خطوط غالب۔ غلام رسول مہر۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور صفحہ ۲۶۸

انھوں نے اپنے ایک اور خط بنام علاء الدین احمد خاں میں لکھا :

گھر سے بازار سے نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

نئے زرعی قوانین اور مشینوں کی ایجاد سے بیروزگاری بڑھی۔ علماء کی ملازمتیں چھین لی گئیں ریاستی افواج معطل کسان اور اہل حرفہ تباہ حال تھے۔ راسخ نے اس تباہی کا ذکر کیا :

ہنر مند کا ہے جگر ریش ریش — نہیں جاتا اب کوئی پیشہ بھی پیش
گدائی کا کاسہ لیے در بدر — ہیں آوارہ اربابِ فضل و ہنر

ہنگامہ فرو ہونے اور حالات بہتر ہونے پر حکومت نے عوام کو یقین دلایا کہ ان کے مذہب اور رسم و رواج کا تحفظ کیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کی تعلیم و قابلیت کی مناسبت سے ملازمتیں دی جائیں گی۔ اور ترقی بھی اسی بنا پر ملے گی۔ نوابوں اور راجاؤں کے ریاستی معاملات میں دخل اندازی نہیں کی جائے گی مگر ساتھ ہی ساتھ "حکومت کرو اور پھوٹ ڈالو" کی پالیسی بھی اختیار کی اور اخوت و مساوات کی فضا کو مسموم کیا تاکہ ۱۸۵۷ء کی متحدہ جنگ آزادی کی پھر کبھی نوبت نہ آسکے اور ملک میں باہمی منافرت کو بڑھاوا ملا۔ سماجی اصلاح سے چشم پوشی کی گئی اور حکومت نے صرف اپنا مفاد پیشِ نظر رکھا۔

اب ہندوستانی مغربی ادب اور دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقف ہو رہے تھے۔ ژاں ژاک روسو، تھامس پین اور جان اسٹورٹ مل کی کتابیں آزادی، سماجی شعور، مساوات، وطنیت اور آزادیٔ نسواں کے موضوع پر تھیں ان کے تراجم کے مطالعہ نے قومیت کے جذبے کو ابھارا اور قومی تحریک کے رجحان کو فروغ ملا۔

۱۸۶۳ء میں نواب عبد اللطیف (۱۸۲۸ء - ۱۸۹۳ء) نے اصلاح قوم کے خیال سے "محمڈن لٹریری سوسائٹی" کلکتہ میں قایم کی۔ معاشرہ میں سید احمد شہید کے پیدا کردہ جاں فروشی کے جذبے کی جڑیں ایسی پیوست تھیں کہ اس کے نتیجے میں مدرسہ دیوبند ۱۸۶۶ء میں ظہور پذیر ہوا، علماء میں مولانا احمد اللہ شاہ، حاجی امداد اللہؒ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید گنگوہی،

مولانا فضلِ حق خیر آبادی اور عبدالقادر لدھیانوی قابلِ ذکر ہیں۔

ہمارے مصلحین نے حالات کے پیشِ نظر قومی اتحاد کی کوشش کی۔ اسی لئے غدر کے بعد کی اصلاحی تحریکات نے باہمی اتفاق کے جذبات کو ابھارا۔ غلط رسم و رواج اور جھوٹی مذہبی روایات کی مخالفت کی۔ معاشرے کے کمزور افراد کی حمایت کی۔ سماجی مساوات کے جدید تصوّر کے ساتھ مذہب کے کٹّر پن کے خلاف احتجاج کیا۔ راجہ رام موہن رائے کے پیرو دیوبندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر (۱۸۳۸ء۔ ۱۸۸۴ء) نے بلاتفریقِ مذہب تعلیم پر زور دیا اور ذات پات کی جکڑ بندیوں کو غیر ضروری بتایا۔ اس غایت سے انھوں نے بمبئی، مدراس اور شمالی ہند کے دورے ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۸ء کئے۔ دھرلو نایڈو نے ۱۸۶۴ء میں 'مدراس وید سماج' کی بنیاد ڈالی اور مہادیو گووند راناڈے نے 'بمبئی پرارتھنا سماج' ۱۸۶۶ء میں قایم کی اور 'برہمو سماج' کی تبلیغ ترجموں کے ذریعے تامل، تلیگو اور مراٹھی میں کی گئی۔ شمالی ہند میں سوامی دیانند (۱۸۲۴ء۔ ۱۸۸۳ء) نے آریہ سماج کا پرچار ۱۸۷۵ء سے شروع کیا اور گھریلو دستکاریوں اور دیسی صنعتوں کو سکھانے کے لیے اسکول کھولے۔ کیشب چندر سین کی ملاقات ۱۸۷۶ء میں رام کرشن پرم ہنس (۱۸۳۴ء۔ ۱۸۸۶ء) سے ہوئی تو وہ ان کی جید شخصیت اور علم و فضل سے بڑے متاثر ہوئے۔ ان سب لوگوں نے وقت کے ساتھ مذہب میں ضروری تبدیلی اور اصلاح کی کوششیں کیں۔ ان کے علاوہ سریندر ناتھ بنرجی نے 'انڈین ایسوسی ایشن' کی بنیاد کلکتہ میں رکھی پھر ۱۸۸۳ء میں راناڈے نے 'انڈین نیشنل سوشل کانفرنس' کلکتہ میں قایم کی اور جب ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز ہیوم نے 'انڈین نیشنل کانگریس' کی داغ بیل ڈالی تو دونوں کے جلسے ساتھ ساتھ ہونے لگے اور 'کانگریس' کے ذریعہ ہندوستانیوں کے لئے مزید حقوق کا مطالبہ کیا گیا۔

سوامی رام کرشن پرم ہنس کی وفات کے بعد ان کے فلاحی کاموں کی ترویج کے لئے ۱۸۸۶ء میں 'رام کرشن مشن' بنایا گیا۔ ان کے پیروکار سوامی وویکانند (۱۸۶۸ء۔ ۱۹۰۲ء) نے مغربی فلسفہ اور جدید خیالات کی روشنی میں اپنے ہم وطنوں کو معاشی بدحالی اور جہالت سے نجات دلانے کی عملی کوشش کی اور تعلیمِ نسواں کو ضروری بتایا۔ انھوں نے ملک اور بیرونِ ملک ویدانت کے عالمگیر نقطۂ نظر کو متعارف کرایا اور اس مشن کی سرگرمیاں بین الاقوامی

نوعیت اختیار کر گئیں۔

آخر انیسویں صدی کے اس شکست وریخت کے دور میں مسلمانوں نے بھی اپنے تشخص کی بازیافت کی کوشش کی۔ ان میں سید احمد خاں ذہنی بیداری کی ایک علامت ہیں۔

انسانی فکر کی تشکیل اور اس کے عمل کی سمت متعین کرنے میں ماحول اور گرد و پیش کے حالات کا دخل ہوتا ہے۔ سید کی زندگی کا رُخ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستاخیز سے متاثر ہوا۔ منشی سراج الدین ایڈیٹر سرمور گزٹ (جنھوں نے ان کی تقاریر کو ان کی حیات میں مرتب کر کے شایع کر دیا تھا۔) نے اپنے دیباچہ میں لکھا:

> "۱۸۵۷ء کے غدر نے سید احمد خاں کی طبیعت کے ساتھ وہ کام کیا جو ایک بجلی گرنے کے واقعہ نے لوتھر کے ساتھ کیا تھا۔"[۱]

مارٹن لوتھر نے صرف ایک فرد کو نذر آتش ہوتے دیکھا تھا۔ مگر سید احمد خاں نے اپنی پوری قوم کو آگ اور خون کے دریا سے گذرتے ہوئے دیکھا اور سامراجی اقتدار نے جس طرح پورے ملک کو انتقامی شعلوں میں جھونک دیا تھا وہ سب اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ انھوں نے مایوسی کے باوجود عزم اور حوصلے سے سیاسی اسباب پر غور کیا، مشرق اور مغرب کے حالات پر نظر ڈالی اور بالآخر قوم کے لئے پُرانی تعلیم، قدامت پرستی اور بے عملی کو ترک کر دینے میں فلاح دیکھی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کو جن دُشواریوں سے گذرنا پڑا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہی حال اس دور کے دیگر ایشیائی ممالک میں بھی نظر آتا ہے۔ اور اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کی تدابیر بھی ان ملکوں میں مشترک تھیں:

> "ترکی میں مدحت پاشا اور فواد پاشا، ایران میں حجۃ الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی مصر میں مصطفےٰ کمال، تیونس میں خیر الدین پاشا، الجیریا میں امیر عبد القادر سنوسی، نجد میں مولانا عبد الوہاب کے حلقۂ فکر کے اکابر، طرابلس میں امام محمد

---

[۱] سرسید کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی محمد سراج الدین۔ کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء صفحہ ۲

افغانستان میں سید جمال الدین حسینی، روس میں مفتی خاں اور ہندوستان میں سید احمد خاں نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا۔"[1]

مشرق کے اس بحرانی دور میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ کسی قوم میں معاشرتی اور اقتصادی استحکام اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب جدید مغربی علم و فن کو مشرقی علوم و اقدار کے ساتھ ساتھ حاصل کیا جائے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ضروریاتِ زمانہ اور احساساتِ قومی نے علی گڑھ تحریک کو جنم دیا۔

---

[1] خلیق احمد نظامی: سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۲ء صفحہ ۶۲

سوانحی خاکہ

سیّد احمد خاں کی حیات و شخصیت کے اب تک بے شمار نقوش پیش کیے جا چکے ہیں۔ لفٹننٹ کرنل جی۔ ایف۔ آئی گراہم نے سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں ان کی سوانح عمری انگریزی میں شائع کی۔ انھوں نے دیباچہ میں لکھا کہ وہ تقریباً پچیس سال سے سرسیّد احمد خاں کو اپنا قریبی دوست سمجھتے ہیں اور ان کے تصنیفی مشاغل سے وابستہ رہے ہیں۔[1]

خواجہ الطاف حسین حالی کی زندہ جاوید تصنیف "حیاتِ جاوید"، نامی پریس کانپور سے ۱۹۰۱ء میں چھپی۔

سیّد احمد ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے وہ بچپن سے ہی تندرست تھے۔ ان کے نانا خواجہ فریدالدین نے جب پہلی بار نواسہ کو دیکھا تو بے اختیار کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے"۔[2] بڑے ہونے پر وہ گورے چٹے، کشیدہ قامت اور ہاتھ پیر

---

[1] جی۔ ایف۔ آئی گراہم۔ "سیّد احمد خاں۔ حیات و کارنامے"، ولیم بلیک ووڈ اینڈ سنز ایڈنبرا اور لندن ۱۸۸۵ء ص ۴۔ دوسرا ایڈیشن ہوڈر۔ لندن۔ ۱۹۰۹ء۔

اس کے علاوہ ایک مصری عیسائی عالم نے ۸۰ صفحوں پر مشتمل سوانح عمری لکھی جس کا اردو ترجمہ منشی محمد فاروق انصاری نے ۱۹۰۲ء میں مطبع احمدی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اور محمد ابن زبیری کی قابلِ ذکر تصنیف "تذکرہ سرسیّد"، حیات سے متعلق ہے جو ۱۹۶۱ء میں یونائیٹڈ پبلشرز لاہور سے طبع ہوئی۔

[2] الطاف حسین حالی۔ حیاتِ جاوید مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۲۲ء ص ۴۲

کے مضبوط نکلے۔ سیّد احمد نے تیراکی اور تیراندازی اپنے والد سے سیکھی جو اپنے زمانے کے ماہر فن تھے۔ جسم و جان کی تاب و توانائی کے ساتھ وہ دل کے نرم اور زبان کے شیریں تھے، وہ اپنی خوش طبعی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بھی پسند کئے جاتے تھے۔ ان کی راست بازی، ارادہ کی مضبوطی نے انھیں آگے چل کر اپنے مشن میں کامیاب کیا۔ وہ اچھے مقرّر تھے اور اپنی بات کو مدلل انداز میں بیان کرنا جانتے تھے۔ وہ مشرقی تمدّن کے پروردہ اور شائق تھے لیکن اس کے باوجود مغربی تہذیب کے بھی معترف تھے۔ انھوں نے ترکی ٹوپی اور ٹرکش کوٹ کا جو لباس اختیار کیا وہ مشرق و مغرب کے درمیان تہذیبی مصالحت کی ایک علامت ہے۔

وہ دہلی کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب امام تقی علیہ السلام سے جاکر ملتا تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ ہرات سے شاہجہاں آباد آئے تھے۔ پانچویں پشت اوپر سید احمد خاں کے جدّ بزرگ سیّد محمد دوست نے اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر کے ساتھ دکن کی مہم میں حصّہ لیا تھا اور ان کی جاں نثاری کی بناء پر مغل شہنشاہ نے انھیں "یکّہ بہادر" کا خطاب دیا تھا۔ سیّد احمد کے دادا سیّد ہادی فارسی میں شعر کہتے اور صاحبِ دیوان تھے۔ ان کے بھائی سیّد مہدی عالمگیر ثانی کے دربار میں اہم عہدے پر فائز تھے۔ خود سید احمد کے والد سید متقی کا مغل دربار سے بالواسطہ تعلق تھا۔

سیّد احمد کا ننہیالی تعلق اردو کے مشہور شاعر خواجہ میر درد کے خاندان سے تھا۔ ان کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں صاحبِ علم اور ذی فہم تھے۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے دور میں عہدۂ وزارت پر مامور تھے۔ اور ایران کے سفیر بنا کر بھی بھیجے گئے۔ سیّد احمد خاں نے ان کی سوانح حیات "سیرۃ فریدیہ" کے نام سے لکھی۔ خواجہ فریدالدین کے دادا عبدالعزیز شہر دلی کے ایک بڑے تاجر تھے۔

خواجہ فریدالدین احمد کی تین بیٹیوں میں سے عزیزالنساء سب سے بڑی تھیں۔ ان کے گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا اس لئے سب ہی بھائی بہن تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ عزیزالنساء کو عربی و فارسی اور اردو کی گھریلو تعلیم دی گئی۔ وہ ذہین اور حلیم الطبع خاتون تھیں۔ ان کی شادی میر متقی سے ہوئی۔ ان کے یہاں ایک لڑکی صفیۃ النساء اور دو

بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے کا نام سیّد محمد رکھا گیا اور چھوٹے سیّد احمد کہلائے۔ بچّہ عموماً اپنی ماں سے زیادہ مانوس ہوتا ہے اور ماں کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے سیّد احمد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا انھوں نے خود اعتراف کیا کہ:

"میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق، دانشمند اور دوراندیش، فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اُس نے تربیت کی ہو کیا اثر پڑتا ہے"۔[1]

سیّد احمد کی تعلیم کا آغاز روایتی انداز میں ہوا۔ شاہ غلام علی نے بسم اللہ پڑھائی اور ایک اُستانی سے ناظرہ قرآن پڑھا پھر مولوی حمید الدین سے آمد نامہ، خالقِ باری اور گلستاں و بوستاں کا درس لیا۔ عربی میں شرح ملا۔ شرح تہذیب اور مختصر معانی پڑھیں۔ ان کی طبیعت ابتداء سے ہی کسی ایک کتاب یا موضوع پر قناعت کرنے والی نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے علم طب اور علم ریاضی کی طرف بھی توجہ کی۔ حکیم حیدر خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں لیکن علم کی شدید پیاس ان قطروں سے نہ بجھ سکی۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ میں غرق رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلّی میں ذوقؔ، غالبؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ، شاہ نصیرؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ کی شاعری کا چرچا تھا۔ سیّد احمد نے بھی ان مشاہیر سے کسبِ فیض کیا۔ ماحول کے اثر سے خود بھی شعر کہنے لگے اور آہیؔ تخلص کیا۔ یہ مغلوں کے زوال کا دور تھا اور دہلی عیش و عشرت کا گہوارہ بن چکی تھی۔ پنشن یافتہ بادشاہ اور ان کے حاشیہ نشین شاعری اور راگ و رنگ کے علاوہ اور کوئی شغلہ نہ رکھتے تھے۔ اس رنگین ماحول کا سیّد احمد پر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی ناچ گانے کی محفلوں میں شریک ہونے لگے اور لطف اندوز ہوتے۔

ان کی عمر تقریباً ۱۹ سال کی تھی کہ ان کی شادی ۱۸۳۶ء میں نقیب الاولیا خاندان کی بیٹی پاکیزہ بیگم عرف مبارک بیگم سے کردی گئی جو نہ صرف یہ کہ ایک معزز و علم پرور گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ خود بھی پڑھی لکھی تھیں چنانچہ تاحیات وہ کبھی اپنے شوہر کے علمی اور اصلاحی کاموں

---

[1] سرسیّد احمد خاں "سیرۃ فریدیہ"، مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء ص ص ۵۳-۵۴

میں مزاحم نہیں ہوئیں۔ اور سمجھداری سے برابر معاونت اور رفاقت کا حق ادا کیا۔ خوش طبعی کے ساتھ ساتھ سیّد احمد خاں کا فطری میلان سنجیدگی کی طرف تھا اور ایسے اسباب بھی پیدا ہوتے چلے گئے جن کی وجہ سے اُن کا طرزِ زندگی یکسر بدل گیا۔

ابھی سیّد احمد خاں کی عمر صرف ۲۱ سال تھی کہ ان کے والد کا ۱۸۳۸ء میں انتقال ہوگیا۔ اور اسی زمانے میں سیاسی حالات کی بناء پر انھوں نے مغل دربار سے وابستہ ہونے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ دلی ۱۸۰۳ء سے انگریزی عملداری میں شامل کی جاچکی تھی اور اس کا انتظامیہ انگریزوں کے زیرِ نگیں تھا۔ خاندان کے سارے افراد نے اُن کے اس عزم کی مخالفت کی لیکن دُھن کے پکے اور ارادے کے مضبوط ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بات پر اڑے رہے انھوں نے اپنے خالو صدر امین خلیل اللہ خاں کی اعانت سے دہلی کی کچہری میں کام سیکھنا شروع کیا اور جلد منصبی معاملات سے خاصی واقفیت حاصل کرلی۔ خلیل اللہ خاں نے اپنی کچہری (متعلقہ فوجداری کے خفیف مقدمات) میں سررشتہ دار کروادیا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ رابرٹ ہملٹن جج کی حیثیت سے دہلی آئے۔ سیّد احمد ان سے متعارف تھے انھوں نے ملاقات کے بعد نوکری کی درخواست دی تو انھیں سیشن عدالت کی سررشتہ داری تجویز ہوئی لیکن سیّد احمد کی حقیقت پسند طبیعت نے غالباً خود کو اہل نہ سمجھا اور اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ جب رابرٹ ہملٹن آگرہ کے کمشنر مقرر ہوئے تو انھوں نے سیّد احمد کو بلالیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں نائب منشی کے عہدے پر تقرر کردیا۔ جہاں انھوں نے قوانین مال سے واقفیت پیدا کی۔ اور محنت سے کمشنری کے دفتر کو ترتیب دے کر روزمرّہ کے کاموں کا دستورالعمل بنایا۔

سیّد احمد نے صرف کسب معاش پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دوسرے اشغال بھی ان کی توجہ کا مرکز رہے اور کوئی نہ کوئی اعلیٰ خیال یا مشغلہ ان کی زندگی کا مقصد بنا رہا۔ ان کو اپنے ددیہال اور ننہیال سے لکھنے پڑھنے کا شوق ورثتاً ملا تھا جس کو انھوں نے صرف باقی رکھا بلکہ اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ چنانچہ مختلف النوع موضوعات پر اُن کی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ آج ہمارے پاس موجود ہے۔ جن دنوں وہ آگرے میں نائب منشی کے منصب پر فائز تھے

سید احمد نے ایک رسالہ "جامِ جم" کے نام سے تصنیف کیا جو ۱۸۴۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔

اسی زمانے میں عہدۂ منصفی کے لئے امتحان شروع ہوئے۔ کمشنر ہملٹن نے انھیں امتحان دینے کی ہدایت کی۔ سید احمد خاں اپنے بڑے بھائی سید محمد اور ماموں زاد بھائی حاتم علی خاں کے ساتھ امتحان میں شریک ہوئے اور پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہوئے اور ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری میں اُن کا تقرر بحیثیت منصف ہوا۔ پھر ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آگئے جہاں انھوں نے پہلا مذہبی رسالہ "جلاء القلوب بذکر المحبوب" ۱۸۴۲ء میں طبع کیا یہاں کی رہائش کے متعلق حالی نے لکھا کہ "فتح پور سیکری میں جہاں اکبر کی خوابگاہ تھی حسنِ اتفاق سے وہی عالیشان مکان سرسید کو رہنے کو ملا تھا۔"[1]

فتح پور سیکری کے چار سالہ قیام نے شہنشاہ اکبر کی مرتبت اور مغلیہ عظمت کی یاد تازہ کر دی اور وہاں کی فضا نے ان کے تاریخی شعور کو بیدار کیا۔

وہ فروری ۱۸۴۶ء میں تبدیل ہو کر دہلی پہنچے اور ۱۸۵۶ء تک وہیں ان کا قیام رہا۔ اس دوران اُنھوں نے محسوس کیا کہ اب تک جو مطالعہ اُنھوں نے کیا تھا اس کی از سر نو تفہیم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ دلی کے عالموں سے انھوں نے مذہبی اور درسی کتابیں باقاعدہ پڑھیں۔ مولوی نوازش علی سے فقہ کا درس لیا جو مشہور واعظ تھے۔ عربی ادب اور حدیث کی تعلیم مولوی فیض الحسن اور مولوی مخصوص اللہ سے حاصل کی۔ وہ اردو، فارسی، عربی اور عبرانی سے واقف تھے اور انگریزی کی شُد بُد بھی رکھتے تھے۔ عبرانی کی تحصیل کے متعلق محمد امین عباسی چریا کوٹی نے مقدمہ میں لکھا:

> "جس زمانے میں حضرت مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کا قیام غازی پور میں اپنے والد ماجد قاضی علی اکبر مرحوم کے پاس تھا اُسی زمانے میں نجم الہند سرسید احمد خاں مرحوم صدر الصدور تھے اور قاضی علی اکبر سرسید کے اجلاس میں وکالت کرتے تھے۔ آپ کے

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۲۲ء ص ۴۰

فضل وکمال کا شہرہ سرسید کے کانوں تک پہنچا تو آپ کی ملاقات کے بے حد مشتاق ہوئے چونکہ سرسید مرحوم کو زبان عبرانی سے بہت ولہ تھا اور علمی وفنی تحقیقات کے دلدادہ تھے اس لئے آپ سے ملنے کی خاص کشش دل میں پیدا ہوئی اور جب تک سرسید کا قیام غازی پور میں رہا مولانا عنایت رسول سے برابر عبرانی اور دیگر فنون میں استفادہ کرتے رہے۔" [1]

دہلی میں اُن کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شہر اور اس کے گرد و نواح کے آثار کی تحقیق ہونی چاہیے اس لئے وہ دارالسلطنت اور اس کے اطراف کی مبسوط تاریخ لکھنے کی طرف راغب ہوئے جس میں عمارات دہلی اور اکابر دہلی کے حالات کو قلمبند کرنا مقصود تھا۔ سید احمد نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس مشکل کام کو سرانجام دیا۔ ماضی کی دلی اور اہل دلی کے تمام نقوش کو ان صفحات میں محفوظ کر دیا ہے اسی اعتبار سے اس کا نام "آثار الصنادید" رکھا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا۔

سید احمد نے دہلی کے دورانِ قیام متعدد رسالے لکھے جن میں "قول متین در ابطال حرکت زمین" ۲۵ صفحوں پر مشتمل مطبع سید الاخبار دہلی سے ۱۸۴۸ء میں طبع ہوا۔ اس زمانے کے علمی حلقوں میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ سورج گردش کرتا ہے یا زمین؟ ہندوستان میں عام خیال تھا کہ سورج زمین کے چاروں طرف گھومتا ہے۔ سید احمد بھی اسی عقیدہ کے قایل تھے لیکن بعد میں جدید دلائل کی روشنی میں اپنی رائے بدل دی تھی۔ "کلمۃ الحق در بیان حقیقت پیری و مریدی" ۱۸۴۹ء "راہِ سنت در ردِ بدعت" ۱۸۵۰ء اور "نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور شیخ" ۱۸۵۲ء میں شایع کیے۔ ان طبع زاد کتابوں کے علاوہ انھوں نے "تحفۂ حسن" کے باب دھم اور دوازدہم کا ترجمہ ۱۸۴۳ء میں چھاپا۔ دوسرا ترجمہ "تسہیل فی جر الثقیل" آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے سیکریٹری پادری جان جمیس کی فرمائش پر آرفن پریس آگرہ سے ۱۸۴۴ء میں طبع ہوا۔ یہ رسالہ اولاً عربی میں تھا اس کی تلخیص ابو علی نے 'معیار العقول' کے نام سے فارسی میں کی سید احمد نے اسی کا ترجمہ کیا جو جر ثقیل (کرین) سے متعلق ہے انھوں نے عربی فارسی

---

[1] عنایت رسول چریاکوٹی لبشریٰ مرتبہ محمد امین عباسی چریاکوٹی۔ شیروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ ۱۳۱۹ھ ص ۲۲

اصطلاحات کے ساتھ اردو متوازی اصطلاحات دی ہیں اور رسالہ کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔

سید احمد کے نانا خواجہ فریدالدین نے رسالہ فوائدالافکار فی اعمال الفرجار فارسی میں لکھا تھا جس کا ترجمہ انھوں نے پادری جان جیمس کی فرمائش پر سیدالاخبار دہلی سے ۱۸۴۶ء میں شائع کیا جو آلۂ پر کار کے فواید سے متعلق ہے۔ اس میں مترجم نے فارسی کے نامانوس الفاظ کے مترادف انگریزی اور اردو الفاظ دیے ہیں ان کا ایک اور ترجمہ "دیباچۂ کیمیائے سعادت" (دوسری تیسری فصل) ۱۸۵۳ء میں چھپا اس کے علاوہ انھوں نے گاڈفری ہگنز کی کتاب کا ترجمہ حمایت اسلام کے نام سے کیا۔

اب سید احمد منصف درجہ اول ہو گئے اور دہلی سے دوبار قائم مقام صدر امین کی حیثیت سے چند روز کے لئے رہتک بھیجے گئے۔ ۱۳ر جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل طور پر صدر امین کے عہدے پر بجنور آ گئے۔ یہاں انھوں نے دو سال کے دوران دو قابل ذکر تصنیفی کارنامے انجام دیے۔ پہلا "تاریخ ضلع بجنور" اور دوسرا "آئینِ اکبری" کی تدوین۔ پہلی کتاب محکمۂ صدر بورڈ کے تحت لکھی گئی اس لیے مکمل ہونے پر وہ صدر بورڈ آگرہ روانہ کر دی گئی اور وہاں غدر کے ہنگامہ کی نذر ہو گئی اور اس کے چھپنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ سید احمد کی مدون آئینِ اکبری اگرچہ ہندوستان میں نظرانداز کی گئی لیکن بیرون ملک اس کی پذیرائی ہوئی اس کے خلاصے اور ترجمے دیگر زبانوں مثلاً انگریزی اور فرانسیسی میں کیے گئے۔

جب سید احمد خاں بجنور میں مقیم تھے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش برپا ہوئی۔ اس زمانے میں انھوں نے دل کھول کر خدمتِ خلق کا کام کیا۔ جب ہنگامہ کی خبر بجنور پہنچی تو انھوں نے مقامی بیس انگریز اور یوروشین افراد کی جان بچانا اخلاقی فرض سمجھا۔ کلکٹر جان شیکسپیر اور ان کی خوفزدہ بیوی کی حفاظت اپنی جان پر کھیل کر کی۔

اسی دوران وہ ڈپٹی رحمت خاں کے ہمراہ میرٹھ جانے کے ارادے سے نکلے۔ راستہ میں انھیں بڑی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہ مشکل تمام وہاں پہنچے تو خبر ملی کہ سرکاری فوج کے سپاہیوں نے دلی میں ان کا گھربار لوٹ لیا ہے۔ وہ دہلی گئے تو دیکھا کہ ان کی ماں اور خالہ دونوں ایک کمرے میں بند ہیں۔ دونوں بیگمات کو وہ سرکاری ڈاک کی بگھی سے میرٹھ لانے میں کامیاب ہوئے مگر ان کی والدہ کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ بعد

ان کا انتقال یکم ربیع الاول ۱۲۷۸ھ مطابق اکتوبر ۱۸۶۱ء کو میرٹھ میں ہو گیا۔

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ۱۸۵۷ء کے غدر کا مواخذہ شروع ہوا۔ بجنور سے ضلع کلکٹر شیکسپیر اپنے عملے کے ساتھ (جن میں سید احمد بھی شامل تھے) رڑکی روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر سزا دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے انگریزی فوج کے افسروں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ باغی صرف وہی لوگ قرار دیے جائیں جو اب فوج کا مقابلہ کریں۔ اُن کی یہ بات مان لی گئی اور وہ تمام بے خطا لوگ بچ گئے جو ہنگامے میں کسی مجبوری کی بناء پر شامل ہو گئے تھے۔

شورش کے دنوں میں سید احمد نے انگریزی حکام کی جو مدد کی اور اُن کی جانیں بچائیں اس کے صلے میں حکومت کی طرف سے ایک قیمتی خلعت، ایک ہزار روپیہ اور دو سو روپے ماہوار کی سیاسی پنشن دو نسلوں کے لئے مقرر کی گئی۔ میر صادق علی اور میر رستم علی کے چاند پور کا علاقہ ان کو حکومت نے نذر کرنا چاہا مگر ان کی خود دار طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا اور لینے سے انکار کر دیا اس واقعہ سے سید احمد خاں کی بے نیازی، نفس کی پاکیزگی اور سلامت طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس درمیان وہ صدر الصدور کی حیثیت سے مراد آباد تبدیل ہوئے یہاں ان کو اس کمیشن کا رکن نامزد کیا گیا جو باغیوں کی جائیداد کے متعلق تفتیش کرنے کی غرض سے تشکیل کیا گیا تھا۔ رکن کی حیثیت سے انھوں نے مقامی اور غیر مقامی باشندوں کی جائیدادوں کو ضبط ہونے سے بچا لیا۔

مراد آباد میں انھوں نے ۱۸۵۸ء میں "سرکشی ضلع بجنور" شایع کی جس کے لئے وہ کافی عرصے سے مواد اکٹھا کر رہے تھے اس میں انھوں نے بڑی ایمان داری اور صفائی سے اس زمانے کے حالات بغیر کسی مذہبی اور قومی تعصب کے بیان کئے ہیں شورش کے بعد ہندوستانیوں پر انگریزوں کا عام عتاب نازل ہوا اور مسلمان ان کے ظلم و ستم کا خاص طور پر نشانہ بنے سید احمد خاں نے چاہا کہ کسی طرح انگریزوں کی غلط فہمی دور ہو تو انھوں نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھا اور ۱۸۵۹ء میں اس کے پانچ سو نسخے چھپوائے ایک حکومت ہند کو بھیجا، چند اپنے پاس رکھے اور باقی کاپیاں انگلستان روانہ کیں۔

جب سید احمد مراد آباد میں تھے اس وقت غدر کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی نامہ کا اعلان ہوا۔ انھوں نے مراد آباد کے مسلمانوں کو اس طرف مبذول کیا کہ انھیں اپنی ملکہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اس موقع پر انھوں نے ایک مناجات پڑھی۔ یہ ان کے خلوص اور دردِ قومی کی آئینہ دار ہے۔

" اے خدا تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے ...... الٰہی یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گزرا کہ انسان اور حیوان، تمام چرند اور پرند بلکہ شجر و حجر کسی کو چین و آرام نہ تھا۔ اب پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے بندوں کو نصیب کی۔ الٰہی تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں " [1]

سید احمد کے پُر خلوص ہونے کی ایک مثال مراد آباد کے دوران دیکھنے میں آتی ہے کہ ۱۸۶۰ء میں جب وہاں قحط پڑا تو کلکٹر ضلع جان اسٹریچی نے اس کا انتظام سید احمد کے سپرد کیا۔ انھوں نے قحط میں لاوارث بچوں کی دیکھ بھال خاص طور سے کی۔ انھیں گوارا نہیں تھا کہ ایک ہندوستانی کا بچہ مشنریوں کو دے دیا جائے۔ وہ ہندو مسلمانوں سے چندہ جمع کر کے ایک بڑا یتیم خانہ کھولنا چاہتے تھے جہاں بلا تفریق مذہب و ملّت ہندوستان کے بے سہارا بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام ہو سکے۔ ان کی خدمت اور جاں نثاری کا ذکر راجہ جے کشن داس نے ان الفاظ میں کیا کہ

" جب سرسید نے "رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالنا شروع کیا تو اس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان کو کچھ ہمدردی نہیں ..... انھیں دنوں مراد آباد جانا ہوا۔ محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا وہاں سرسید سے مڈبھیڑ ہو گئی ..... جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آ رہے تھے اس

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء ص ۹۳

کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہو گیا اور مجھے حیرت ہوئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے وہ دن ہے اور آج کا دن اُن کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی۔"[1]

اسی زمانے میں انھوں نے مراد آباد میں اردو ذریعہ تعلیم کا ایک اسکول قائم کیا جو بالآخر یائی اسکول ہو گیا اور وہیں سے انھوں نے "لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالنا شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اُن مسلمانوں کے حالات کے بارے میں تھا جو حکومت کے وفادار رہتے۔

ان کی بیوی کا انتقال ۱۸۶۱ء میں مراد آباد میں ہی ہوا۔[2] انھوں نے تین بچے چھوڑے۔[3] اس وقت سید احمد خاں کی عمر چوالیس سال تھی۔ احباب نے نکاح ثانی پر اصرار کیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ

"محمود کی ماں کہاں سے آوے گی"[4] وہ تو قوم سے منسلک تھے اور خدمت کے جذبہ سے سرشار اور خود بچوں کی نگرانی اور پرورش بڑی محنت اور ذمہ داری سے کی۔

انھوں نے مراد آباد میں ہی "تاریخ فیروز شاہی" کی تدوین کی جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا تبیین الکلام لکھنے کا خیال بھی اُن کے ذہن میں یہیں پیدا ہوا اور اس کے لئے تیاریاں شروع کر دیں اور تبادلہ ہو کر جب غازی پور پہنچے تو جمع شدہ مواد کو ترتیب دیا اور تبیین الکلام جستہ جستہ چھپنے لگا۔

غازی پور کے زمانہ کا ایک اور کارنامہ سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام ہے جس کا

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ ۱۹۸۲ء ص ۱۰۸

[2] ان کی بیوی کی آخری آرام گاہ شوکت باغ قبرستان مراد آباد میں ہے۔

[3] تین بچوں میں سے بڑے کا نام سید حامد پیدائش ۱۵ جنوری ۱۸۴۹ء دوسرے بیٹے سید محمود کی پیدائش ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء اور تیسری اولاد امینہ کی پیدائش بھی مراد آباد میں ہوئی اور شاید اسی میں ماں کی وفات ہوئی۔

[4] خواجہ الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ نامی پریس کانپور۔ ۱۹۰۱ء ص ۸۸۴

بنیادی مقصد غیر ملکی زبان کی علمی و ادبی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنا تھا۔ سید احمد خاں اس کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے اور ترجمے کا کام شروع ہوا اور طباعت میں آسانی کی خاطر انھوں نے اپنا ذاتی پریس بھی لگایا۔ یہیں انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ جس کا سنگِ بنیاد راجہ دیونرائن سنگھ کے ہاتھوں رکھا گیا جس میں عربی فارسی کے ساتھ ساتھ اردو، سنسکرت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور اب بھی یہ کوین وکٹوریہ کالج کے نام سے موجود ہے۔

سید احمد خاں آخر ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آئے۔ ان کے ساتھ سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل ہوا اور یہیں سے ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کا اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا اجرا ہوا۔ زندگی کے آخری لمحہ تک سرسید نے ہی اس کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو آخری اداریہ لکھا جو اردو کی حمایت میں ہے۔ ۱۱ اگست ۱۸۶۷ء کو وہ عدالتِ خفیفہ (اسمال کاز کورٹ) کے جج کے عہدے پر ترقی پاکر بنارس منتقل ہوئے اور سوسائٹی کا کام راجہ جے کشن داس کے سپرد کر گئے۔ وہ دور رہ کر بھی کسی لمحہ سوسائٹی کے کاموں سے غافل نہیں رہے اور عوام کی بھلائی کے مختلف کام کرتے رہے۔ ان کے دل میں "ورناکیولر یونیورسٹی" قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں دی جاسکے تاکہ فرد کی ذہنی نشوونما صحیح طور پر ہوسکے مگر جلد ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچے "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عام تعلیم کے لئے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیلی اور دیہاتی مکتبوں میں محدود رہنی چاہیے"۔[1]

ان کو عوام کی روزمرّہ زندگی سے بھی دلچسپی تھی وہ ہر وقت کام آنے والی چیزوں پر بھی غور و خوض کرتے تھے مثلاً انھوں نے ہومیوپیتھی علاج کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی اور ۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو ایک شفاخانہ بنارس میں "ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل" کے نام سے کھولا اور اس طریقۂ علاج کے فوائد اپنے مضامین اور تقاریر میں بیان کئے تاکہ عوام اس سے واقف ہوسکیں۔ مسلمانوں کی روزانہ زندگی میں پیش آنے والے ایک اور مسئلہ پر انھوں نے "رسالہ احکام طعام اہل کتاب" ۱۸۶۸ء میں لکھا جس میں بتایا گیا کہ اگر دسترخوان پر کوئی حرام چیز موجود نہ ہو تو اہلِ کتاب کے ساتھ کھانا اور اس کا ذبیحہ کھانا ناجائز نہیں ہے۔

بنارس میں ایک سال اور ساڑھے سات مہینے کے بعد انھوں نے انگلستان کے

[1] تہذیب الاخلاق "سید احمد خاں" ہماری زبان اور اعلیٰ تعلیم" مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۰ء ص ۱۳۹

سفر کا ارادہ کیا ان کے بیٹے سید محمود کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ریاست اضلاع شمال مغرب (موجودہ یوپی) کا وظیفہ انگلستان جانے کے لیے ملا۔ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ وہ اپنے مشن کو اس وقت تک عملی جامہ نہیں پہنا سکتے جب تک وہ برطانیہ کی طرزِ تعلیم کا خود مشاہدہ نہ کرلیں چنانچہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ دونوں لڑکے سید حامد، سید محمود، مرزا خدا داد بیگ (ان کو بھی حکومت شمال مغرب کا وظیفہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ملا تھا) اور چھجو ملازم تھے وہاں ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا۔[1] رفتہ رفتہ لندن میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور برطانوی شاہی دربار کی مجالس میں بھی شریک ہوئے۔ " اتینھیم کلب لندن " کا رکن کوئی ممتاز شخص ہی ہوسکتا تھا۔ سید احمد خاں اس کے اعزازی رکن بنائے گئے۔ انھوں نے کیمبرج اور آکسفورڈ کو جاکر دیکھا اور ان یونیورسٹیوں کے نصاب اور طریقۂ تعلیم کا مطالعہ کیا۔ وہ "مدرستہ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات" میں اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ

> " لندن ہی میں میں نے اس مدرسہ کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا۔ یہاں تک کہ جس نقشہ پر آپ اس کالج کی عمارتوں کو دیکھتے ہیں یہ بھی لندن ہی میں قرار پاچکا تھا۔ میں بدنصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا۔ میں سید محمود کا نہایت شکرگذار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں جو مجھ کو حاصل ہوئیں اس میں سید محمود نے میری بہت بڑی مدد کی۔ مجھ کو اس بات کے اقرار کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا میرا جانا فضول تھا۔"[2]

انگلستان کے قیام میں انھوں نے سب سے اہم کام جو سرانجام دیا وہ 'خطباتِ احمدیہ' کی تصنیف تھی۔ انھوں نے اس کا خلاصہ بارہ کتابچوں کی شکل میں بزبانِ انگریزی شایع کروایا اور سرمایہ کی کمی کی بناء پر محسن الملک کو لکھا کہ ان کا کتب خانہ اور فرنیچر فروخت کردیا جائے۔

---

[1] لندن کے گھر کا جائے وقوع: ۲۱ میکلن برگ اسکوائر لندن ڈبلیو سی (مغرب وسط) تھا۔

[2] سرسید احمد خاں، مقالات سرسید۔ مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۰۸

وہ ان ہی کو خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے یہاں انگریزی کا شوق نہیں کیا۔ مواعظ احمدیہ فی اسرار ملت محمدیہ لکھ رہا ہوں"[۱]

اور وہیں سے خطباتِ احمدیہ کا دیباچہ ہندوستان اشاعت کے لئے بھیجا۔[۲]

وہ ۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آئے اور یہاں انھوں نے کئی اہم کاموں کی داغ بیل ڈالی۔ لندن سے شایع ہونے والے میگزین "ٹیٹلر" اور "اسپیکٹیٹر" کے نمونے پر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو "تہذیب الاخلاق" کا اجراء علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے کیا۔ اس رسالے کے مضامین پر موافقت اور مخالفت دونوں ہی رجحان سامنے آئے۔ یہاں تک کہ سید احمد خاں پر کفر کے فتوے لگائے گئے لیکن تہذیب الاخلاق اپنے مقصد یعنی قوم میں بیداری کی روح پیدا کرنے میں کامیاب ہوا اور قوم کو اس کے ذریعے دور رس فائدے پہنچے۔ وہ دیگر اخبار اور رسالوں کا بغور مطالعہ کرتے اور اپنے پرچے میں اہم خبروں پر رائے زنی کرتے تھے وہ اختلافی مضامین پر خود تبصرہ کرتے یا اپنے رفیقوں میں کسی سے جواب لکھواتے۔

سید احمد خاں نے دوسرا کام یہ کیا کہ مدرستہ العلوم قائم کرنے کی عملی کوششیں شروع کر دیں۔ چندہ جمع کرنے کے لئے ایک کمیٹی "خزینتہ البضاعتہ لتاسیس مدرستہ المسلمین" بنائی وہ خود اس کے سکریٹری تھے اور اب فراہمی چندہ کی کارروائی تیزی سے ہونے لگی انھوں نے قوم کے سامنے گدائی کی اور مختلف ذرائع سے روپیہ اکٹھا کیا۔ مثلاً علی گڑھ نمائش میں کتابوں کی دوکان لگائی گئی۔

بالآخر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے دن مدرستہ العلوم کا قیام عمل میں آیا۔ محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ نے رسم افتتاحیہ ادا کی اور ابتدائی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب سید احمد خاں نے محسوس کیا کہ انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کے لئے ان کا علی گڑھ میں رہنا ضروری ہے۔ اس وقت وہ بسلسلۂ ملازمت بنارس میں مقیم تھے انھوں نے قبل از وقت پنشن کی درخواست دی جس کی منظوری آخر جولائی ۱۸۷۶ء میں آئی اور چار سو روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی۔ بنارس سے وہ اگست ۱۸۷۶ء میں مستقل طور پر علی گڑھ منتقل ہو گئے اور اپنے مکان میں مقیم ہوئے جسے

---

[۱] خط بنام محسن الملک۔ سر سید کے خطوط مرتبہ وحید الدین سلیم۔ حالی پریس پانی پت ص ۴،

[۲] تہذیب الاخلاق، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۸۷۱ء ص ص ۴۹-۵۰

سید محمود نے خرید کر مرمت کے بعد ضروری فرنیچر سے آراستہ کر دیا تھا تاکہ ان کے والد آرام سے رہ سکیں۔ بانیٔ تعلیمِ نسواں شیخ عبداللہ نے ان کے معمولاتِ زندگی کے متعلق لکھا ہے کہ

"سرسید صبح چار بجے اٹھ جاتے تھے۔ اُن کے پلنگ کے پاس جو میز رکھی تھی اس پر ایک موم بتی جلا کر رکھ دیتے تھے اور اس کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے یا مضامین لکھا کرتے تھے۔ جاڑوں میں دو گھنٹے اس شغل میں صرف کرتے تھے اس کے بعد غسل خانے جاتے، پھر چائے نوش فرماتے اور پھر ایک بڑی میز کے پاس بیٹھ کر تصنیف کا کام شروع کر دیتے تھے۔"[1]

وہ دوپہر میں آرام کرنے کے قائل نہیں تھے۔ صبح سویرے سے رات گئے تک مصروف کار رہتے یہاں تک کہ ان کے پیر سوج جاتے مگر انھیں اپنے مشن کے سامنے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کا سنگِ بنیاد وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے رکھا۔ ایک لیکچر میں انھوں نے اپنے انہماک کا ذکر کیا کہ

"وقت کم اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہو جاتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں۔"[2]

وہ متنوع مشاغل میں مصروف رہتے۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ کہیں کالج کی عمارات کے نقشے بنتے تو کہیں بجٹ تیار ہوتا۔ کہیں سرکار کو بھیجی جانے والی عرضیوں پر غور ہوتا تو کہیں ٹرسٹیوں کی میٹنگ کی تفصیلات طے ہوتی تھیں۔

انھوں نے نہ صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت کو بہتر بنانے کی کوشش کی بلکہ طلباء کے بیرون ملک یعنی انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا۔ ۱۸۸۳ء میں "محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن" بنایا تاکہ ان طلباء کے لئے جو سول سروس کے امتحان میں شریک ہونا چاہتے ہیں سفر خرچ اور تعلیم کے لئے روپیہ مہیا کیا جا سکے۔ لیکن

---

[1] ڈاکٹر شیخ عبداللہ مشاہدات و تاثرات، مطبوعہ تکمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۱۶-۱۷
[2] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء ص ۲۴۲

یہ ادارہ کچھ عرصہ بعد عدم فعالیت کی بناء پر ترک کر دیا گیا۔

سید احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں ' محڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں قائم کی جس کا مقصد ملک کے دیگر حصوں کی تعلیمی صورتِ حال سے واقف ہونا تھا۔ اس کے جلسے ہر سال مختلف شہروں منعقد ہوتے تھے لارڈ ڈفرن نے سید احمد کو ۱۸۸۶ء میں سول سروس کمیشن کا رکن مقرر کیا۔ انھوں نے اس حیثیت سے اپنے فرائض بخوبی انجام دیے۔

اگست ۱۸۸۸ء میں انھوں نے 'پیٹریاٹک ایسوسی ایشن' بنائی تاکہ ان ہندوستانیوں کے خیالات کو جو نیشنل کانگریس میں شامل نہیں تھے حکومت تک پہنچایا جا سکے۔ سید احمد خاں ہندوستان کی آزادی کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کے خیال میں ابھی مسلمانوں کے لئے کسی احتجاج کا وقت نہیں آیا تھا۔ بلکہ اپنے کو مضبوط کرنے کے لئے اُن کو پوری توجہ تعلیم پر صرف کرنی چاہیے تھی۔

انھوں نے "بینی ریڈنگ تھیٹر" مدرستہ العلوم کے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ۱۸۸۹ء میں قائم کیا وہ مستقل طور پر تو قومی تھیٹر بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن اپنے رفقاء کو ایک بار اسٹیج پر ضرور لے آئے۔ یہ خیال انھیں امرتسر کے ایک تھیٹر کو دیکھ کر پیدا ہوا جو ایک انگریز افسر کی تجویز پر بنایا گیا تھا اور بوقت ضرورت انگریز مرد اور عورتیں ڈرامہ کر کے رفاہِ عام کے لئے پیسے اکٹھا کرتے تھے سید احمد خاں نے لکھا ہوا ڈرامہ علی گڑھ نمائش کے موقع پر ۶ رفروری ۱۸۹۴ء کو پیش کیا گیا۔ اس کے لئے پنڈال اور اسٹیج کا مناسب انتظام کیا گیا۔ لوگ جوق در جوق بوڑھے سید اور ان کے رفیقوں (شبلی وغیرہ) کو اسٹیج پر دیکھنے کے لئے آئے جن میں شاید موافقین کم اور مخالفین زیادہ تھے۔ اس کے متعلق سید احمد خاں نے لکھا۔

" منشی احمد علی شوق نے 'آزاد' میں جو کچھ لکھا اور منشی سراج الدین (ایڈیٹر سرمور گزٹ ناھن گجرات) نے جو مہربانی کی اور جن دوستوں نے ہمارے ساتھ ہمدردی کی ہمارے دل کو اس سے تقویت ہے مگر جب ہم کو کسی کے پتھر سے چوٹ نہیں لگی تو وہ لوگوں سے کیوں اُلجھتے ہیں؟ اور پتھر پھینکنے والوں کے بھی ہم دل سے شکر گزار ہیں مگر افسوس ہے کہ جب ان کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ ان کے پتھر سے ہم

کو چوٹ نہیں لگتی تو ان کو رنج ہو گا"۔[1]

سید احمد کے بیشتر رفقائے کار سے تو سب ہی واقف ہیں لیکن شیخ عبداللہ نے کچھ اور احباب سے تعلق خاطر کا ذکر کیا:

" لکھنے پڑھنے کے کام کے سلسلے میں مولانا حالی اور مولوی ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب لنسواں کو ان کے پاس حاضر دیکھا۔ نواب محسن الملک تو مستقل علی گڑھ ہی میں حیدر آباد سے آنے کے بعد رہنے لگے۔ نواب فتح نواز جنگ نے کچھ عرصہ کے لئے حیدر آباد سے آکر علی گڑھ میں قیام کیا۔ اسی طرح دو تین اور صاحبان نے بھی۔ اس پر "اودھ اخبار پنچ" نے لکھا کہ علی گڑھ کیا ہے یہ تو "تکیہ مردودان" ہے....

ان کے مخلص دوستوں میں خلیفہ محمد حسین اور خلیفہ محمد حسن وزراء پٹیالہ تھے۔ اسی طور پر نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی اور ان کے دو بھائی مولوی سید علی اور ڈاکٹر سید حسن سرگروہ بڑے معتقدین میں سے تھے۔ پنجاب کے نواب محمد حیات خاں اور ڈپٹی برکت علی خاں اور باغبانپورہ لاہور کے رؤسا بالخصوص شاہ دین اور سر محمد شفیع ان کے بڑے دوستوں میں سے تھے"۔[2]

سید احمد خاں کی علمیت اور اہمیت کی شہرت ان کی زندگی ہی میں پھیل گئی ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے ان کے موروثی خطاب جواد الدولہ میں "عارف جنگ" کا اضافہ کر دیا تھا۔ اور ان کا قیام جب لندن میں تھا تو انھیں "سی۔ ایس۔ آئی" کا خطاب دیا گیا اور اس کا تمغہ ڈیوک آف آرگل نے پہنایا۔

۱۸۷۸ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے وائسریگل کاونسل کا رکن منتخب کیا اور مزید دو سال کے لئے اس کا اعادہ وائسرائے لارڈ رپن نے ۱۸۸۰ء میں کیا یوں وہ چار برس وائسرائے کاؤنسل کے ممبر رہے۔

سید احمد خاں ۱۸۸۸ء میں کے سی۔ ایس۔ آئی (نائٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارۂ ہند) کے

---

[1] سر سید احمد خاں۔ مقالات سر سید مرتبہ مولانا اسماعیل پانی پتی حصہ دہم۔ مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور سن ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۰۷

[2] ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ۔ مشاہدات و تاثرات۔ مینیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۶۴۔ ۶۵

خطاب سے نوازے گئے۔ ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی سند دی۔

آخر عمر میں انھیں چند ناخوشگوار تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلا واقعہ ٹرسٹی بل ۱۸۸۹ء سے متعلق تھا جس کی متعدد دفعات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سید محمود کالج کے جوائنٹ سکریٹری مقرر کئے جائیں تاکہ سید احمد خاں کے بعد وہ کالج کے سکریٹری ہو سکیں ان کے دماغی توازن پر لوگوں کو شبہ ہونے لگا تھا اس لئے اس کی مخالفت قدیمی دوست مولوی سمیع اللہ خاں نے کی اور ان کا ساتھ وقار الملک نے بھی دیا۔ کثرت رائے سے یہ بل تو منظور ہو گیا مگر دونوں دوستوں کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہو گیا تھا وہ تاحیات باقی رہا۔

کالج کے روپے میں غبن کا واقعہ بھی پریشان کن تھا۔ ۱۸۹۵ء میں سیکریٹری کے دفتر کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال نے مختلف طریقوں سے کثیر رقم غبن کی۔ اس نے سید احمد خاں کے جعلی دستخط کر کے روپے غائب کئے۔ اس حادثہ سے کالج کی ترقی کا منصوبہ کچھ عرصہ کے لئے رک گیا اور اس کا ان پر گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے حالی کو خط میں لکھا:

"میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس غبن کے سلسلہ میں مجھ سے ہمدردی ظاہر کی۔ یہ ایک لاکھ سے زیادہ (ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو) کا معاملہ ہے۔ میں اپنے رنج و غم کو بیان نہیں کر سکتا جو مجھے اس بات سے ہوا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دینا چاہی کہ جو کچھ ہو گیا ہو گیا لیکن یہ قدرتی امر ہے کہ میرا دل بہت غمگین ہے۔ کچھ دن میری حالت ایسی رہی کہ میں سمجھتا تھا کہ میں کسی سخت بیماری کا شکار ہو جاؤں گا۔ میں نے تین دن تک کچھ نہیں کھایا اور میری حالت عجیب ہو گئی۔ بہر حال اب میں بہتر ہوں۔"[۱]

پھر بھی انھوں نے شکر ادا کیا کہ غبن کا پتہ ان کی زندگی ہی میں چل گیا۔

انھیں ۱۸۹۷ء میں اپنے بیٹے سید محمود[۲] کی علالت (اختلال دماغ) کا رنج بھی برداشت

---

[۱] سر سید احمد خاں۔ مکتوبات سر سید۔ مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۵۹ء ص ۳۱۶

[۲] سید محمود (۱۸۵۰ء-۱۹۰۳ء) جج الہ آباد ہائی کورٹ کی شادی چچیری بہن مشرف جہاں (سید احمد خاں کے ماموں زاد بھائی شرف الدین کی لڑکی) سے ہوئی ان کے اکلوتے لڑکے سید راس مسعود کی پیدائش ۱۵ فروری ۱۸۸۹ء میں ہوئی۔ سر سید نے ان کی تقریب بسم اللہ۔ ۳ دسمبر ۱۸۹۳ء میں کی دہلی اسکول کا امتحان ۱۹۰۵ء میں پاس کیا اور اسی سال انگلستان کے لئے روانہ ہو گئے ۱۹۱۰ء میں بی اے کی ڈگری لی ۱۹۱۲ء میں بار ایٹ لا کیا اور ہندوستان آکر پٹنہ میں وکالت شروع کی ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول پٹنہ کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے پھر ۱۹۱۵ء میں ریوین شاہ کالج کٹک میں پروفیسر آف ایجوکیشن مقرر

کرنا پڑا۔ اس سے پہلے بڑے لڑکے سید حامد کا انتقال ہوا جو سپرنٹنڈنٹ پولس تھے اور لندن کے دورانِ قیام چھوٹی بیٹی امینہ کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ ان سانحات نے عرصہ تک انھیں غمگین رکھا۔

ان ناسازگار حالات کے باوجود سید احمد خاں کے قوائے ذہنی مضمحل نہیں ہوئے اور وہ آخری ایام تک قوم و ملک کی اصلاح میں مصروف رہے۔ انھوں نے اپنے طریقۂ فکر کی وضاحت کی کہ مذہب کو انھوں نے تقلید اور وراثت سے نہیں عقل کی روشنی میں دیکھا ہے۔ وہ جدید علم کلام کے بانی ہیں۔

"جس طرح قدیم علماء نے ایک نئے ڈھنگ پر علم کلام ایجاد کیا تھا اس کی نظیر پر میں نے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہسٹری مقرر ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں حیدر آباد میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن ہو گئے اور وہیں عثمانیہ یونیورسٹی کی انتظامیہ میں افسر ہو گئے ۱۹۲۶ء میں جاپان کا طریقۂ تعلیم دیکھنے وہاں گئے اور دسمبر ۱۹۲۸ء میں نظام حیدر آباد کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور ۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے تعلیمی نظام میں مشورہ اور اصلاح کے لئے سفر کیا اور اسی سال حکومت نے تعلیمی خدمات کے صلہ میں سر کے خطاب سے نوازا ستمبر ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کی وائس چانسلری سے استعفیٰ دیا اور ۱۹۳۵ء میں بھوپال کے مشیر تعلیم کا عہدہ سنبھالا اور ۳۰ جنوری ۱۹۳۷ء کو بمقام بھوپال وفات پائی اور تدفین کے لئے علی گڑھ لائے گئے۔ سید محمود اور راس مسعود دونوں یونیورسٹی مسجد میں سر سید کے قریب دفن ہیں۔

راس مسعود کی پہلی شادی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی دختر زہرہ بیگم سے ہوئی۔ جن سے دو لڑکے انور مسعود اور اکبر مسعود ہوئے جو پاکستان منتقل ہو گئے۔ اکبر مسعود کی وفات ہو گئی ہے دوسرے لڑکے انور مسعود ابوظہبی میں بنک کے افسر اعلیٰ تھے۔ ان کی شادی آفتاب احمد خاں کی پوتی روشن شہزاد سے ہوئی۔ ان کی دو بیٹیاں شہرزاد اور شہرناز ہیں۔ شہرزاد قانون داں ہے اور بحرین کی فرم میں قانونی مشیر ہے۔ چھوٹی لڑکی اپنے والدین کے ساتھ لندن میں رہتی ہے۔

راس مسعود کی دوسری شادی عبدالرشید خاں (دیوانِ اندور) کی دختر امۃ الشہید سے لندن میں ہوئی ان سے ایک لڑکی نادرہ پیدا ہوئی جو عالم جوانی میں انتقال کر گئی۔

یہ نیا طریقہ صداقت کے ثابت کرنے کا ایجاد کیا ہے ۔ ممکن ہے اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے“[۱]

ضعیفی اور ناتوانی کے باوجود جب تیسری بار اردو زبان اور فارسی رسم الخط کا مسئلہ سامنے آیا تو انھوں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ اردو دشمنی کی پالیسی کو ترک کر دے ورنہ اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے ۔ مرض الموت ہی میں انھوں نے ایک عیسائی کی تصنیف ”اُمہات المومنین“ کی تردید میں جواب بہ عنوان ”ازواج مطہرات“ لکھنا شروع کیا جو مکمل نہ ہو سکا ۔

علالت کے دوران اُن کی مزاج پُرسی کے لیے شیخ عبداللہ جاتے رہتے تھے انھوں نے تفصیل لکھی :

”سرسید جنوری ۱۸۹۸ء سے کم وبیش ہر روز کچھ نہ کچھ تکلیف محسوس کرنے لگے تھے ۔ عمر کافی ہو گئی تھی تفکرات بہت تھے ۔ سید محمود کی مخالفت اور دن رات کی کِل کِل کا اُن کے دل پر بہت بُرا اثر تھا جو ان کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ان دنوں غذا میں بہت کمی ہو گئی تھی ۔ یہ سب کچھ تھا لیکن کالج کی ڈاک روزانہ دیکھنے کا معمول بدستور قایم تھا ۔ سرکاری خط وکتابت کے متعلق وہی پابندیاں قایم تھیں جو پہلے تھیں ۔ لوگ آتے جاتے تھے ان سے بھی بات چیت ہو جاتی تھی اور موقع موقع سے طبعی ظرافت کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی تھی“[۲]

سرکاری خطوط جو انگریزی میں بھیجے جاتے تھے وہ کسی انگریز پروفیسر بالخصوص پروفیسر بیک کو ضرور دکھائے جاتے تھے اور اہم خطوط کا مسودہ بھی وہی تیار کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ سررشتہ تعلیم کالج کے ٹرسٹیوں اور طلباء کے والدین سے خط وکتابت سید احمد کے زیر نگرانی ہوتی اور جوابات بغیر کسی تاخیر کے روانہ کر دیے جاتے ۔

سید احمد خاں انتقال سے انیس روز قبل سید محمود کے مکان سے حاجی اسماعیل خاں رئیس دتاولی کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے ۔ وہیں ۲۴ مارچ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب

---

[۱] سرسید کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ مولوی سراج الدین کیشری با زار لاہور ۱۸۹۰ء صفحہ ۲۱۵

[۲] ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ ۔ مشاہدات وتاثرات ۔ فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۰۱

ہوئی اور ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء بروز اتوار (یکشنبہ) دس بجے شب رحلت کی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اپریل ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۲۳ پر تفصیلات مندرج ہیں کہ ۲۸ مارچ ساڑھے پانچ بجے شام جنازہ اٹھا جو لوگ شریک تھے ان میں سید محمود۔ ٹرسٹیوں میں نواب مہدی علی (بمبئی) حاجی اسماعیل خاں، مولوی زین العابدین، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، مرزا عابد علی بیگ، (حیدرآباد) حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (رئیس بھیکم پور) کلکٹر، جج اور دیگر افسرانِ ضلع بھی موجود تھے، کالج کے طلبا، اساتذہ اور شہر کے امیر و غریب سب ہی افراد نے کرکٹ لان پر نمازِ جنازہ ادا کی۔ امامت مولوی عبداللہ انصاری نے کی۔ پھر یونیورسٹی مسجد میں تدفین ہوئی اور وہیں ۳۰ مارچ کو سوئم ہوا۔ ان کی وفات کی بہت سی تاریخیں نکالی گئیں جن میں غفر لہ اور دوسری قرآن مجید کی آیت اِنّی متوفیہ ولافعک الی و مطہرک زیادہ بہتر قرار دی گئیں۔

اس موقع پر سید محمود کے پاس بے شمار تعزیتی پیغامات ملک اور بیرونِ ملک سے موصول ہوئے دوستوں اور معتقدین نے بطور یادگار "سر سید میموریل فنڈ" قایم کیا تھا کہ کثیر رقم جمع کرنے کے بعد مدرسۃ العلوم کو یونیورسٹی بنایا جا سکے۔ یہ گویا قوم کا اپنے محسن کو خراجِ عقیدت تھا۔

سید احمد خاں کی موت کسی ایک شخص کی موت نہیں بلکہ ایک عہد کا خاتمہ تھا۔ ان کی زندگی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک باب ختم ہو گیا بقول حالی "وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ

میری لایف میں سوائے اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے"[1]۔

اُن کی شخصیت کا حیرت انگیز کمال یہ تھا کہ انھوں نے قوم اور پورے دور کو متاثر کیا چنانچہ انھوں نے لایق اشخاص کو ایک جگہ جمع کیا اور اپنے طرزِ فکر اور قوتِ عمل سے ان کی شخصیتوں کو ایسی جِلا بخشی کہ ان کی چمک دور اور دیر تک پھیلتی رہی۔

حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے ان کی اسی خوبی کی طرف اشارہ کیا کہ:

---

[1] الطاف حسین حالی۔ حیاتِ جاوید مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۲۲ء۔ دیباچہ صفحہ ۲

"سرسید کی صحبت خود ایک درسگاہ تھی یہ اس حیات آفریں صحبت کا اثر تھا
کہ مولانا شبلی مرحوم نے مورخ بن کر بے بہا علمی خدمات انجام دیں اور دنیا کو دکھا دیا
کہ علوم عربیہ میں تاریخ کا فن کیا پایہ رکھتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم
نے (مسدس حالی) لکھ کر نظم اردو میں انقلاب عظیم کیا اسے خیالی مضمون آفرینیوں
کے میدان سے نکال کر حقیقت آشنا کر دیا اور راجہ جے کشن داس نے قومی
تعلیم کی ہندؤوں کے لیے (ہندو کالج آگرہ) بنا ڈالی [۱]"

سید احمد خاں کا مدرسہ ایک درسگاہ، ایک علامت اور تحریک تینوں کا مجموعہ تھا اور اس کی آبیاری، اُن کے ذہن و فکر کی توانائی اور مقصدیت سے ہوتی تھی۔ مجتہد العصر مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا کہ:

"مرحوم سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قایم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اس رسالہ (تہذیب الاخلاق) نے استوار کیں اور اسے اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی و ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہو گا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں اور نئی شاعری کی بنیاد اگرچہ لاہور میں پڑی تھی مگر اسے نشو و نما یہیں کی آب و ہوا میں ملی۔ اردو خطابت کی یہ پہلی درسگاہ تھی۔ [۲]"

---

[۱] خلیق احمد نظامی۔ سرسید البم۔ ادارہ ادبیات دلی ۱۹۵۳ء ص نمبر ۸۳

[۲] کانوکیشن ایڈریس آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند بموقعہ سالانہ جلسہ تقسیم اسناد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء۔ باہتمام سید اعجاز علی بریلوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں چھپا ص ص ۶-۷

باب اوّل

مذہب:

- مذہبی فکر
- ابتدائی تصانیف اور تراجم۔ جلاء القلوب بذالمجبوب،
تحفۂ حسن، کلمۃ الحق، راہِ سنت در ردِّ بدعت۔ نمیقہ
فی بیان مسئلہ تصورِ شیخ۔ ترجمہ دیباچہ کیمیائے سعادت
رسالہ احکام طعام اہل کتاب
- تبیین الکلام
- الخطبات الاحمدیہ
- تفسیر القرآن
- تحریر فی اصول التفسیر
- ابطال غلامی
- مذہبی رسالے اور آخری مضمون ڈاکٹر ہنٹر کے الزامات
کی تردید۔ ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کی ہی اور
بربادی سے بچانے کے لئے۔ النظر فی بعض مسائل المام الھمام
ابوحامد محمد غزالی ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم۔
ازالۃ غین عن ذی القرنین تفسیر الجن والجان علی مافی القرآن
خلق الانسان علی مافی القرآن۔ الدعاد الاستجابہ۔
ازواج مطہرات۔
- ناقدین

مذہبی فکر:

سید احمد خاں کی مذہبی فکر کے پس منظر میں سب سے زیادہ اہم عمل اور ردّ عمل کا وہ پہلو ہے جو مغربی تہذیب، عیسائی مذہبی تحریکوں اور مستشرقین کے طرز عمل سے متعلق ہے اور جس کی نوعیت کو سمجھے بغیر ان کی مذہبی فکر کا جائزہ ممکن نہیں۔

یورپ میں سید احمد خاں کے ہمعصر ڈارون (۱۸۰۹ء - ۱۸۸۲ء) اور منڈل (۱۸۲۲ء - ۱۸۸۴ء) جیسے سائنس داں اور اشپرنگر، میور (۱۸۱۹ء - ۱۹۰۵ء) فنڈر (۱۸۰۳ء - ۱۸۶۵ء)، اور نولدیکے جیسے مستشرقین اور مبلغین تھے اس زمانے میں مذہب کی طرف مغربی ممالک میں رجحان ہونے لگا تھا۔

یورپین تاجر جنھوں نے اپنا سیاسی اور تجارتی اقتدار قائم کیا وہ بھی مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں پیش پیش نظر آنے لگے۔ مغربی حکمرانوں کے اس طریق کار کو سمجھنے کے لئے درج ذیل مثال کافی ہوگی۔

ARTICLE 2:

TOUS LES ESCLAVES SERONT INSTRUITS DANS LA RELIGION CATHOLIQUE APOSTOLIQUE ET ROMAINE, ET BAPTISES. ORDONNONS AUX HABITANTS QUI ACHEPTERONT DES NEGRES DE LES FAIRE INSTRUIRE ET BAPTISER DANS LE TEMPS CONVENABLE A PEINE D'AMENDE ACHITRAISE. ENJOIGNONS AUX DIRECTENURS GENERAUX DE LA COMPAGNEE DES INDES ET A TOUS LES OFFICIÉRS D'Y TENIR EXACTEMENT LA MAIN.

SIGNÉ DUPLEIX (1)

(1) ARCHIEVES DE PONDICHERRY, DOCUMENT NO. 29, EDIE DU ROY DONNE A VERSEILLES, AN MOIS DE MARS L724.

ترجمہ: پانڈیچری کے محافظ خانہ میں دستاویز نمبر ۲۹ - بادشاہ کا فرمان جو شہر ورسائی نزد پیرس میں ماہ مارچ ۱۷۲۴ء میں دیا گیا -

"دفعہ ۲: سارے غلاموں کو رومن کیتھولک آپاسٹالک مذہب کی تعلیم دے کر بپتسمہ دلائیں ورنہ انھیں مناسب سزا دی جائے گی۔ ہم ہندوستان کی تجارتی کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل اور وہاں کے سارے فوجی افسروں کو حکم دیتے ہیں کہ اس فرمان کی پوری تعمیل ہو۔"

دستخط ڈوپلے

۱۸۳۲ء کی ابتداء میں ایک ہندوستانی طالب علم وزیر خاں طب (میڈیکل) کی تعلیم کے لئے لندن گئے جہاں انھوں نے محسوس کیا کہ برطانیہ کی مذہبی پالیسی اور طرز عمل کے درمیان اختلاف تھا۔ وہاں کے مذہبی جوش اور عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کو دیکھ کر وزیر خاں نے اپنی تعلیم کے علاوہ ان سہولتوں سے فایدہ اٹھایا جو انگلستان میں قیام کے باعث انھیں حاصل تھیں چنانچہ انھوں نے یونانی اور لاطینی زبان سیکھی اور مسیحیت کی قدیم وجدید کتابوں کا بھی مطالعہ کیا[1]۔ ان کے ایک ہم عصر غنایت رسول چریاکوٹی نے اسی غرض سے ہندوستان ہی میں رہ کر عبرانی زبان سیکھی اور اس پر عبور حاصل کیا۔

انگریز پادری ایف ایڈمنڈ نے ۱۸۵۳ء میں حکومت کے سارے ملازموں کو ایک گشتی خط بھیجا جس میں لکھا کہ اب سارا ہندوستان برطانیہ کے قبضہ میں آچکا ہے اور مواصلات کے اعتبار سے ایک ہی نظام میں منسلک ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سارے باشندے عیسائیت قبول کرلیں۔ جب بنگال کے لفٹیننٹ گورنر نے محسوس کیا کہ اس حکم سے اہل ملک میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے تو انھوں نے ایک کتابچے کے ذریعے اعلان کیا کہ پادری ایڈمنڈ کے خیالات سے حکومت کو کوئی سروکار نہیں اور سابق گورنر جنرل بینٹ ویک کی اس پالیسی کی توثیق کی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنے مسلک پر قایم رہنے کی پوری اجازت ہو گی۔ کہا

---

[1] مقدمہ اظہار الحق، مرتبہ سید ابوالحسن ندوی، مطبوعہ قطر ۱۹۸۰ء صفحہ ۳

جاتا ہے کہ اس پر جوش مبلغ نے خطوط کے لئے جو کاغذ استعمال کیا اس پر گورنر جنرل کا نام چھپا تھا اور جو اُن ہی کے استعمال کے لئے مخصوص تھا۔ اس نے یہ خط گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ کئے تھے [۱]

اس زمانہ میں انگلینڈ کے بہترین ماہرینِ اسلام کو ہندوستان بھیجا گیا سر ولیم میور [۲] جس کو مختلف زبانوں پر عبور تھا۔ فنڈر کے اصرار پر اس نے ہندوستان میں ملازمت کے دوران چار جلدوں میں ایک ضخیم کتاب "حیات ماحومیت" (۱۸۵۵ - ۱۸۶۷ء) لکھی۔ یہ کتاب عربی ماخذوں پر مبنی ہے جیسے ابن ہشام، ابن سعد، واقدی اور طبری، ولیم میور کی گورنری کے زمانے میں جرمن پادری فنڈر [۳] نے "اظہار الحق" کے مولف مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے اسلام اور عیسائیت کے متعلق مناظرہ کیا۔ جس کا ذکر میور نے اپنی کتاب میں کیا مگر اس نے غلطی سے نام "رحمت علی" لکھدیا ہے۔

فنڈر نے ہندوستان آکر کلکتہ سے اسلام کے خلاف رسالے بزبان فارسی شایع کئے۔

---

[۱] بشیر احمد ڈار۔ سید احمد خاں کے مذہبی رجحان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر کلب روڈ لاہور ۱۹۵۰ء ص ۸

[۲] ولیم میور کی ولادت گلاسکو میں ہوئی وہ انگریزی، لاطینی، جرمن اور فرانسیسی کے علاوہ عربی فارسی اور اردو جانتا تھا انڈین سروس میں وہ داخل ہو کر یوپی (شمال مغربی صوبہ) کا لیفٹنٹ گورنر بنایا گیا۔ اس کا حال آگے تفصیل سے آئے گا۔

[۳] کارل گوٹ لوب فنڈر ۳ نومبر ۱۸۰۳ء کو مغربی جرمنی کے شہر اسٹوٹ گارڈ کے علاقہ باڈور ٹمبرگ کے ایک گاؤں وایب لنگن میں پیدا ہوا اور یکم دسمبر ۱۸۶۵ء کو رچمنڈ (انگلستان) میں وفات پائی۔ اس کا والد دیندار (PIETEST) عیسائی تھا اس نے فنڈر کو کم عمری ہی سے لاطینی مدرسے میں داخل کر دیا بعد ازاں فنڈر نے سوئزرلینڈ کے شہر باذل کی مشہور مشنری درسگاہ میں تعلیم مکمل کی اور ۲۰ مئی ۱۸۲۴ء کو باقاعدہ پادری بن گیا۔ باذل کی مشن نے اولاً اس کو شوشا بھیجا جو ایرانی سرحد کے قریب روسی آرمینیا میں ہے جہاں اس نے امیر خانیانتس ایک ارمنی کو اپنا معتمد بنایا جس نے ایران میں اعلیٰ تعلیم پائی تھی اور اسلام سے خوب واقف تھا۔ فنڈر نے اس کی مدد سے غالباً اسی زمانے میں تکذیب اسلام کے لئے اپنی فارسی کتاب "میزان الحق" کا لکھنا طے کیا۔ فنڈر نے فارسی سیکھنے اور عیسائیت کی تبلیغ کی غرض سے کئی بار ایران کا سفر کیا۔ حکومت زار نے جب اسے روس سے نکل جانے کا حکم دیا تو اس نے انگلستان کی چرچ مشنری سوسائٹی کی ملازمت کی جس نے اسے ۱۸۳۹ء میں کلکتہ بھیجا پھر ۱۸۴۰ء میں اس کا تبادلہ آگرہ ہوا جب ۱۸۵۴ء میں اسے مولانا رحمت اللہ کے ہاتھوں مذہبی مباحثے میں شکست ہوئی تو کلیسا کی ہدایت پر وہ پشاور چلا گیا ادھر ادھر گھومتا ہوا وہ انگلستان پہنچا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

"اسے اپنی کتاب" میزان الحق" پر بڑا ناز تھا جسے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپوایا اور مسلمان علماء کو دعوت دی کہ اس کا جواب لکھیں۔ ولیم میور کے کہنے پر وہ آگرہ منتقل ہو گیا جہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس کے چیلنج کو قبول کیا اور چار مسائل پر مناظرہ ہوا:

بائبل میں تحریف کا ہونا۔

تثلیث۔

حضرت محمدؐ کا پیغمبر ہونا۔

قرآن کی حقانیت۔

اور یہ شرط طے پائی کہ مولانا اگر یہ تسلیم کر لیں کہ فنڈر کے اعتراضات صحیح ہیں تو وہ عیسائیت اختیار کر لیں گے اور اگر پادری فنڈر اپنے حریف کے دلایل کو صحیح مان لے تو وہ اسلام قبول کرلے گا۔

سید احمد خاں اس وقت دہلی میں انگریزی محکمۂ عدالت میں ملازم تھے وہ آگرہ تو نہیں آئے مگر دور بیٹھ کر بھی اس مناظرہ سے انھیں بڑی دلچسپی رہی۔ اس میں شرکت کے لیے شہر کے سب ہی باشندے کثیر تعداد میں آئے اور آگرہ کے انگریز افسر بھی مناظرہ سننے کے لئے موجود تھے۔ یہ واقعہ اپریل ۱۸۵۴ء کا ہے۔ بحث کے دوسرے دن پادری فنڈر نے تسلیم کیا کہ بائیل میں آٹھ مقامات پر اصل عبارت کو جو ناقابلِ فہم اور بے معنی تھی بدل کر نئی عبارت لکھ دی گئی تاکہ آسانی سے لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ بحث کے تیسرے دن مولانا تو آئے لیکن فنڈر نہیں آیا اور کلیسائی ذمہ داروں نے اسے مخفی طور پر پشاور بھیج دیا اور پھر ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ فنڈر کو اصرار تھا کہ اس نے جو بات تسلیم کی وہ عیسائیت کی ہزیمت نہیں تھی چنانچہ اس نے چرچ مشنری سوسائٹی کو ایک خط (جو رسالہ چرچ مشنری اینٹیلجنس ۱۸۵۴ء صفحہ ۲۵۰ پر نقل ہوا) میں لکھا کہ:

" مستقبل بعید میں اس کا اثر عیسائیت کے لئے مفید ہوگا کیونکہ مسلمانوں میں جو بیداری پیدا ہوئی وہ عارضی ہے۔ البتہ مناظرہ کے باعث ایک تحریک سی پیدا ہو گئی ہے اور

وہ غالباً اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ وہ لازمی طور پر عیسائیت کی طرف مائل ہو جائیں گے۔"

اس پر پروفیسر مسٹر پاویل نے ایک نوٹ کا اضافہ کیا ہے۔

"اس حسن ظن سے وہ سارے عیسائی متفق نہ تھے جو اس مناظرہ کے وقت موجود تھے۔ چنانچہ اس کے بعد جلد ہی فنڈر کی مخالفت کے باوجود چرچ مشنری سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کے فیصلہ کے مطابق اسے پشاور بھیج دیا گیا۔"

"مولانا رحمت اللہ کیرانوی" کے عنوان سے مسٹر پاویل نے اپنے اسی مضمون میں لکھا کہ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی ہیں کہ عیسائیت سے متعلق جو جدید علم ان ہندی مسلمانوں کو تھا وہ کے۔جی فنڈر جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ مبلغ کو بھی نہ تھا۔

پھر اس نے یہاں سے مایوس ہو کر ترکی میں قسمت آزمائی کی اور قسطنطنیہ میں افواہ پھیلا دی کہ ہندوستان کے عمومی مناظرہ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور بڑی تعداد میں لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی اور مسجدیں گرجوں میں تبدیل ہو گئی ہیں[1]

۱۸۵۷ء کی شورش میں انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ خاص طور پر علماء و فضلاء تھے رحمت اللہ بھی مجبور ہوئے کہ ترکِ وطن کر کے مکہ میں جا بسیں وہاں کے حکام پر ان کی علمی قابلیت کا بڑا اثر ہوا اور وہ مدرس بنا دیے گئے۔ جب سلطان عبدالعزیز کو فنڈر کے جھوٹے دعوے کی حقیقت معلوم ہوئی تو والیٔ مکہ کو لکھا کہ ہندوستان کے حاجیوں سے اس کی تصدیق کی جائے۔ شریف مکہ نے فوراً جواب دیا کہ مناظرہ کے ہیرو ان دنوں مکہ میں موجود ہیں۔ سلطان نے مولانا کو عزت کے ساتھ سرکاری مہمان کی حیثیت سے ۱۸۶۴ء میں قسطنطنیہ (استنبول) آنے کی دعوت دی۔ جیسے ہی فنڈر کو اطلاع ملی کہ مولانا رحمت اللہ ترکی کے دارالسلطنت آنے والے ہیں تو وہ وہاں سے رخصت ہوا۔

---

[1] جرنل الشیاٹک سوسائٹی۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی پریس لندن ۱۸۵۶ء صفحہ ۱۰ - ۱۱

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں فنڈر سے مناظرہ کرنے میں مولانا رحمت اللہ کے دستِ راست تھے۔ اس مناظرہ کے حالات پہلے اپنے مضمون بیان الحق میں قلمبند کئے اور پھر مزید تفصیل سے خود مولانا نے اپنی کتاب اظہار الحق میں لکھے ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں عام طور سے تبلیغِ دین کا کام غیر سرکاری اداروں کے سپرد تھا۔ مثلاً مشنری مدرسے، مشنری شفا خانے اور غیر سرکاری مشنری انجمنوں کی کتابیں اور مذہبی مناظرے اور خیراتی ادارے جیسے یتیم خانے، نیز راہبہ اور راہب جو غریبوں اور محتاجوں کی خدمت کرتے تھے۔ مسٹر پادیل کے بیان کے مطابق عیسائی مشنری عموماً غریب اور ان پڑھ لوگوں میں تبلیغ کرتے تھے لیکن پادری فنڈر کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ اہلِ علم سے مناظرہ اور مباحثہ کرتا تھا۔

اسی زمانے میں ایسے اہلِ مغرب بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے بہ رضا و رغبت اسلام قبول کیا۔ گارسین دتاسی نے اپنے خطبات میں ذکر کیا ہے کہ لندن کا ایک لارڈ میئر (صدر بلدیہ) بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے اسلام قبول کیا[1]۔

فنڈر ہوں کہ اشپرنگر یا ولیم میور یہ ایسے مستشرقین تھے جن کے خیال میں اسلام کی تردید مسلمانوں کی کتابوں کی مدد سے ہی کی جا سکتی تھی۔ پادری فنڈر نے فارسی سیکھی جو مغلیہ ہندوستان کی سرکاری زبان تھی اور مذہبی مناظرہ کی کتابیں لکھیں جن میں سے "مفتاح الاسرار" ۱۸۳۹ء کلکتہ سے شایع ہوئی اور "میزان الحق" آگرہ سے ۱۸۵۰ء میں چھپی۔

اشپرنگر نے ۱۸۵۱ء میں اپنی انگریزی کتاب اصلی ماخذوں پر مبنی حیاتِ محمدؐ الہ آباد میں شایع کی اور اپنی مادری زبان جرمن میں "محمد کی زندگی اور تعلیم" تین جلدوں میں برلن سے ۱۸۶۱ء میں چھاپی نیز "محمد اور قرآن ایک نفسیاتی مطالعہ" ۱۸۸۹ء میں ہمبورگ سے چھپی۔ ولیم میور کی مشہور انگریزی کتاب "لائف آف ماحومیت" کا مقدمہ ۱۸۵۳ء میں کلکتہ سے شایع ہوا اور اصل کتاب کی پہلی جلد ۱۸۵۵ء میں طباعت کے لئے گئی۔ پھر ۱۸۵۸ء میں جلد دوم تیار کی۔ غدر کے ہنگامے کی وجہ سے اس نے اپنا ذاتی کتب خانہ ایک محفوظ جگہ پر منتقل کر دیا تھا۔ اس لئے کتاب کی تصحیح خاطر خواہ

---

[1] خطبات گارسین دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء ص ۸۵۔

طریقہ پر نہ کر سکا۔ بقیہ دو جلدیں تین سال کے بعد ۱۸۶۱ء میں لندن سے چھپیں۔ ولیم میور کی "لائف آف ماحومیت" سنجیدہ علمی کتاب ہے۔ اس کی زبان شگفتہ اور رواں ہے۔ اس کے اخذ کردہ نتائج اسلام کے خلاف تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ کتاب پسند نہ آئی اور انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں زیادہ پڑھی نہ جا سکی۔

اگرچہ سید احمد خاں انگریزی سے پورے طور پر واقف نہ تھے۔ اس کے باوجود ولیم میور کی مذکورہ کتاب کا انھیں علم تھا وہ واحد مسلمان مفکر تھے جنھوں نے وہ خطرہ نہ محسوس کر لیا ہو جس سے اہلِ اسلام دوچار تھے لیکن اس کے ازالہ اور سدِّ باب کے لئے مختلف افراد کے خیالات میں ہم آہنگی اور کاوش کی کمی تھی۔ ہندوستان میں مغربی فکر اور جدید اندازِ تحقیق کے ساتھ ساتھ دو ایسے حالات رونما ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو جدید طرزِ فکر سے قریب آنے میں دشواریاں پیدا کیں۔ ایک انگریزوں کا سیاسی اقتدار اور دوسرے عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں۔

چند اشخاص یہ چاہتے تھے کہ مسلمان سپر انداز نہ ہوں اور مقابلہ جاری رکھیں لیکن زمانہ اس کا متقاضی نہ تھا۔ اس لئے سب ایسے لوگ ناکام رہے اور مسلمانوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس مکتبِ خیال میں ان لوگوں کو بھی شامل کرنا چاہیے جو انگریزی زبان کا سیکھنا ہندی مسلمانوں کے لئے مذہبی نقطۂ نظر سے حرام و ممنوع سمجھتے تھے۔ مگر متعدد دنیوی شعبوں میں مغربی علوم کو ناقابلِ انکار برتری حاصل تھی۔ اس لئے انگریزی کی مخالفت پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ اگرچہ اس سے اس تحریک کو فروغ ملا کہ سائنس کی کتابوں کا ملکی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔

بعض لوگ اس بات سے دہشت زدہ تھے کہ انصاف کے خلاف انگریزی حکومت نے ان اوقاف کو بالخصوص بنگال میں ضبط کیا جن سے دینی مدرسے چلتے تھے۔ اسی لئے مذہبی میراث کو محفوظ کرنے کے لئے انھوں نے یہ طے کیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے حالانکہ وہ حالات کے پیشِ نظر اس پر عمل درآمد نہ کر سکے۔ ایسے حضرات نے دیوبند میں پرانے طریقۂ تعلیم کا دار العلوم قایم کیا تا کہ اس سے وہ طلباء فائدہ اٹھائیں جو مذہبی علوم کی تعلیم چاہتے ہیں۔

کچھ اور افراد نے یہ سوچا کہ ایک جدید وضع کی دینی درسگاہ قایم کی جائے جہاں تعلیم اردو میں ہو اور جس میں عربی زبان کی اس معیار کی تعلیم دی جائے کہ سارے دینی شعبوں (تفسیر، حدیث،

فقہ) میں عربی کتابیں ہی نصاب میں داخل ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ دینوی علوم کی بھی تعلیم دی جائے مثلاً علم ہیئت، طب نیز انگریزی زبان کی تعلیم اس حد تک کہ طلبا اس زبان میں کتابیں پڑھ کر سمجھ سکیں۔ اس طرح کا مدرسہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نام سے ۱۸۹۴ء میں قایم کیا گیا۔ مولانا شبلی اس کے بانیوں میں شامل تھے انھوں نے علمی تحقیق و تصنیف کے لئے بھی ایک ادارہ ۱۹۱۳ء میں "دارالمصنفین" اعظم گڑھ میں قایم کیا جہاں سے تحقیقی و ادبی ماہوار رسالہ "معارف" جاری ہوا جس کا شمار تحقیقی جریدوں میں ہوتا ہے۔

سید احمد خاں نے اپنی مذہبی فکر کی اساس عقلیت اور اجتہاد پر رکھی اور اسی نقطۂ نظر سے مذہب کی اصلیت کو جاننے کی کوشش کی:

"میں نے مذہب کی صداقت دریافت کرنے کے لئے یہ اصول قرار دیا ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے یا نہیں"۔[1]

ان کے مذہبی معتقدات کی تفہیم میں مندرجہ ذیل حقایق کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور روزمرہ زندگی میں باعمل و مخلص تھے۔

ان کی تاحیات یہ خواہش رہی کہ اسلام کی مدافعت کریں اور اس پہ لگائے گئے الزامات کی تردید مدلل انداز میں کریں۔ اس عقلی دفاع میں انھوں نے وہی طریقے استعمال کئے جو مستشرقین کا امتیاز تھے۔ وہ عقلیت پسند اور آزاد خیال (لبرل) مفکر تھے۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ کسی کی رائے کے پابند نہیں بلکہ اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے جو عام طور پر ان کی افتادِ طبع کی آئینہ ہوتی تھی پیغمبرِ اسلام کی زندگی کے جو واقعات پرانی تاریخی حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں ان کی سید احمد کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اگر کسی واقعہ کی عقلی توجیہ نہیں کر سکتے تو کہدیتے کہ وہ واقعہ سرے سے غلط ہے اور پیغمبرِ اسلام نے وہ کام نہیں کیا تھا۔

وہ بڑی اخلاقی جرأت کے مالک تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمان مفسر، محدث، فقیہ اور مؤرخ سے اختلاف کیا بلکہ انگریز مستشرقین پر تنقید اور ان کے لئے بھی سخت الفاظ استعمال کرنے میں کوئی جھجک

---

[1] سید احمد خاں۔ لیکچروں کا مجموعہ۔ مرتبہ سراج الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء صفحہ ۲۱۳

محسوس نہیں کی۔

ان کی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صداقت پسند، نڈر اور صاف گو انسان تھے۔ اسلام دوستی کی اس روایت کی تجدید سید امیر علی کی علمی تحریروں "اسپرٹ آف اسلام" (لندن ۱۸۹۱ء) اور "تاریخ سارا سین" (کلکتہ ۱۹۲۷ء) سے ہوئی۔ انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھنے میں جس انسان دوستی اور لبرل رویہ کو اختیار کیا تھا اس کی پیروی بعد میں آنے والے بیشتر مفسرین نے کی مثلاً سید احمد خاں کے بوئے ہوئے بیج کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر "قرآن" میں پھلتے پھولتے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے اس رویہ میں سرسید سے مستفیض تھے۔

علامہ اقبال مغربی مکاتب فکر سے واقفیت رکھنے کے باوجود اُن سے متاثر تھے۔ مثال کے طور پر اُن کے بیان کردہ آدم کے قرآنی قصہ، نظریہ اجتہاد، جزا و سزا، بعد موت جنت اور دوزخ کے تصور میں سرسید کے خیالات کا عکس ملتا ہے[1]۔

ان کی مذہبی تحریروں میں اولین کتاب "جلاء القلوب بذکر المحبوب" (۱۸۴۲ء) یعنی پیغمبر اسلام کی سوانح اور آخری مضمون "ازواجِ مطہراتِ رسولِ خدا" ۱۸۹۸ء میں لکھا گیا جب سرسید بستر مرگ پر تھے۔ اس چھپن سالہ طویل مدت میں فکری ارتقاء ناگزیر تھا۔ اس سے غیر سنجیدہ معترضین کو موقع ملا کہ انھیں تضاد کے لئے موردِ الزام ٹھہرائیں لیکن کسی حق پسند مصنف کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سابقہ معلومات کی بناء پر اگر اس نے کوئی غلط رائے قایم کر لی تھی تو اس کو نہ صرف بدلے بلکہ بے جھجک اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرے۔

آئندہ صفحات میں سید احمد خاں کی مذہبی تصانیف کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا تاکہ ان کی روشنی میں قارئین ان کی مذہبی فکر سے متعلق خود اپنی رائے قایم کر سکیں۔

---

[1] بشیر احمد ڈار۔ سید احمد خاں کا مذہبی رجحان۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر کلب روڈ لاہور ۱۹۵۷ء پیش لفظ ص ۷

ابتدائی تصانیف اور تراجم

حقیقت تو یہ ہے کہ سرسید مختلف فیہ مذہبی مسائل میں پڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن ہمارے معاشرے میں مذہب کے بغیر کوئی گفتگو ممکن نہ تھی اس لئے انھیں بھی اپنے معتقدات کا وقتاً فوقتاً اظہار کرنا پڑا۔ شروع شروع میں انھوں نے اپنے دینی تصورات کو چند رسائل اور بعد میں تفسیر قرآن میں موقع بہ موقع واضح طور پر قلمبند کیا چنانچہ ان کی مذہبی تحریروں کی نوعیت یہ تھی:

(۱) قدیم افکار کی تشریح نئے رجحانات سے متاثر ہو کر کرنا۔

(۲) عیسائی مشنریوں کے اعتراضات کے خلاف مدافعتی ذہن تیار کرنا۔

(۳) مستشرقین کے علمی جوابات دے کر اسلام سے برگشتگی کے رجحان کو روکنا جو علمیت کے سایہ میں بڑھ رہا تھا۔

(۴) قرآن کی نئی تفسیر۔ جدید رجحانات کی روشنی میں کرنا۔ انھوں نے مذہب سے متعلق اپنی تمام تحریروں کو "تصانیف احمدیہ" کی نو جلدوں میں یکجا کر دیا ہے۔ سید احمد خاں نے سب سے پہلے اس کی جلد سوم متعلقہ تفسیر القرآن کو ۱۸۸۰ء میں شائع کیا اور تین برس بعد جلد اول ۱۸۸۳ء اور جلد دوم ۱۸۸۳ء میں طبع ہوئیں۔ تمہید میں انھوں نے وضاحت کی:

"میں نے متعدد مذہبی کتابوں کے لکھنے کا اتفاق ہوا جو ہر ایک وقت کے خیالات کے مطابق ہیں ان سب کا بترتیب جمع کرنا گویا ان تمام زمانوں کے خیالات کو بترتیب سامنے رکھنا ہے جس سے شاید مجھ کو اور آئندہ آنیوالی نسلوں کو فائدہ ہو پس میں اپنی تصنیفات کے اس حصہ میں مذہبی کتابوں اور رسالوں کو ایک جگہ جمع کرتا ہوں۔

گو مجھ کو علمی لیاقت کچھ نہیں اور میرا درجہ ایک جاہل آدمی سے شاید ہی کچھ زیادہ ہو لیکن لڑکپن سے سوچنے والی طبیعت تھی۔ جب حیوانی زندگی سے طبیعت نے دوسری طرف پلٹا کھایا تو اس کی کروٹ بجز مذہبی کروٹ کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ اور دوسرا پہلو بجز اس پہلو کے جو علم تھا اور جس پر سب کا یقین تھا اور کیا ہو سکتا تھا؟ مگر سوچنے والی طبیعت ہر دم ساتھ تھی اور وہی تمام انقلابوں کا باعث ہوئی اور

اسی نے اس سچائی تک پہنچایا جس کو میں ٹھیٹ اسلام سے تعبیر کرتا ہوں گو کہ رسمی مسلمان اس کو ٹھیٹ کفر سمجھتے ہوں۔" [1]

"جلاء القلوب بذکر المحبوب" اردو میں ایک مختصر رسالہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں دہلی سے شایع ہوا سید احمد خاں کے دل میں پیغمبر اسلام کا بڑا احترام تھا اور ان کی خواہش تھی کہ رسالت مآبؐ سے متعلق ضروری معلومات عوام تک پہنچیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں میلاد النبی کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ سید احمد خاں کے زمانے میں متعدد مولود نامے موجود تھے جن کو لوگ عقیدت سے پڑھتے تھے ان رسالوں میں عموماً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ حضورؐ کی پیدایش کے موقع پر محیر العقول، ما فوق الفطرت واقعات پیش آئے۔ سید احمد خاں نے "جلاء القلوب" اس مقصد سے لکھی کہ صحیح اور معتبر واقعات بیان کئے جائیں انھوں نے پیدائش کی تفصیل کے ساتھ رسول اکرمؐ کے مختلف نام، شکل و صورت، وضع قطع، سیرت، آپؐ کے صحابہ خاص کر عشرہ مبشرہ، پالتو جانور، نجی ہتھیار، آپ کے معجزے اور آپ کے حجۃ الوداع کا تذکرہ کیا ہے۔

اس رسالہ کی تصنیف کے وقت وہ معجزات کے قایل تھے مثلاً انھوں نے معجزات کے ذیل میں لکھا کہ:

"جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ہزار ہا معجزات ظہور میں آئے ہیں اون کا احاطہ ممکن نہیں مگر یہاں چند معجزات بیان کئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا معجزہ کلام اللہ کا یہ ہے کہ کیسا ہی عالم فاضل فصیح و بلیغ ہو اس کی چھوٹی سے چھوٹی ایک سورہ کے برابر بھی نہیں کہہ سکتا اور آپؐ کی انگلی کے اشارے سے شق القمر ہوا کہ کسی نبی سے ایسا معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔" [2]

سر سید نے یہ بھی لکھا کہ اس میں نہ صرف معتبر روایتیں نقل ہوئی ہیں بلکہ غیر معتبر روایات کی تردید بھی کر دی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ رسول اکرمؐ کی وفات پر خضر علیہ السلام بھی تعزیت کے لئے

---

[1] سید احمد خاں تصانیف احمدیہ حصہ اول جلد اول علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۸۸۳ء صفحہ ۲

[2] سید احمد خاں۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب لیتھو گرافک پریس دہلی ۱۸۴۲ء صفحہ ۴۲ - ۴۳

مدینہ تشریف لائے تھے۔

خضر علیہ السلام کے متعلق اس روایت کا ذکر بلاذری (متوفی ۸۹۲ ء/ ۲۷۹ھ) نے اپنی کتاب "انساب الاشراف" (ج ۱، ف ۱۱۴۵) میں المدائن کے حوالے سے کیا ہے کہ الشعبی نے بیان کیا کہ رسول خدا نے وفات پائی تو لوگوں نے ایک نظر نہ آنے والے شخص کو یہ کہتے سنا کہ:

"خدا ہر فوت ہونے والی چیز کا عوض اور ہر مصیبت میں تسلی دینے والا ہے جس کو ثواب مل جائے تو اس کے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے اور جسے نہ ملے وہ محروم رہ جاتا ہے۔"

اس کلام کو سننے کے بعد حضرت علی نے فرمایا کہ "یہ خضر ہیں جو تم سے پیغمبر کی وفات پر تعزیت کر رہے ہیں"۔ اور حضرت خضر مسلمانوں کے لئے نامعلوم شخص نہیں۔ خود صحیح بخاری میں رسول اللہ کی زبان سے ان کے متعلق عجائبات کا ذکر آیا ہے اگرچہ بخاری نے مذکورہ بالا روایت کہ وہ تعزیت نبوی کے لئے مدینہ آئے تھے، بیان نہیں کی۔

سید احمد خاں عقلیت کے قایل تھے اور وہ خضر علیہ السلام سے متعلق اس روایت کو ۱۸۴۲ء جیسے ابتدائی زمانے ہی میں رد کر دیتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فکری مادہ ان میں شروع سے تھا۔

اس کتاب کا خاتمہ ایک نعت رسول پر ہے اور ماخذات میں انھوں نے "سرور المحزون" (شاہ ولی اللہ) اور "مدارج النبوہ" (عبدالحق دہلوی) کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید ان علماء سے متاثر تھے۔

انھوں نے اپنے تصنیف کردہ رسالہ پر خود تبصرہ کیا ہے جو "تصانیف احمدیہ" جلد اول مطبوعہ ۱۸۸۳ء میں شامل ہے۔ وہ مولانا اسماعیل شہید کی طرح ایک ایسے میلاد نامے کو ضروری سمجھتے ہیں جو صحیح اور مستند واقعات پر مشتمل ہو اور حشو و زوائد سے پاک ہو۔

تحفہ حسن:

مولانا شاہ عبدالعزیز نے ایک رسالہ "تحفہ اثنا عشریہ" لکھا جس میں ان اعتراضات کا مدلل جواب دیا جو شیعہ حضرات خلفائے راشدین کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ اس سے متاثر ہو کر سید احمد خاں نے مذکورہ رسالے کے دسویں باب متعلق "مطاعن اصحاب ثلثہ" اور بارہویں

باب "تولا و تبرا" کا اردو ترجمہ "تحفۂ حسن" کے نام سے کیا۔ اس کی تیاری میں انھیں اپنے استاد مولانا نورالحسن دہلوی کی سرپرستی حاصل رہی جس کا اعتراف انھوں نے رسالہ کی ابتدا میں کیا۔ پہلی بار یہ رسالہ ۱۸۴۴ء میں اور دوسری بار تصانیف احمدیہ جلد اول میں ۱۸۸۳ء میں شایع ہوا۔

کلمۃ الحق

یہ رسالہ ۱۸۴۹ء میں شایع ہوا۔ اس میں پیری مریدی سے متعلق بحث کی گئی ہے اور راہ و رسم خانقاہی پر اعتراض کیا ہے۔ مولانا اسماعیل شہید کے زیراثر سید احمد خاں کا بھی خیال ہے کہ دینِ اسلام حضورؐ کی حیات میں ہر اعتبار سے مکمل ہو گیا تھا اب اس میں کسی قسم کا مذہبی یا غیر مذہبی اضافہ نہ صرف غلط بلکہ کفر ہے۔

ابتدائی دور میں سید احمد خاں پر وہابیت غالب ہے۔ انھیں کتاب اور سنّت کی موجودگی میں سلوک و طریقت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسری بار اس رسالہ کی اشاعت تصانیفِ احمدیہؒ جلد اول میں ہوئی۔

راہ سنّت در ردِّ بدعت:

سولہ صفحوں کا یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، سنت کی تائید اور بدعت کی مخالفت میں لکھا جس میں سید احمد خاں نے یہ بات صاف صاف لکھدی ہے کہ خدا کی اطاعت اور رسول کریم کی سنت کی پیروی کے علاوہ نجات کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہاں بھی مولانا اسماعیل شہید کے اثرات واضح ہیں۔

اس رسالہ کی پہلی طباعت ۱۸۵۰ء میں اور دوسری ۱۸۸۳ء میں عمل میں آئی۔

نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور شیخ:

نقشبندی سلسلہ میں تصور شیخ پر زور دیا جاتا ہے لیکن دوسرے سلاسل میں اس پر اختلاف ہے سید احمد خاں کا خیال ہے کہ تصوّرِ شیخ کی وساطت ہی سے خدا کا تصوّر اور پھر فنا فی الذات کے درجہ تک پہنچنا ممکن ہے جس سے سید احمد خاں پر نقشبندی اثرات ثابت ہوتے ہیں حالانکہ سید احمد شہید اس سے متفق نہیں تھے۔ چھ صفحوں کا یہ رسالہ ۱۸۵۲ء میں شایع ہوا اور پھر تصانیف احمدیہؒ میں طباعت پذیر ہوا۔

ترجمہ دیباچہ کیمیائے سعادت

سید احمد خاں نے امام غزالی کی کتاب کیمیائے سعادت کے دیباچہ اور تین فصلوں کا ترجمہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ایماء پر کیا۔ اس کتاب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اسے اپنی جسمانی اور روحانی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ اس کو رضائے الٰہی اور خوشنودئی رب حاصل ہو جائے۔ یہ رسالہ پہلی بار ۱۸۵۳ء میں اور پھر تصانیف احمدیہ میں ۱۸۸۳ء میں شایع ہوا۔

رسالہ احکام طعام اہل کتاب

یہ رسالہ ۱۸۶۸ء میں نول کشور پریس کانپور سے شایع ہوا جو نوے صفحات پر مشتمل ہے۔ سید احمد خاں کی رائے میں قرآن مجید یہ اجازت دیتا ہے کہ اہلِ کتاب کے کھانے اور ان کے یہاں کا ذبیحہ گوشت مسلمان کھا سکتے ہیں۔ غالباً اس کی اساس قرآنی سورہ (۵) کی آیت (۵) ہے کہ:

"وہ آج تمہارے لئے ساری اچھی چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا (طعام) جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان لوگوں کے لئے حلال ہے . . . ."

دوسرے الفاظ میں ان کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دینا اور کھانے کے لئے ان کی دعوت کو قبول کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے۔

یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ قدیم زمانے ہی سے یہ مسلمان علماء میں ایک اختلافی مسئلہ رہا ہے عام طور پر مسلمان فقیہ تو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہودی اور عیسائی اپنے مذہبی احکام کے مطابق جانوروں کو ذبح کریں تو ان کا گوشت حلال ہے لیکن اس وقت نہیں جب وہ ان احکام کو نظر انداز کر دیں جس طرح اگر ایک مسلمان بھی جانور نہ ذبح کرے تو وہ حرام ہوگا لیکن ایسے کچھ فقیہ بھی گذرے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہودی اور عیسائی میزبان جو پیش کرے وہ مسلمان کے لئے جائز ہے اس سے بحث نہیں کہ انھوں نے کس طرح جانور کو ذبح کیا تھا۔ اس طرح کی رائے فقیہ ابن العربی کی طرف منسوب ہے اور حالیہ زمانے میں اس قسم کا خیال مصر کے محمد عبدہ کا بھی ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ مغربی ممالک میں راسخ العقیدہ یہودی اپنا کیا ہوا ذبیحہ کھاتے ہیں جو کوشر کہلاتا ہے اور وہ کہیں اور سے گوشت نہیں خریدتے ہیں۔

سید احمد خاں ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے تو انھیں ایسی مرغی کا گوشت کھانا پڑا جس کی سرت گردن مروڑ دی گئی تھی اور اس کی اطلاع انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھ بھیجی:

"جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جن سے آپ کو افسوس ہوا اس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔"[1]

" اور خدا تو ان کا بھی خدا ہے جو حلال کی ہوئی مرغی کھاتے ہیں اور ان کا بھی خدا ہے جو گردن مروڑی ہوئی مرغی کھاتے ہیں مجھ مروڑی مرغی کھانے والے کی بھی دعا قبول کر آمین۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حال یہ ہے کہ میں خدا کا اور اس کے رسول کا اور ان کے کلام کا دوست ہوں۔ ملا مولویوں کا دوست نہیں ہوں۔"[2]

خط بنام محسن الملک ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء

یہ خبر راسخ العقیدہ مسلمانوں کو پہنچی تو انھوں نے سید احمد خاں کے بارے میں کہا کہ وہ کرسٹان اور کافر ہو گئے ہیں اور ان کے رسالہ احکام طعام اہل کتاب کی پہلے سے بھی زیادہ مخالفت کی گئی۔

---

[1] سرسید کے خطوط مرتبہ مولوی وحید الدین سلیم۔ اڈیٹر معارف۔ حالی پریس پانی پت ص ۱۹
[2] ایضاً ص ۹۴

تبیین الکلام ۔ فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام

تبیین الکلام انجیل کی تفسیر ۱۸۶۲ء میں سید احمد کے ذاتی مطبع غازی پور سے شایع ہوئی۔ سید احمد خاں نے انجیل کا تحقیقی مطالعہ کیا۔ دوسرے مذاہب کی دینی کتابوں کے اس طرح بغور مشاہدہ اور تجزیہ کی یہ کوشش بہت اہم تھی۔ انھوں نے اردو میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کتاب کی تیاری میں انھوں نے حسب ذیل کتابوں سے مدد لی۔ جن کے حوالے اسی ترتیب سے ملتے ہیں۔

۱۔ انگریزی ترجمہ لاطینی ولگیٹ سے لندن ۱۸۴۳ء

۲۔ انگریزی ترجمہ بائیبل بحکم بادشاہ جیمس۔ لندن

۳۔ عربی ترجمہ بائیبل مطبوعہ سارہ ہوجینس۔ نیو کاسل ۱۸۱۱ء

۴۔ مخطوطہ ترجمہ عربی زبور۔ تفسیر مازنی۔

۵۔ عربی ترجمہ عہد جدید۔ مطبوعہ رچرڈ واٹس۔ لندن ۱۸۴۱ء

۶۔ عربی ترجمہ قلمی چاروں انجیلوں کا۔ مترجم، زمانہ اور مقام کا پتہ نہیں۔

۷۔ فارسی ترجمہ کتب عہد عتیق۔ مترجم ولیم گیلن۔ اڈنبرا ۱۸۴۵ء۔

۸۔ فارسی ترجمہ کتب عہد عتیق۔ مترجم طامس رابنسن۔ آرچ ڈیکن مدراس مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۸ء

۹۔ فارسی ترجمہ کتب خمسہ موسیٰ۔ مترجم طامس رابنسن۔ کلکتہ ۱۸۲۳ء

۱۰۔ فارسی ترجمہ زبور۔ مترجم۔ رچرڈ واٹس۔ لندن ۱۸۳۵ء

۱۱۔ فارسی ترجمہ زبور۔ مترجم طامس رابنسن۔ کلکتہ ۱۸۳۵ء

۱۲۔ فارسی ترجمہ عہد جدید۔ مترجم ہنری مارٹن۔ کلکتہ ۱۸۳۰ء

۱۳۔ فارسی ترجمہ۔ عہد جدید۔ ہنری مارٹن۔ کلکتہ ۱۸۴۲ء

۱۴۔ اردو ترجمہ بائیبل۔ رومن رسم الخط۔ مطبوعہ ولیم کلوس اینڈ سنز۔ لندن ۱۸۶۲ء

۱۵۔ اردو ترجمہ عہد عتیق۔ کلکتہ ۱۸۴۳-۱۸۴۲ء

۱۶۔ اردو ترجمہ بائیبل۔ رومن رسم الخط۔ ترجمہ ماتھر سپرنٹنڈنٹ۔ آرفن اسکول پریس مرزاپور ۱۸۴۵ء

۱۷۔ اردو ترجمہ عہد جدید۔ مترجم ہنری مارٹن۔ لندن ۱۸۱۹ء

۱۸۔ اردو ترجمہ عہد جدید مترجم۔ کلکتہ۔ بپٹسٹ مشنریز۔ کلکتہ ۱۸۳۹ء

۱۹۔ اردو ترجمہ عہد جدید مترجم۔ کلکتہ بپٹسٹ مشنریز۔ کلکتہ ۱۸۴۴ء

۲۰۔ اردو ترجمہ عہد جدید۔ لندن ۱۸۶۰ء

اگرچہ سید احمد خاں نے بیان نہیں کیا لیکن ان کے پاس ایک عبرانی بائیبل بھی تھی کیونکہ اپنی تفسیر میں وہ پہلے عبرانی متن دیتے ہیں پھر اس کے اردو انگریزی ترجمے۔ اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کا معیار علم اتنا بلند تھا کہ ان میں عربی فارسی ہی نہیں بلکہ عبرانی، انگریزی اور لاطینی کے ماہرین موجود تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اور کتابوں کا انھوں نے اپنی تفسیر میں بار بار حوالہ دیا ہے۔

ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

ہارن۔ انٹروڈکشن علوم بائیبل۔ لندن ۱۸۲۵ء۔ چار جلدیں۔

لارڈنر کے ورکس۔ لندن۔ ۱۸۲۹ء۔ چار جلدیں۔

ریوینڈ ڈائیلی اور رچرڈ مانٹ کی تفسیر بائیبل۔ لندن ۱۸۵۶ء۔ دو جلدیں۔

ریوینڈ مفورڈ۔ بائیبل تفسیر۔ لندن ۱۸۴۳ء۔

ولیم میور۔ اردو میں تاریخ کلیسا ۱۸۴۸ء

موشیم۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی مذہبی تاریخ لندن ۱۸۶۰ء

تبیین الکلام میں اردو متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی شامل کتاب ہے۔ اس سے سید احمد خاں کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ انگریزوں میں اسلام کی اشاعت کی جائے اور ہندوستانیوں کو دونوں مذاہب کے مشترک اصولوں سے واقف کرایا جائے۔ یہ ترجمہ کس نے کیا؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ترجمہ لفظی نہیں بلکہ بعض جگہ تو اصل کے مطابق بھی نہیں مثلاً جلد دوم کے

نے صفحہ ۹۴ پر اردو سطر اوّل میں "حضرت موسیٰ" ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ (INSPIRED WRITER) ہے۔ اس جلد کے صفحہ ۵۰ کی پہلی سطر میں "سب ترجموں" کو انگریزی میں (SOME WRITERS) لکھا گیا ہے۔ کتاب کی تصحیح زیادہ اطمینان بخش نہیں حتیٰ کہ کتاب کا نام بھی غلط چھپ گیا ہے یعنی تبئین الکلام جبکہ صحیح "تبیین الکلام" ہے (ہمزہ سے نہیں بلکہ ي کے ساتھ)۔

قرآن مجید چودہ سو سال قبل نازل ہوا۔ اور زیادہ معین طور پر ۶۱۰ء تا ۶۳۲ء کے مابین، اور جستہ جستہ اس میں متعدد مقامات پر بائیبل کے بیانات کی تردید ملتی ہے۔ اس لیے یہ ناگزیر تھا کہ نزول کی ابتدا ہی سے فریق ثانی کی طرف سے اعتراضات کیے جائیں۔ مسلمان اہل قلم خاص طور پر یہودی اور عیسائی نو مسلموں کو اس "علمی بحث و مباحثہ" میں حصہ لینا پڑا۔

بائیبل کے مکمل اور نامکمل ترجمے شروع ہی سے مسلمانوں نے عربی میں کیے اور اہل ایران کے اسلام قبول کر لینے کے بعد فارسی زبان میں بھی ترجمے ہوئے۔ قدیم ترین عربی ترجمہ جس کا پتہ چلتا ہے وہ رسول اللہ کی زوجہ حضرت خدیجہ بنت خویلد بن اسد کے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد کی طرف منسوب ہے جس کا ظہور اسلام سے قبل شہر مکہ میں ترجمہ ہوا تھا۔ اس کے بعد بائیبل کے اقتباسات ابن اسحاق، ابن قتیبہ اور عہد عباسی کی دیگر تالیفات میں محفوظ ہیں۔ البقاعی (متوفی ۸۸۵ھ / ۱۴۸۰ء) نے مشہور تفسیر قرآن "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" میں (جو آجکل دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن میں بھی چھپ رہی ہے) بائیبل کے بکثرت طویل اقتباسات دیے ہیں۔ بائیبل کے ترجمے پرانے زمانے میں ضرور ہوئے مگر ایسا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا جس کو بائیبل کی مکمل اور باقاعدہ تفسیر لکھنے کی کوشش کہا جائے۔ سید احمد خاں سے قبل مسلمانوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ جب مغلیہ سلطنت کا انگریزوں کے ہاتھوں سقوط ہوا اور ملک میں مختلف عیسائی فرقے کے مشنریوں کا سیلاب سا آ گیا تو مذہبی مناظرے ناگزیر بن گئے۔ سید احمد خاں جیسے قائد کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس سلسلے میں جو ہو سکتا تھا کریں۔ غالباً ان کو یہ خوش فہمی تھی کہ عیسائی اپنے دین سے وابستہ صرف اس لیے ہیں کہ وہ عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ ۱۸۵۴ء میں جب آگرے میں پادری فنڈر (PFANDER) اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے مابین عام مشہور عالم مناظرہ ہوا تو سید احمد خاں کو خیال آیا کہ وہ یہ کام اوروں سے بہتر کر سکتے ہیں۔

اسی لیے زیرِ نظر کتاب کی تالیف شروع کی جو دو جلدوں میں شایع ہوئی۔

شروع میں (بطور ماٹو) سورۂ آل عمران کی آیت (۳/۸۴) اور اس کے نیچے اس کا انگریزی ترجمہ درج ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ہم مسلمان صرف اپنے نبی ہی نہیں بلکہ سارے انبیاءؑ پر نازل شدہ کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور ہم نبیوں میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے۔ کتاب کی پہلی جلد زیادہ تر عام مباحث پر مشتمل ہے مثلاً ان میں توریت کی تاریخ کے علاوہ انجیل پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں دس مقدمات اور دو تتمے ہیں مثلاً:

۱۔ انسان کی نجات کے لیے نبیوں کا آنا ضروری ہے؟

۲۔ وحی اور کلام الٰہی کیا ہے؟

۳۔ توریت اور صحیفہ انبیاء اور زبور اور انجیل جس کا نام قرآن مجید میں آیا ہے وہ کونسی کتابیں ہیں؟

۴۔ توریت اور زبور اور صحف انبیاء اور انجیل پر مسلمان کا کیا اعتقاد ہے؟

۵۔ یہ کتنی کتابیں تھیں؟ کیا سب بائیبل میں شامل ہیں؟

۶۔ اس بات کو معلوم کرنے کا کہ ان کتابوں میں سے کونسی کتابیں معتبر ہیں؟ مسلمانوں کے مذہب میں کیا قاعدہ ہے؟

۷۔ مسلمانوں کے مذہب میں کتب مقدسہ کی تحریف کا کیا مسئلہ ہے؟

۸۔ کیا یہ کتابیں بالکل ان اصلی نسخوں کے مطابق ہیں جن کو الہامی لکھنے والوں نے لکھا ہے؟

۹۔ ان کتابوں کے ترجموں کی نسبت مسلمانوں کا کیا اعتقاد ہے؟

۱۰۔ مسلمانوں کے مذہب میں ناسخ و منسوخ کیا ہے؟

پہلا تتمہ ہولی بائیبل کے تاریخی واقعات کے بیان میں؛ دوسرا تتمہ، ہجری اور عیسوی سنہ کی مطابقت میں ہے۔

ان مقدموں اور تتموں کے بعد توریت کا ترجمہ اور شرح شروع ہوتی ہے۔

پہلا مقدمہ: پہلا مقدمہ پانچ صفحوں پر مشتمل صرف اردو میں ہے۔ اس کا

انگریزی ترجمہ نہیں کیا گیا۔ باقی مقدموں کے ہر صفحہ میں دو کالم ہیں۔ ایک میں اردو دوسرے میں اس کا انگریزی ترجمہ ہے جس مسئلہ سے مقدمہ اول میں بحث کی گئی ہے وہ یہ کہ ہر انسان کو اپنے خالق پر ایمان لانا ضروری ہے۔ وہ ہمیں نظر نہیں آتا اور محض انسانی عقل ان چیزوں کو معلوم کرنے سے عاجز ہے جو غیر مرئی اور انسانی حواس خمسہ سے ماوراء ہیں۔ صرف خدا ہی ہمیں ان چیزوں کی اطلاع دیتا ہے اور اُس نے اپنی لا متناہی رحمت سے اُسے یوں حل کیا کہ انسانوں سے چند اشخاص کو مختلف زمانوں میں چُنا اور ان کو وحی اور الہام کے ذریعے پیغام بھیجے جن کو وہ عام انسانوں تک پہنچا سکیں۔

دوسرا مقدمہ: یہ دو زبانوں میں ہے اور اللہ کے کلام کے وحی کیے جانے کے متعلق ہے اور صفحہ ۷ تا ۱۹ پر مشتمل ہے۔ اس میں وحی، تحدیث، الہام، مشاہدات اور مکاشفات جیسی اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے پہلے وحی کی چھ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) جو انسان (یعنی پیغمبر) براہِ راست خدا سے سنتا ہے (۲) ایک فرشتہ خدا کا پیغام لاتا ہے۔ (۳) فرشتہ کسی انسان کی صورت میں آکر پیغمبر سے گفتگو کرتا ہے۔ (۴) کسی نظر نہ آنے والے شخص کی محض آواز سنائی دیتی ہے (۵) پیغام کا پیغمبر کے دل پر القاء ہوتا ہے۔ (۶) پیغمبر کو پیغام خواب میں ملتا ہے۔ ایسے خواب رویائے صادقہ کہلاتے ہیں۔

ص ۱۱ پر وحی کی پانچویں قسم، تحدیث کے متعلق لکھا ہے کہ اگر پیغمبر کو ہو تو نفث فی الروع کہلاتی ہے۔ عام لوگوں میں سے کسی کو ہو تو اسے سکینہ کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر وہ سکینہ کی تشریح کے لیے ایک عربی عبارت نقل کرتے ہیں جس کا اردو ترجمہ نامکمل اور جس کا انگریزی ترجمہ ناقص ہے مکمل صحیح ترجمہ یوں ہوگا۔ ہم اسے بعید از امکان نہیں سمجھتے کہ حضرت سکینہ عمر کی زبان سے بولتی ہے۔ (مَا كُنَّا نَبْعُدُ اَنَّ السَّكِيْنَةَ تَنْطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ وَ قَلْبِهٖ) یہ اصل میں ایک بہت پُرانے مسلمان عالم کا بیان ہے کہ حضرت عمر کی لوگوں میں کتنی قدر و منزلت تھی۔

ص ۱۲ ، قرآن کی آیت ۵/۱۱۱ میں خدا فرماتا ہے "جب میں نے (حضرت عیسٰی کے) حواریوں کو وحی کی ۔۔۔۔۔۔ یہاں وحی سے مراد الہام ہے"۔

ساری کتاب میں اکثر انگریزی اور یورپی ناموں میں اردو خط میں اعراب لگانے کے باوجود

غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً ص ۱۳ پر فرانسیسی نام (LAFONT AND BEAUSOBRE) کو بیوسوبر اور لیا فان لکھا ہے۔ جب کہ صحیح تلفظ بوسوبر اور لافون ہے۔

ص ۱۴ پر لکھا ہے کہ "وہ وحی کہ جس کے لفظ بھی خدا سے ہی ہوں اور اس وحی کو ہم کہتے ہیں وحی متلو (یعنی جس کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے) اور اس وحی کو جو بطور مضمون القا ہوئی تھی کہتے ہیں وحی غیر متلو یا حدیث۔"

تیسرا مقدمہ: ص ۲۰: یہاں توریت، زبور اور انجیل کا جو ذکر ہے، وہ نام کے ساتھ قرآن میں مذکور ہیں مگر "صحف انبیاء کی اصطلاح قرآن میں نہیں ہے۔ صحف ابراہیم و موسیٰ بے شک مذکور ہیں۔ ایک اور اصطلاح قرآن میں ہے:" ذُبُرالاولین (پرانے لوگوں یعنی انبیاء کی کتابیں) جس کا سید احمد خاں نے ذکر نہیں کیا۔

ص ۲۳: پر وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ توریت، زبور اور انجیل ان کتابوں کے نام ہیں جو بالترتیب حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئیں اور وہ نہ صرف مسلمانوں میں معروف ہیں بلکہ یہ بھی کہ ان سے مراد وہی کتابیں ہیں جو اب یہودیوں اور عیسائیوں میں متداول ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ قرآن اور حدیث کے حوالے دیتے ہیں اور ص ۲۴ تا ۳۰ پر اُس کی سات دلیلیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) صحیح بخاری میں ایک حدیث اسی انجیل کے متعلق ہے جو اسلام سے قبل مکہ معظمہ میں رائج تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہ پر غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی اور حضرت جبرئیل نظر آئے تو اعتکاف کو قبل از وقت ختم کر کے حضور گھر آئے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ کو سارا ماجرا سنایا۔ بی بی خدیجہ نے آپ کو تسلی دی اور کہا کہ میرے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل ان چیزوں کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ ہم کل اُن کے پاس جا کر پوچھیں گے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ ورقہ نے عیسائیت قبول کر لی تھی اور وہ انجیل کو عبرانی میں پڑھا کرتا تھا۔[1] ناظرین کی خاطر اس

---

[1] ہمارے مولف نے صحیح بخاری کی تفصیلات میں سے صرف ایک (۱/۱/۳) کا جزئی اقتباس دیا ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے یعنی ورقہ بن نوفل " لکھتے تھے انجیل کو عبرانی میں جس قدر کہ

واقعہ کو مکمل طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ دوسرے دن رسولِ خدا نے ورقہ بن نوفل سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ غارِ حرا میں ان پر کیا گزری؟ اس نے کہا کہ:

"تم نے جو کچھ بیان کیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ ناموس موسیٰ کی مانند ہے"۔ سید احمد خاں اپنے اقتباس میں یہ جملہ حذف کر دیتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

خدا لکھواتا تھا۔

اِس زمانے میں جو انجیلیں مروّج تھیں اور مختلف راویوں کے بیانات میں باہم کچھ فرق بھی ہے۔ بخاری کی دوسری روایتیں یہ ہیں: بخاری (۶۰/۲۱/۱) میں ہے کہ "ورقہ بن نوفل انجیل کو عربی میں (عبرانی میں نہیں) لکھا کرتے تھے۔ بخاری (۶۵/۹۶/۱) میں ہے:

"وہ عربی خط لکھنا جانتے تھے اور انھوں نے عربی میں انجیل کے وہ حصے لکھے تھے جو اللہ نے چاہا تھا کہ وہ لکھیں: بخاری ۱/۹۱ میں ہے کہ: "وہ عربی خط لکھنا جانتے تھے اور انھوں نے عربی میں انجیل کے وہ حصے لکھے تھے جو اللہ نے چاہا تھا کہ وہ لکھیں۔ ماہرین موضوع کا خیال ہے کہ پرانی عربی میں لفظ "عبرانی سے سریانی مراد ہوتا تھا۔ موجودہ عبرانی (HEBREW) زبان نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں کو عیسائی انجیلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی (بلکہ صرف اپنی توریت سے) جن لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کیا تھا، وہ سریانی بولتے تھے۔ جس کا اپنا ایک مستقل رسم الخط تھا اور عبرانی سے بالکل مختلف تھا۔ ورقہ بن نوفل نے محض سریانی عبارتوں کو عربی رسم الخط میں منتقل نہیں کیا تھا بلکہ عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ چونکہ انھوں نے شام کے ایک سفر کے دوران عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اِس لیے وہاں سریانی زبان بھی سیکھی تاکہ اپنے نئے مذہب کے متعلق مزید تفصیلات معلوم کر سکیں۔ اِس بارے میں مزید معلومات کے لیے دیکھئے پروفیسر حمید اللہ کا انگریزی مضمون "قبل اسلام میں مکے کے دو عیسائی عثمان بن الحویرث اور ورقہ بن نوفل"۔ جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ج ۴/۴ ۱۹۵۵ء، ص ۹۷ تا ۱۰۳۔

اس سے مراد متیٰ کی انجیل ہے جو اصل میں ارامائی زبان میں تالیف ہوئی تھی "توریت" کو سریانی زبان میں "ناموس" کہتے ہیں اور "ناموس موسیٰ" کی اصطلاح کے معنی ہیں حضرت موسیٰ کی توریت۔

(۲) قرآن مجید (۹۳/۳) میں یہودیوں کے بعض مزاعم کی تردید ہے جس کے ذریعہ یہ آیت ہے کہ (اے محمد) "توریت لاؤ اور اُسے پڑھو اگر تم سچے ہو"۔ اِس زمانے میں حضرت موسیٰ کی کتب خمسہ یہودیوں میں مروّج تھیں اور یہ وہی تھیں جو آج بھی بائیبل کے حصۂ عتیق میں موجود ہیں۔

(۳) صحیح بخاری ۶۱/۲۶/۱ اور ۴۹/۵۱/۲ میں یہ قصّہ مروی ہے کہ مدینے کے یہود ایک زنا کا معاملہ لے کر رسول اللہؐ کے پاس آئے اور درخواست کی آپ اِس مقدمہ کا فیصلہ فرمادیں۔ حضور نے پوچھا: اس بارے میں تمھارا اپنا قانون کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ ہم مجرموں کا منہ کالا کر کے تشہیر کرتے ہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا نہیں تم جھوٹ کہتے ہو، توریت لاؤ اور پڑھو"۔ جب وہ توریت کا نسخہ لائے تو ایک نومسلم یہودی حضرت عبداللہ بن سلام کی مدد سے رسول اللہ نے وہ عبارت نکلوائی جس میں زانیوں کو رجیم (سنگسار) کرنے کا حکم ہے۔ پھر اس حکم کی تعمیل کرائی۔ یہ بھی اِسی توریت سے متعلق ہے جو اس زمانے میں مروّج تھی اور وہی اب بھی متداول ہے۔

LEVITICUS (۲۰/۱۰) وغیرہ۔ نیز انجیل یوحنہ (۸/۳-۵)

۴۔ قرآن کی آیت ۵/۴۳ میں ہے: "وہ تجھ سے (اے محمد) کس طرح احکام چاہتے ہیں کیونکہ اُن کے پاس توریت ہے جس میں خدا کا حکم ہے؟ پھر وہ روگردانی کرتے ہیں یہ ایماندار نہیں ہیں"۔ یہ بھی موجودہ توریت ہی سے وارد ہوا ہے۔

۵۔ قرآن مجید میں ایک طویل اور اہم عبارت بائبل کے قصاص سے متعلق ہے۔ جس آیت کا قرآن نے ذکر کیا۔ وہ موجودہ کتاب خروج ۲۱/۲۳ تا ۲۷، لویٹیکس ۲۴/۱۷ تا ۲۴۔ تثنیہ ۲۱/۱۹ متیٰ ۵/۳۸ میں موجود ہے۔

۶۔ قرآن مجید ۵/۴۶ تا ۴۸ میں بھی مروجہ بائبل ہی کی طرف اشارہ ہے اور

اس میں یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ عیسائی انجیل میں مروجہ احکام پر عمل کریں۔ صرف مذہبی معاملات ہی میں نہیں بلکہ عدالتی اور قانونی معاملات میں بھی۔ اِس سے مراد وہی انجیل ہے جو مروّج ہے نہ کہ اصل خدا کی نازل کردہ، اگرچہ سید احمد خاں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن اسلامی قانون کا یہ ایک اہم قاعدہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو چاہیے کہ غیر مسلم رعایا کی روزمرہ زندگی میں مداخلت نہ کریں بلکہ اُن کو اپنی دینی کتاب پر عمل کرنے دیا جائے اور اسلامی قانون اُن کے سر نہ تھوپا جائے۔

۷۔ آیت ۲/۱۱۳ میں بھی مروّجہ بائیبل کا ذکر ہے۔ یعنی یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں کوئی اساس نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کے یہاں کوئی اساس نہیں حالاں کہ یہ دونوں کتاب بائیبل پڑھتے ہیں ۔۔۔۔"

یہ سات دلیلیں دے کر سید احمد خاں ناواقف مسلمانوں کی اِس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ بائیبل کے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کو قرآنِ مجید تسلیم نہیں کرتا۔ یہ کتاب رسول اللہ کے زمانے کے بعد سے بدلی نہیں گئی ہے۔ اگر اُن میں کوئی جزئی نقص ہے تو وہ آغازِ اسلام کے وقت بھی موجود تھا اور اس کے باوجود قرآن ان کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر ہمارے مصنف نے یہ اضافہ کیا ہے کہ مسلمان قرآن اور حدیث میں بھی خلط ملط نہیں کرتے صحابہ کے اقوال تو در کنار۔ اگر حضرت عیسٰی کچھ فرماتے ہیں تو وہ الہامِ ربانی پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اگر اُن کے حواری کچھ کہتے ہیں تو اُسے وہی مرتبۂ معصومیت حاصل نہیں ہوگا۔ پھر سید احمد خاں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر حضرت عیسٰی اور اُن کے حواریوں کے بیانات میں کچھ اختلاف ہو اور ان میں تطابق کی کوئی صورت نہ نکلے تو ہم حضرت عیسٰی کے قول کو ترجیح دیں گے۔

چوتھا مقدمہ: ص ۳۲ تا ۳۸ ؛ قرآن مجید ۲/۸۷، ۳/۳، ۴/۶۵، ۳/۸۴، ۴، ۱۶۳۔ ایک درجن سے زائد آیتوں کے مطابق خدا ہی نے پیغمبروں کو وحی کے ذریعے سے "کتاب" دی جس میں ہدایت اور انسانی طرزِ عمل کے صحیح طریقوں کا ذکر ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ ان کتابوں پر اللہ کے کلام اور اللہ کے احکام کے طور پر

ایمان لائیں ۔آیت ۲/ ۱۳۶ اِس سلسلہ میں بہت اہم ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کے " امنت " (یعنی عقائد) کے الفاظ بتائے گئے ہیں اور سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان توریت، زبور، انجیل اور دیگر انبیاء کی کتابوں مثلاً صحف ابراہیم پر اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے طور پر ایمان رکھتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں ایسی " دینی " کتابیں بھی ہیں جو انسانوں کی لکھی ہوئی ہیں اور خدا کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں ۔اِس لیئے مسلمان خدائی اور انسانی چیزوں میں فرق کرتے ہیں ۔ اگرچہ سرسید نے سکوت برتا ہے لیکن اس اہم چیز کا بھی ذکر کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کے اصول فقہ کی ہر کتاب میں اسلامی قانون کے ماخذوں کی بحث میں صراحت سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس پر مشتمل ہیں بلکہ اُن میں " شرائع مَن قبلنا " (اسلام سے پہلے کے انبیاء کی شریعتیں) بھی داخل ہیں اور یہ کہ بائبل کے کونسے حصے صحیح ہیں اِن پر طویل بحث ہوتی ہے ۔

پانچواں مقدمہ : ص ۳۹ : اِس باب میں اس بات پر تفصیلی بحث ہے کہ بائبل کے مندرجات کیا ہیں ؟ اور اس میں کون کونسی کتابیں شامل ہیں؟ جو کتابیں حضرت عیسٰی کے قبل کے پیغمبروں (یعنی حضرت موسٰی و مابعد) کی طرف منسوب ہیں ان کے مجموعے کو عیسائی مولف عہد عتیق (اولڈ ٹسٹامنٹس) سے موسوم کرتے ہیں ۔سید احمد خاں مروجہ عہدِ عتیق میں مندرج انتالیس کتابوں کے نام گنانے ہیں (اور اُن کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی ہیں مثلاً جوڈتھ، ٹوبت وغیرہ جن کو صرف چند فرقے یا چند مولف عہد عتیق میں داخل کرتے ہیں ۔ دوسرے نہیں ۔

ص ۴۲ تا ۴۳ : سید احمد خاں کثرت سے اُن کتابوں کے نام گناتے ہیں جن کا عہدِ عتیق کی کتابوں کے اندر اشارۃً ذکر آیا ہے لیکن جواب ناپید ہیں ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکمل بائبل ہم تک نہیں پہنچی ہے اور اس بات کی خود مروجہ بائبل شہادت دیتی ہے چونکہ یہ ایک اہم امر ہے اس لیے ہم یہ فہرست یہاں نقل کرتے ہیں ۔

۱۔ عہد نامہ موسٰی کی کتاب (مذکورہ کتاب خروج ۲۴/ ۷)

۲۔ موسٰی کی جنگوں کی کتاب (اعداد ۲۱/ ۱۴)

۳۔ لیشیر (یا نیک لوگوں) کی کتاب (یوشع ۱۰/ ۱۳، سامویل دوم ۱/ ۱۸)

۴۔ یاہو بن حنانی کی کتاب (تواریخ دوم ۲۰/ ۳۴)

۵۔ کتاب شعیاہ نبی۔ (″ ″ ۱۲/ ۱۵)

۶۔ اخیاہ نبی کی کتاب (″ ″ ۹/ ۲۹)

۷۔ کتاب ناتھن نبی۔ (ایضاً)

۸۔ غیب بین عیدو کے مشاہدات کی کتاب (ایضاً)

۹۔ کتاب اعمال سلیمانؑ (اول سلاطین ۱۱/ ۴۱)

۱۰۔ کتاب اشعیاہ بن عاموص (جس میں دیگر بادشاہوں کے حالات بھی ہیں) (دوم تواریخ ۲۶/ ۲۲)

۱۱۔ کتاب مشاہدات اشعیاہ جس میں حزقیاہ بادشاہ کا حال ہے (تواریخ دوم ۳۲/ ۳۲)

۱۲۔ سموئیل نبی کی تاریخ (اوّل تواریخ ۲۹/ ۳۰)

۱۳۔ حضرت سلیمان کی ایک ہزار پانچ زبوریں (اوّل سلاطین ۴/ ۳۲ تا ۳۳)

۱۴۔ حضرت سلیمان کی کتاب خواص نباتات وحیوانات (ایضاً)

۱۵۔ کتاب امثال سلیمان (ایضاً)

۱۶۔ مرثیہ یرمیاہ (تواریخ دوم ۳۵/ ۲۵) جو حضرت یوشع پر ہے۔

یہ فہرست کارآمد تو ہے لیکن مکمل نہیں معلوم ہوتی۔ بہرحال سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ ڈایلی اور مانٹ کے مطابق سولھویں کتاب حضرت یوشع (حضرت موسٰی کے جانشین تھے) نے جو جنگیں لڑیں اور فتوحات حاصل کیں اور حضرت ہرمیا کا سقوط یروشلم پر نوحہ موجود ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ انھوں نے حضرت یوشع کی وفات پر نوحہ لکھا ہو اور جو ایک مستقل چیز نہیں ہے بلکہ نوحۂ یروشلم ہی کا ایک جزو ہے۔

حضرت یوشع کی وفات اور سقوطِ یروشلم کے درمیان ایک طویل زمانہ ہے۔ سید احمد خاں بظاہر اس دلیل کو قبول کرتے ہیں لیکن یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عروج و زوال کا یکجا اس میں ذکر کیا گیا ہوگا کہ ان کے مابین جو فرق ہے وہ زیادہ بہتر طور پر نمایاں کیا جاسکے اور حضرت ہرمیا کا نوحہ وفات حضرت یوشع اور سقوط یروشلم دونوں امور کے متعلق لکھا گیا ہو۔

جو بھی حقیقت حال ہو، صفحہ ۵۴ میں ہمارے مصنف نے کرسیوم کی کتاب ہومیلی کا ایک اقتباس دیا ہے کہ: "پیغمبروں کی بہت سی کتابیں ناپید ہو گئیں۔ اس لیے کہ یہودیوں نے غفلت سے بلکہ بے دینی سے بعض کتابوں کو کھو دیا۔ بعض کو پھاڑ ڈالا اور بعض کو جلا دیا۔"

ص ۴۶ تا ۴۹: بحث کو جاری رکھتے ہوئے سید احمد خاں نے یہودیوں کی اکتیس کتابوں کے نام گنائے ہیں جن کا ذکر تو آتا ہے لیکن جو موجودہ بائبل میں شامل نہیں مثلاً حضرت آدم کے بیٹے حضرت شیث کی ساتویں کتاب، حضرت ادریس کی کتاب، کتاب مشاہدات حضرت ابراہیم، مشاہدات حضرت موسیٰ، خود حضرت عزرا کی کتاب دوم باوجود اس کے کہ وہ یہ پیغمبر ہیں جنھوں نے بخت نصر کے ہاتھوں توریت کے نسخوں کے مکمل تلف ہو جانے کے بعد توریت از سر نو لکھی تھی۔ پھر سید احمد خاں ان نوے (۹۰) کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو جان بوجھ کر عہدِ جدید سے اس لیے خارج کی گئیں کہ وہ ناقابلِ اعتماد تھیں۔ (ص ۴۹ تا ۵۶) ان میں چند انجیلیں بھی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اخراج کی وجہ یہ نہیں کہ مولف ناقابل اعتماد ہیں بلکہ یہ کہ کتاب کے مندرجات میں ایسی چیزیں تھیں جو کلیسا کے قبول کردہ عقاید کے خلاف تھیں۔

سید احمد خاں کے سامنے وہ تالیفات تھیں جو عیسائیوں نے عہدِ عتیق کے متعلق لکھی ہیں اور وہ چند کتابوں کے اخراج کے متعلق کم و بیش ممکنہ دلائل نقل کرتے ہیں لیکن وہ کتابیں نہیں جو خود یہودیوں نے اس موضوع پر لکھی ہیں یہ مسلمان مولفوں کا فریضہ ہے کہ وہ مستقبل میں اس کام کی طرف توجہ کریں۔ ایک چیز اس فہرست میں حیرت انگیز ہے کہ وہ "کتاب جنوک یعنی ادریس" کا ذکر کرتے ہیں اور ہارن کا حوالہ دیتے ہیں۔ حضرت اخنوخ یعنی حضرت ادریس کے اقتباسات عہدِ جدید کی کتاب "جوڈ کا خط" میں ہیں۔ اس کتاب کا اشوبی (حبشی) ترجمہ حال میں بحرِ مردار کے مخطوطوں میں بھی ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ شایع ہو چکا ہے۔

ص ۴۳: سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ چند عیسائی مولف اس بات کو قبول نہیں کرتے کہ چند کتابیں ناپید ہو گئی ہیں اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مقتضیٰ حکمت الٰہی کا یہ نہیں کہ جو کتاب روح القدس کی تائید میں دی تھی اس کو ایسا معدوم کر دے کہ پھر ہاتھ نہ آسکے۔ اگر وہ انسان کی تربیت کے لائق نہ تھیں تو ان کو پہلے ہی کیوں دیا تھا؟ پھر سید احمد خاں (ص ۴۴ پر)

ٹھیک کہتے ہیں کہ اگر خدائی تعلیم کو بھی نہ بدلنا چاہیے تو اولڈ ٹسٹامنٹ کے بعد ہم کو نیو ٹسٹامنٹ کی حاجت کیوں ہوتی ؟ مزید برآں ان کتابوں کا تلف ہو جانا اس لئے ہوا کہ وہ کسی خاص کارنامے کے لیے نہیں تھیں اور ایک جگہ جمع بھی نہ تھیں اور یہودیوں پر پے درپے مصیبتیں بھی آتی رہیں۔

ص ۷۴: سرسید نے ایک عجیب و غریب واقعہ کی طرف توجہ منعطف کی ہے وہ یہ کہ ڈایلی کے مطابق ناپید شدہ کتابوں میں سے ایک یعنی حضرت عذرا کی کتاب دوم چند اطالوی نسخوں نیز عربی ترجمے میں تاحال موجود ہے۔

ص ۴۹، مابعد: ان چار انجیلوں کے سوا جو بائیبل کے عہدِ جدید میں موجود ہیں کئی درجن اور انجیلیں بھی ہیں جن کا ذکر تو آتا ہے لیکن جن کو غیر معتبر سمجھ کر رد کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہورن نے اپنی کتاب میں ۴۴ رد شدہ انجیلوں کا ذکر کیا ہے۔

انجیلوں کے علاوہ حواریوں کے خطوط میں سے تیئیس (۲۳) کو عہدِ جدید میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت مریم کا خط، سینٹ پیٹر اور سینٹ جان کے کئی خط بلکہ خود سینٹ پال، سینٹ ٹامس وغیرہ کے بھی خطوط ہیں۔

ص ۵۶ تا ۵۷: ہورن (ج ۱، ص ۲۴۲) کے حوالے سے سید احمد خاں مندرجہ ذیل آٹھ تحریروں کا ذکر کرتے ہیں، جو حضرت مسیح نے لکھی ہیں۔

۱۔ خط بنام ایبگارس۔
۲۔ خط بنام پال اور پیٹر۔
۳۔ امثال و مواعظ کی کتاب۔
۴۔ مناجاتِ مسیح جو انھوں نے اپنے معتقدین کو سکھائیں۔
۵۔ سحر (جادو) کی کتاب
۶۔ کتاب پیدائش مسیح اور مریم اور عیسیٰ کو کھلانے والی انّا۔
۷۔ خطوط جن کا آسمان سے نزول ہوا۔ شہر ایرا اس کے ایک پادری لیو پاس نامی کے نام۔
۸۔ نامہ حضرت مسیح جو مینی چیس (MANICHEES) نے فراہم کیا۔

پھر وہ صراحت کرتے ہیں کہ جن کتابوں کے ذکر میں حوالہ نہیں دیا گیا ہے وہ کتاب ایکسی ہومو (EXE HOMO) اور ایبوکریفل عہد جدید (مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء) سے ماخوذ ہیں اور (ص ۷۵ پر) یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ ایسی اور بہت سی کتابیں ہونگی جن کو عہد جدید میں شامل نہیں کیا گیا ہے اور جن کی ہمیں اطلاع نہیں ہے۔

چھٹا مقدمہ: اس بارے میں ہے کہ یہودی اور نصرانی کتابوں کے متعلق مسلمانوں کا کیا خیال ہے؛ چنانچہ (ص ۸۵ و مابعد میں) سید احمد خاں نے اولاً اس طریقے کی تشریح کی جو مسلمان خود اپنی کتابوں کی صحت کی جانچ کے لیے برتتے ہیں کہ کتاب کو مولف کے سامنے پڑھنا چاہیے اور اگر اس کی وفات ہو چکی ہو تو اس شخص کے سامنے جس نے مولف سے اس کو پڑھا ہو اور یہ طریقہ نسل بعد نسل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ قرآن کے متعلق بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے اور اپنی سند قرآت مکمل طور پر نقل کرتے ہیں اگرچہ وہ اس فہرست کی ابتداء خود اپنے نام سے نہیں کرتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ انھیں کے نام سے اس فہرست کا آغاز ہونا چاہیے۔ اس کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سید احمد خاں
۲۔ مولوی محمد مخصوص اللہ سے اور وہ:
۳۔ شاہ عبدالعزیز سے، اور وہ اپنے والد:
۴۔ شاہ ولی اللہ سے، اور وہ
۵۔ حاجی محمد فاضل السندی سے، اور وہ:
۶۔ شیخ عبدالخالق التوفی سے، اور وہ:
۷۔ شیخ البصری سے، اور وہ:
۸۔ شیخ عبدالرحمٰن الیمنی سے، اور وہ:
۹۔ شیخ سجاد سے، اور وہ:
۱۰۔ شیخ ابوالنصر السلسلاوی (؟) سے، اور وہ:
۱۱۔ شیخ الاسلام ذکریا سے اور وہ:

۱۲۔ شیخ برہان العلقیلی (؟) سے اور وہ:

۱۳۔ امام محمد الجزوی سے اور وہ:

۱۴۔ امام احمد بن الشیخ الامام سے، اور وہ:

۱۵۔ امام ابوعبداللہ الحسین سے، اور وہ:

۱۶۔ ابومحمد قاسم سے، اور وہ:

۱۷۔ شیخ ابوالعباس احمد سے، اور وہ:

۱۸۔ ابوداؤد سلیمان سے اور وہ:

۱۹۔ ابوعمرو الاوانی سے، اور وہ:

۲۰۔ ابوالحسن الطاہر سے، اور وہ:

۲۱۔ شیخ علی بن محمد سے، اور وہ:

۲۲۔ ابوالعباس احمد بن سہیل الاستانی سے، اور وہ:

۲۳۔ ابومحمد عبید بن الصباح سے، اور وہ:

۲۴۔ امام حفص سے، اور وہ:

۲۵۔ امام عاصم سے، اور وہ:

۲۶۔ حضرت عثمان بن عفانؓ سے، اور وہ:

۲۷۔ حضرت رسول خدا سے۔

کتاب ہذا سے یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کی کوئی ایک کتاب بھی اس طرح کے استادِ بہ استاد سلسلے سے جو مصنف تک جاتا ہے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ جہاں تک یہودیوں اور نصرانیوں کی کتابوں کا تعلق ہے وہ چار قسم کی ہیں:

۱۔ جن کو ہمیشہ اور متفقہ طور پر قبولیت حاصل رہی ہے۔

۲۔ جن کو اکثریت نے قبول کیا یا بعد کے زمانے میں قبول کیا گیا۔

۳۔ جن کو قابل اعتماد مولفوں نے لکھا مگر جن کا عام رواج نہ ہوا۔

۴۔ جو قدیم زمانے میں غیر معروف تھیں اور بعد میں مشہور ہوئیں۔

اور وہ آخر میں لکھتے ہیں کہ ہمارا حکم کتاب کے مندرجات پر مبنی ہوگا۔
اور اس پر نہیں کہ اُسے خود عیسائی قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

ساتواں مقدمہ: مسلمانوں کے مذہب میں کتب مقدسہ میں تحریف کا کیا مسئلہ ہے؟

اس پر بحث کرتے ہوئے (ص ۶۴ پر) سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ اصطلاحوں کے لغوی اور فنی معنوں میں کچھ فرق ہے۔ "تحریف" سے مراد مسلمانوں کے نزدیک محض معنی میں ردوبدل ہے نہ کہ الفاظ کا۔ پھر وہ اس کی اقسام بیان کرتے ہیں کہ:

۱۔ جان بوجھ کر کی گئی ہو، یا
۲۔ بالقصد اور ارادتاً کی گئی ہو،
۳۔ اور اصلی مراد سے اُس طرف پھیرنا جو مقصود نہیں ہے۔ اور یہ آخر الذکر کئی طرح سے ہو سکتا ہے (ص ۶۶)

(الف) کسی لفظ کو اصل عبارت میں اپنی طرف سے بڑھائیں۔
(ب) کوئی لفظ یا عبارت حذف کریں۔
(ج) اصل کے کسی لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے بدل دیں۔
(د) الفاظ تو نہ بدلیں لیکن پڑھ کر سناتے وقت کوئی اور عبارت سنائیں جو اصل میں نہیں ہے۔
(ہ) اصل کے بعض الفاظ چھپائیں۔
(و) من گھڑت احکام لوگوں کو بتائیں اور کہیں کہ حکم الٰہی یوں ہی ہے۔
(ز) الفاظ مشترک المعنی کے وہ معنی بتائیں جو مقصود نہیں۔
(ح) غیر واضح اور مبہم الفاظ کی غلط تاویل بیان کریں۔

سید احمد کا اپنا خیال ہے کہ پہلی تین قسم کی تحریفوں کا کتب مقدسہ میں ہونا ثابت نہیں ہے اگرچہ بعض قدیم مسلمان مولف اس کے قائل رہے ہیں لیکن وہ آگے چل کر اپنے خیال میں خود ہی کسی قدر ترمیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہود تک نے ایسا کیا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ سامریہ فرقے کے یہودیوں نے کتاب تثنیہ (۲۷/۴) میں جبل گرزیم کو بدل کر جبل ایبال لکھ

دیا ہے انجیل مرقس (۱۳/۳۲) میں بعض عیسائی چند الفاظ حذف کر دیتے ہیں جو آریوس کے عقیدۂ توحید کی تائید کرتے ہیں۔ اِس طرح انجیل لوقا (۱/۳۵) میں وہ چند الفاظ بڑھا دیتے ہیں تاکہ حضرت عیسٰی کی الوہیت کے متعلق کوئی شبہ نہ رہنے پائے! انجیل متّی (۱/۲۵) سے وہ لفظ "پہلوٹا" (فرزند اوّل) حذف کر دیتے ہیں تاکہ یہ ثابت کریں کہ حضرت مریم تاحیات باکرہ رہیں۔ پھر سیّد احمد خاں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ چند افراد کے کرتوت کو سب لوگوں کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا اور وہ (ص ۶۹ تا ۷۰پر) امام بخاری کا ایک قول اپنی تائید میں نقل کرتے ہیں کہ جس تحریف کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہاں کتاب مقدسہ میں واقعتہً وہ الفاظ نہیں بدلتے بلکہ ایسی تاویل کرتے ہیں جو صحیح تاویل کے خلاف ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ابن تیمیہ امام رازی اور شاہ ولی اللہ کی بھی یہی رائے ہے[1]

ص ۹۲ تا ۹۵: سیّد احمد خاں نے موئیم اور ولیم میور کی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں

---

[1] لیکن بائیل میں ایسے جملے بھی ہیں جن کی اِس آسانی سے توجیہ نہیں ہو پاتی مثلاً کتاب تثنیہ حضرت موسٰی کی طرف منسوب ہے، اس کے باوجود اُس کی فصل ۳۴ پوری کی پوری حضرت موسٰی کی وفات، تدفین، تیس دن کے سوگ اور حضرت یوشع کے جانشین بننے کے متعلق ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بعد کا الحاق ہے حضرت موسٰی کا اپنا لکھا ہوا نہیں الفاظ کی تبدیلی کی ایک اور مثال کتاب پیدائش (۲۱/ ۱۴) میں ہے: اصل عبرانی متن میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے اسماعیل کو، جن کی عمر اُس وقت چودہ سال کی تھی اُس کی ماں حضرت ہاجرہ کے کندھے پر بٹھایا اور بی بی کے ہاتھ میں پانی کی چھاگل دی اور حکم دیا کہ وہ گھر سے رخصت ہو جائے۔ اس کو بدل کر ترجموں میں لکھا جاتا ہے کہ چھاگل کندھے پر رکھی اور بیٹے اسماعیل کو بی بی کے ہاتھ میں دیا اور حکم دیا کہ گھر سے چلی جا اور سرسید ایک جگہ تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل بہت دُبلے پتلے تھے۔

یہ عیسائی مصنف اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات عیسائیوں نے غلط چیزیں لکھیں۔ لیکن اُن کو بائیبل میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ ایک بُری بات ہے لیکن اس سے بائیبل کی تحریف ثابت نہیں ہوتی۔

آٹھواں مقدمہ : بائیبل کے مخطوطات کا صحیح اور درست ہونے سے بحث کی ہے اِس طویل باب میں (جو ص ۹۶ سے ص ۱۹۵ تک پھیلا ہے) بائیبل کی حیرت انگیز سرگزشت کا ذکر ہے۔ مخطوطات متعدد ہیں لیکن باہم اختلافات سے لبریز۔ قدیم ترین عبرانی مخطوطہ جو گیارہویں صدی عیسوی کا ہے بظاہر قدیم ترین ہے لیکن یہ اصل توریت کے ڈھائی ہزار سال بعد لکھا گیا ہے: سرسید (ص ۱۰۹ تا ۱۱۰ پر) لکھتے ہیں کہ کینی کوٹ (KENNICOTT) کے مطابق: "عہد عتیق کے عبری تمام قلمی نسخے جن کا موجود ہونا اب ہم کو معلوم ہے (وہ سنہ عیسوی کے) ایک ہزار اور ایک ہزار چار سو ستاون برسوں کے درمیان لکھے گئے تھے۔۔۔۔ کہ تمام قلمی نسخے جو سات سو یا آٹھ سو برس بیشتر کے لکھے ہوئے تھے۔ یہودیوں کی سینٹ یعنی مجلس امراء کے بعض حکموں کے بموجب معدوم کر دیے گئے تھے۔ اِس سبب سے کہ ان نسخوں میں سے جو اس وقت میں خالص گنے جاتے تھے بہت اختلاف تھا۔ اِس بات کو (پڑھئے بات کی) بشپ والٹن صاحب بھی تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس سبب سے ہمارے پاس چھ سو برس کے نسخے چند ہیں اور اس وجہ سے سات سو یا آٹھ سو برس کے نسخے بہت کمیاب ہیں۔"

ص ۱۱۰ : ڈاکٹر بوخانن (BUCHANAN) کو ۱۸۰۶ء میں توریت کا ایک عبرانی مخطوطہ "مالابار" کے کالے یہودیوں سے دستیاب ہوا۔" ممکن ہے اِسے وہ یہودی اپنے ساتھ لائے ہوں جو بخت نصر کے حملے کے باعث بھاگ کر ہندوستان آئے تھے۔

انجیل کی سرگزشت اِس معاملہ میں توریت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ حضرت عیسٰی نے کوئی متنِ املاء نہیں کیا تھا۔ اُن کے آسمان پر جانے کے بہت عرصہ بعد اُن کے حواریوں اور اُن کے بعد آنے والے متبعین نے ان معلومات کو قلمبند کرنا شروع کیا جو حضرت عیسٰی کے حالات کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں رہ گئی تھیں

اور انھوں نے اسے انجیل (یعنی بشارت یا خوشخبری) کا نام دیا۔ ایسی ستر انجیلوں یا سوانح عمریوں کا پتہ چلا ہے۔ اِن میں سے صرف چار کو کلیسا نے قبول کر کے عہدِ جدید میں شامل کیا اور درجن اور رسالے بھی ہیں جو بائیبل کے حصّہ جدید میں موجود ہیں لیکن ان کو انجیل کا نام نہیں دیا جاتا بلکہ مختلف مقدس آدمیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

ص ۱۱۱ : یہ معلوم ہے کہ سینٹ ماتھیو (متّی) کی انجیل ابتداً عبرانی زبان میں تالیف ہوئی تھی مگر وہ بہت عرصے سے ناپید ہے۔ متّی اور دیگر لوگوں کی جو انجیلیں عہد جدید میں شامل کی گئی ہیں اُن کا قدیم ترین متن یونانی میں ہے اور اس سے دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے، اور ان یونانی کتابوں کے قلمی نسخے اختلافات روایات سے بھرے ہوئے ہیں۔ سرسید کو شاید معلوم نہ تھا کہ ان کے زمانے میں عیسائی اہلِ دین نے انجیلوں کے سارے یونانی نسخے جمع کیے تھے۔ اس بارے میں روبیر (ROBERT) اور فوییے (FEUILLET) نے مشترکہ طور پر ایک فرانسیسی کتاب لکھی ہے۔" (INTRODUCTION DE LA BIBLE) "

(بایبل کا تعارف) اس کے طبع دوم کی جلد اول کے صفحہ (۱۱۱) میں لکھا ہے کہ: انجیل کے سارے یونانی مخطوطے جمع کیے گئے ہیں، مکمل بھی، نا مکمل بھی، بڑے حرفوں میں لکھے ہوئے اور چھوٹی شکلوں کے حروف میں لکھے ہوئے بھی۔ ان اقتباسات انجیل کے نسخے جو کلیسا میں عبادت کے وقت پڑھے جاتے ہیں، وہ بھی جو نیری (پاپی رس) پر تھے یا ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے تھے۔ وہ عبارتیں بھی جو (تعویذ اور) طلسمات کے طور پر استعمال کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اس طرح اختلافی متنوں کے نسخے بھی، بائبل کے وہ اقتباس بھی جو قدیم مولفوں کی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں اور خود ان کتابوں کی صحت کی بھی تحقیق کرنی تھی ......

غرض مواد کے اِس عظیم الشان ذخیرے سے کوئی دو لاکھ اختلافات روایات جمع ہوئے ....

ولبیسٹ کاٹ اور ہارٹ جو یہ تعداد نقل کرتے ہیں یہ بھی بیان کرتے ہیں۔

کہ موجودہ انجیلوں کے متن کا ۷/۸ حصہ تو درست پایا گیا ہے لیکن اختلافات کا ۱/۸ حصہ (یعنی پچیس ہزار (اختلافات) اہم ہیں۔

سید احمد خاں بڑی محنت سے تلاش کر کے عیسائی انگریز مولفوں کی تحقیقات

کے نتائج کا خلاصہ دیتے ہیں کہ بائبل کے قدیم ترین مخطوطوں میں کیا خامیاں ہیں اور (ص ۱۴۷ پر) وہ ہورن (ج ۲، ص ۱۷۱) کا اقتباس دیتے ہیں کہ "اکثر اصلی یا خالص عبارت کو دروغ آمیز عبارت سے تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے"۔ وہ تفصیل سے بحث کرتے ہیں کہ کن کن اسباب کی بنا پر غلطیاں انجیلوں میں اُس وقت پیدا ہو گئے جب کہ ابھی طباعت کا آغاز نہیں ہوا تھا پھر وہ (ص ۹۴ تا ۱۵۰ پر) لکھتے ہیں کہ بائبل میں عبارتوں کی تصحیح تو کی گئی ہے مگر ان وجوہات سے ہم مسلمان نتیجہ نکالتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اب بھی کتاب ہائے اقدس میں ایسے مقامات ہوں جو اصل نسخوں سے جن کو الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے (ص ۱۵۰ پر) لکھتے ہیں "ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم تمام بیبل پر اس بات کا شبہ رکھتے ہیں کہ وہ اصل نسخوں سے جن کو الہامی کہنے والوں نے لکھا تھا مطابقت نہیں رکھتی بلکہ ہم یقین کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکا یہ کتابیں نیک نیتی سے اصلی نسخوں سے مطابق کرنے کیلئے صحیح کی گئیں۔ الاّ چند مقام اب بھی ایسے ہیں جو بلا شبہ اصل نسخوں کے مطابق نہیں ہوئے اور بعض ایسے ہیں جو اب تک مشتبہ ہیں۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس باب میں ہم مسلمانوں اور عیسائیوں میں کچھ اختلاف نہیں ہے"۔ (سید احمد خاں کے اردو اور انگریزی متنوں میں کافی اختلاف ہے)

پھر وہ لکھتے ہیں کہ "اب ہم یہ بیان کریں گے کہ مماثل صورتوں میں مسلمانوں کے یہاں صحیح اور غلط عبارتوں میں کس طرح امتیاز کیا جاتا ہے۔

۱۔ یہ تلاش کہ روایت کا صحیح لفظ کیا تھا؟

۲۔ استعمال شدہ لفظ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

پھر کہتے ہیں کہ اسلامی طریقۂ کار عیسائی طریقۂ کار سے مختلف ہو سکتا ہے کیونکہ عیسائی ضرورت کے تحت اس روایت کو ترجیح دیتے ہیں جس کے الفاظ اُن کے فرقے کے عقائد کی تائید کرتے ہوں۔ اُس کے برخلاف مسلمان صرف متلاشی حقیقت ہوتے ہیں۔ مزید برآں ہم کسی عبارت کو ترجیح دینے کے لیے اس چیز کو پیشِ نظر رکھیں گے جو مکمل بائبل کی عام تعلیم کے مطابق ہو اور ایسا بھی نہ ہو کہ بائبل کے ایک مقام کی عبارت دوسرے مقام کی عبارت کے خلاف ہو جائے اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو ہم یہ کہیں گے کہ عبارت مبہم ہے۔

چونکہ سید احمد خاں بائبل کی پوری تفسیر ختم نہ کر سکے اس لئے ہمارے لئے یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ ان بیان کردہ طریقوں کا وہ معین مقامات پر کس طرح اطلاق کرتے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل دو عبارتیں ہیں جو متضاد نظر آتی ہیں۔

"بدی کی مقاومت نہ کر، اس کی جگہ جو شخص تیرے دائیں رخسار پر طمانچہ لگائے تو اس کی طرف اپنا دوسرا رخسار بھی پھیر دے"۔ (متی ۵/۳۹) اور اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ ان لوگوں پر برکت بھیجو جو تمہیں گالی دیں اور تاکہ تم اُس باپ کے بچے بنو جو آسمان ہے (متی ۵/۴۴ تا ۵۵)

میرے اُن دشمنوں کو جو نہیں چاہتے تھے کہ میں اُن پر حکومت کروں یہاں لاؤ اور میرے سامنے اُن کو ذبح کرو (لوقا ۱۹/۲۷) اور یہ "یہ نہ خیال کرو کہ میں اِس لئے آیا ہوں کہ ایک شخص کو اُس کے باپ کے خلاف کرنے کے لئے ایک لڑکی کو اس کی ماں کے خلاف کرنے کے لئے ایک بہو کو اسکی ساس کے خلاف کرنے کیلئے (متی ۲۴/ تا ۲۵)

پھر سر سید یہ بھی لکھتے ہیں کہ جہاں تک اُن مشکلات کا تعلق ہے جو تاریخی معلومات کے متعلق ہیں عقاید اور مذہبی تعلیم کے متعلق نہیں۔ ہم کہیں گے کہ الہامی مولف نے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا تھا بلکہ یہ نقل نویسوں کا قصور ہے۔

ص ۱۵۴: وہ لکھتے ہیں کہ چند عیسائی علماء کا دعویٰ ہے کہ بائبل کے مختلف مخطوطوں میں باہم بہت سے اختلافات ہونے کے باوجود "کوئی بات ایسی نہیں نکلی جو عمدہ (= اہم) عقائد ایمانیہ کے برخلاف ہو"۔ لیکن سید احمد ان عیسائی مولفوں سے اتفاق نہیں کرتے اور بیان کرتے ہیں کہ مثلاً ایبونائٹ فرقے کے لوگ انجیلی مخطوطوں کے باہمی اختلافات ہی کی بنا پر دوسرے فرقوں سے جدا ہوئے ہیں۔

نواں مقدمہ: کا عنوان ہے کہ ان کتابوں کے ترجموں کے متعلق مسلمانوں کا کیا اعتقاد ہے؛ اس طویل باب میں بائبل کے ان ترجموں سے بحث ہے جو مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں۔ (ص ۱۵۶ تا ۲۶۴)

وہ شروع اس بات سے کرتے ہیں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ہمیشہ ایک نازک اور مشکل مسئلہ رہا ہے اور بعض وقت اصل کے الفاظ کئی معنی رکھتے

ہیں اور مترجم اُن میں سے ایک معنی کو ترجیح دیتا ہے یا ایک معنی کو رد کر دیتا ہے۔ جس کا سبب اس کا اپنا فرقہ وارانہ مفاد ہوتا ہے۔ پھر وہ ہورن کی انگریزی کتاب "کتب مقدسہ کے تنقیدی مطالعے کی تمہید" سے اقتباس لے کر مفید معلومات مختلف ترجموں کے متعلق مہیا کرتے ہیں لیکن وہ (ص ۱۵۹ پر) ایک فاش غلطی کرتے ہیں کہ آرامی ترجمے سے مراد ارمنی ترجمہ لیتے ہیں حالانکہ آرامی زبان عبرانی ہی کی ایک شاخ ہے جو حضرت عیسٰی کے زمانے میں بولی جاتی تھی اور وہ حضرت موسیٰ کے زمانے کی عبرانی سے کافی مختلف ہے۔ عہدِ عتیق کی کتابیں پُرانی عبرانی میں تھیں اور جب یہودی بابل میں طویل عرصہ جلاوطن اور قید رہنے کے بعد واپس آئے تو وہ عبرانی سے زیادہ بہتر بابلی (کالڈی) زبان بولتے تھے اور پھر جب پیغمبر حضرت عذرا نے اپنے حافظے سے توریت سنایا جسے بخت نصر نے تلف کر دیا تھا اور اس کی تفسیر لوگوں کو سمجھانے کے لئے بتائی۔ پھر اس کو عبارت میں پڑھایا جانے لگا تو سرسید کا خیال ہے کہ غالباً حضرت عذرا نے اس کی تفسیر کی ہو۔ یہودیوں کے پاس نہ صرف اصل عبرانی توریت میں ہے بلکہ "ترگوم" بھی۔ اس ترگوم کا مادہ وہی ہے جس سے عبرانی لفظ "ترجمہ" بنا ہے مگر عبرانی میں ترگوم سے مراد ترجمہ نہیں ہوتا بلکہ شرح اور تفسیر کرنی ہے کالڈی زبان میں دس ترگوم پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض قدیم ہیں اور بعض اتنے جدید کہ اُن کی تالیف ۱۶۹۰ء میں ہوئی۔ بائبل کا مطلب سمجھنے کے لئے اصل کے ترجمے سے زیادہ ترگوم یعنی شرح کو قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بعض ترگوم بہتر ہیں اور بعض کمزور۔ سید احمد خاں ایسی دس تالیفوں کی تفصیل دیتے ہیں۔

ص ۱۶۳: جب یہودی بابل کی قید سے چھوٹے تو اُن میں سے بعض اسکندریہ میں جا بسے جو اُس وقت رومی علداری میں تھا۔ اُن کے علماء نے اس وقت بائبل کے حصہ عہدِ عتیق کا یونانی ترجمہ کیا تھا اور اُسے "سپٹوا جنٹ" کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ اُس کا ستّر آدمیوں نے مل کر ترجمہ کیا تھا (سپٹوا جنٹ ایک لاطینی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "ستر") سرسید کے بیان کے مطابق وہ ۲۸۵ء تا ۲۸۶ء قبل مسیح میں مکمل ہوا۔ یہ عبرانی اصل سے ہو بہو مطابق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بائبل کے چھ دیگر یونانی ترجمے بھی ہیں جن میں سے ایک کو (جو ایکوئیلا (اکویلیاس) نے کیا) ترجمۂ لفظی سمجھا جاتا ہے اوریجین نامی شخص نے ۲۳۱ء تا ۲۵۹ء بڑی محنت سے "سپٹوا جنٹ"

کی نظرِ ثانی کی اور اُسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

ص ۱۶۶ و مابعد میں بائیل کے مشرق اور مغرب کی مختلف زبانوں میں تراجم کی تفصیل ہے مثلاً قدیم اطالوی، لاطینی، روسی، سریانی، قبطی، ایثوپی (حبشی) عربی وغیرہ۔ سید احمد خاں نے عہدِ عتیق کے عربی تراجم کے لیے اوّلاً سعدیہ گاؤں نامی مولف کا ذکر کیا ہے۔ اس کا بھی مخطوطہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس میں حصۂ کتب خمسہ (توریت) کو ۱۵۴۶ء میں قسطنطنیہ (استانبول) میں چھاپا گیا جس میں عربی زبان کو عبرانی خط میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد سرسید بعض اور عربی تراجم کا ذکر کرتے ہیں جو بعد کے زمانے میں ہوئے۔

ص ۱۷۴ و مابعد: روسی ترجمے کے بعد لاطینی ترجمے پہ ایک طویل بحث ہے اور سرکاری ترجمے کی (جس کو ولگیٹ (VULGATE) کا نام دیا جاتا ہے) خامیاں بھی بتائی ہیں (ص ۱۷۴) ایک اور دلچسپ چیز جس کا ذکر ضروری ہے کہ گارسین دتاسی جو سرسید کے ہمعصر اور اُن کے مدّاح تھے اپنے خطبات میں بیان کرتے ہیں کہ جب سرکاری لاطینی ترجمہ کیا گیا تو اس میں حصّہ لینے والوں کی واقفیت یونانی زبان سے زیادہ نہیں تھی۔ بعد کے زمانے کے علماء نے جب اِن خامیوں کو بتایا تو رومن کیتھولک کلیسا نے، جس نے یہ عقیدہ پھیلایا ہے کہ ولگیٹ ترجمہ روح القدس کی سرپرستی میں انجام پایا ہے، تصحیح کی دعوت کو شدت سے رد کر دیا۔ لاطینی غلط ترجمے کی اصلاح تو بہت دور رہی اس نے اس کے ماخذ اصل یونانی متن ہی کو غلط قرار دیا اور رومن کیتھولک یونانیوں کو حکم دیا کہ اس یونانی متن کو اپنی عبادتوں میں استعمال نہ کریں اور ان کی ضرورتوں کے لیے لاطینی ولگیٹ ترجمے سے جدید یونانی میں ایک نیا ترجمہ کیا گیا کہ وہ اپنی عبادتوں میں اس نئے ترجمے کو استعمال کریں۔

ص ۱۸۱ و مابعد: ظاہر ہے کہ پروٹسٹنٹ لوگ اِس دعویٰ کو رد کرتے ہیں کہ ولگیٹ لاطینی ترجمہ روح القدس کی نگرانی میں عمل میں آیا۔ اس بارے میں کورٹھولٹ (KORT HOLT) نے اپنی علمی تحقیق کے نتائج شایع کرکے ولگیٹ ترجمے کی جو خامیاں بتائی ہیں ان سے دائیکان پر حرف آتا ہے۔

ہمارے ناظرین کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ (ص ۱۸۳ میں) سید احمد خاں یہ

لکھتے ہیں کہ" باوجود بہت سے اختلافات کے جو درمیان سیکسٹس اور کلیمنٹ کے نسخوں کے ہیں اور باوجود اس بات کے کہ گرجا روم کے خاص مسائل کی پرورش کرنے کے واسطے روی ولگیٹ کے بہت سے مقاموں کا غلط ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں اس حالت میں بھی بہت سی ایسی صحیح عبارتیں موجود ہیں جنکی عبری نسخوں میں تحریف ہو گئی ہے" (کیا اصل میں غلط ہے اور ترجموں میں صحیح ہے؟ اس مقام پر بھی سید احمد خاں کی اردو اور ان کے مترجم کے انگریزی متنوں میں خاصا فرق ہے۔)

ص ۱۸۴ و مابعد میں ہمارے مصنف نے انجیل کے ان ترجموں کا ذکر کیا ہے جو یونان سے لیے گئے تھے (ص ۱۸۴) سریانی میں قدیم ترین ترجمۂ انجیل جسے پیسکیتو یعنی "صحیح" سے موسوم کیا جاتا ہے اس میں چاروں انجیلیں اور سینٹ پال کے خطوط ہیں جو امر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اس سریانی ترجمے میں انجیل یوحنا کی (۸/۱۲) وہ مشہور عبارت مفقود ہے جس میں زنا کار عورت کو رجم کرنے کا حکم ہے "حضرت موسیٰ کے قانون کے مطابق اسے سنگسار کرنا چاہیے تھا" لیکن حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ: پہلا پتھر وہ شخص مارے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو" اس پر حاضرین میں سے ہر شخص چپکے سے وہاں سے چلا گیا اور حضرت عیسیٰ نے جو تنہا رہ گئے تھے آہستہ سے یہ فرمایا:

"میں بھی تجھ پر الزام نہیں لگاتا، جا، آئندہ گناہ نہ کر"۔

ص ۱۸۸ تا ۱۹۳: ان تراجم کے ٹکڑوں سے بحث کی گئی ہے جو مصر کی زبانوں میں ہوئے تھے، یعنی قبطی، سہدیک اور امونیا میں۔ پھر عہد جدید کے موجودہ عربی زبان میں ترجموں کی تفصیل ہے۔ (ص ۴۲ میں) اس ترجمہ کا ذکر آچکا ہے جو رسول اللہ کے رشتہ دار ورقہ بن نوفل نے مکہ معظمہ میں کیا تھا۔ اب یہاں وہ بعض اور پرانے عربی ترجموں کا ذکر کرتے ہیں جو خلافت عباسیہ کے زمانے میں کیے گئے تھے (ابن قتیبہ وغیرہ کے ہاں ان کے اقتباسات ملتے ہیں) سید احمد خاں کو البقاعی (وفات ۸۸۵ھ) سے واقفیت نہیں جس کی عربی تفسیر "نظم الدرر فی مناسب الآی والسور" ہے۔ (جو دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن میں چھپی ہے) ہمارے زمانے میں لبنان کے عیسائیوں نے بھی مکمل بائبل کا ایک جدید ترجمہ کیا ہے۔

ص ۱۹۴ تا ۱۹۵: سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ دو پرانے فارسی ترجمے چھپ چکے

ہیں ان میں سے ایک کا مخطوطہ ۱۳۱۴ء کا لندن میں چھپا ہے۔ دوسرا فارسی ترجمہ بھی لندن میں ۱۶۵۲ء تا ۱۶۵۷ء میں شایع ہوا۔

مختلف زبانوں کے قدیم ترین مطبوعہ تراجم کی تفصیل دینے کے بعد ہمارے مصنف نے جدید کا بھی ذکر کیا ہے جن میں مغربی اور مشرقی زبانوں کے تراجم شامل ہیں۔

ص ۲۳۰: عہد جدید کا قدیم ترکی ترجمہ آکسفورڈ میں ۱۶۶۶ء میں طبع ہوا۔ سرسید کے معاصر امیر خانیان نامی ایک اور آرمنی نے جو (مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے حریف) پادری فنڈر کا مددگار تھا، قرآن اور بائبل دونوں کا ترکی اور ارمنی دونوں زبانوں میں ترجمہ کیا۔ اور اس خوف سے کہ ترک بائبل کے ترجمے کی توہین نہ کریں۔ اس نے ایک یہ تدبیر کی کہ کتاب کے ایک صفحہ پر قرآن مجید کا ترکی ترجمہ دیا اور مقابل صفحہ پر انجیلوں کا اور اُسے وارنا میں (جواب بلغاریہ میں شامل ہے) شایع کیا۔ یہ تقریباً ۱۹۱۰ء کی بات ہے جب کہ سید احمد خاں وفات پا چکے تھے۔

البانی زبان میں ایک ترجمہ ۱۸۲۰ء میں چھپا جس کے ساتھ یونانی متن بھی شامل ہے یہ "برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی" کی سرپرستی میں انجام پایا تھا۔

ص ۲۴۳ و مابعد: ان جدید ترجموں کا ذکر ہے۔ جو عربی، فارسی، پشتو، بلوچی، پنجابی، کشمیری، گجراتی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ مختلف عیسائی فرقوں کے مشنریوں کی جدوجہد ایشیا، یورپ، افریقا، امریکا غرض ساری دنیا میں جاری ہے۔ یکمل بائبل یا اس کے اجزاء کے ترجمے سیکڑوں زبانوں میں ہوئے اور اُن کے نمونے (GOSPEL IN MANY TONGUES) نامی کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ ترجمے کا کام آسان نہیں اور ص ۲۴۴ تا ۲۴۷ سید احمد خاں نے بتایا ہے کہ چند مترجموں نے ان دشواریوں کا ذکر کیا ہے جو انھیں پیش آئی تھیں۔ ان میں سے ایک کو اعتراف ہے کہ اُس نے عمداً عربی صرف و نحو کو نظر انداز کیا ہے تاکہ زبان آسان تر ہو جائے۔

ص ۲۴۹ پر اس تفصیل کے بعد ہمارے مصنف نے بتایا کہ خود انھوں نے اپنی تفسیر توریت و انجیل میں کن ترجموں سے استفادہ کیا ہے۔ یہ گویا ان کی تفسیر کی تمہید ہے۔

ص ۲۵۵ و ما بعد میں سید احمد خاں (BIBLE OF EVERY LAND) نامی کتاب
کا بڑی قدردانی سے ذکر کرتے ہیں جس میں سینکڑوں زبانوں کے متعلق بالترتیب تفصیل ہے
کہ کونسے ترجمے مکمل اور کونسے جزئی ہیں نیز ان زبانوں کا بھی جن میں ترجمے ابھی چھپے نہیں
ہیں یہ اوپر بیان شدہ کتاب " (GOSPEL IN MANY TONGUES)
سے مختلف ہے جس میں ہر زبان کے سارے ترجموں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ہر زبان کا ایک مختصر اقتباس
بطور نمونہ دیا گیا ہے۔

دسواں مقدمہ ؛ مسلمانوں کے مذہب میں ناسخ اور منسوخ کیا ہے ؟ ص ۲۶۳
و ما بعد میں وہ لکھتے ہیں کہ خدا نے بہت سی کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل کیں جو یکے بعد دیگر
مبعوث ہوئے تاکہ انسانوں کو صحیح راستے کی ہدایت کریں۔ اگر ان مقدس کتابوں کے مندرج
احکام میں بعض وقت اختلاف نظر آئے تو یہ کہنا ناگزیر ہے کہ متاخر حکم سے متقدم احکام منسوخ
ہوجائیں گے۔ اگر دونوں کتابیں خدا کی طرف منسوب ہوں اور ان کی صحت ثابت ہوجائے
مثلاً کتاب تثنیہ (۲۴/۱) میں اجازت ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی وجہ سے طلاق دے
تو مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے، لیکن انجیل متیٰ (۵/۳۲) کے مطابق حضرت
عیسیٰ نے بیوی کو زنا کے سوا کسی اور وجہ سے طلاق دینے کی مخالفت فرمادی اور یہ کہ
مطلقہ عورت سے نکاح کو زنا سمجھا جائے گا۔ اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے سرسید ایسی
چند اور مثالیں بھی دیتے ہیں جن سے ایک سابقہ پیغمبر کی شریعت بعد والے پیغمبر کی شریعت
سے منسوخ ہوجاتی ہے۔ پھر کہتے ہیں: کسی پرانے قانون کو اس لئے منسوخ کرنا کہ وہ
خراب قانون تھا۔ خدا کے عالم الغیب (اور صاحب حکمت) ہونے کے خلاف ہوگا۔ اس
لئے ہمارے مولف کے بیان کے مطابق، مسلمانوں کی رائے میں اس طرح کا نسخ الہامی
کتابوں میں نہیں ہوسکتا۔ نسخ کا جو امکان مسلمان قبول کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا نے
عارضی اور معین مدت کے لئے کوئی حکم دیا ہو چاہے اس محدود مدت کی صراحت کی جائے
یا نہ کی جائے۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد وہ قانون منسوخ ہوجائے گا۔ اس تائید کے
لئے سید احمد خاں نے حضرت عیسیٰ کے قول (متیٰ کی انجیل ۱۹/۸) کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

حضرت موسیٰ نے تمھاری سنگدلی کے باعث تمھیں بیویوں کو طلاق دینے کی اجازت دی تھی مگر شروع سے (قانون) ایسا نہ تھا۔" حضرت عیسیٰ نے بیوی سے برتاؤ میں شفقت اور نرمی کا حکم دیا جو قانونِ فطرت کے مطابق ہے۔

بحث جاری رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات مثلاً وحدانیتِ الٰہی، خدا کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا۔ اچھے اخلاق وغیرہ کی کبھی منسوخی نہیں ہوئی اور اگر ان میں ردّو بدل ہوتا ہے تو وہ بھی ذیلی امور میں مثلاً خدا کی عبادت کس طریقے سے ہو۔ وہ آخر میں (ص ۲۶۸) لکھتے ہیں کہ: "جو لوگ یہ بات سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے مذہب میں یہ بات ہے کہ زبور کے آنے سے توریت اور انجیل کے آنے سے زبور اور قرآن کے آنے سے انجیل منسوخ ہوگئی کہ ان میں کوئی نقص تھا تو یہ اُن کی سمجھ محض غلط ہے۔ نہ ہم مسلمانوں کے مذہب میں یہ بات ہے نہ ہمارا یہ اعتقاد ہے۔ اگر کوئی جاہل مسلمان اُس کے برخلاف کہے تو وہ اپنے مذہب، اور اپنے مذہب کے احکام سے واقف نہیں۔"

تتمے: ان دس مقدمات کے بعد دو تتمے بھی ہیں: پہلے میں اِن تاریخی واقعات کی فہرست ہے جو بائبل میں بیان ہوئے ہیں۔ شروع میں دو صفحوں کی ایک جدول میں وہ فرق بتائے گئے ہیں جو ایک ہی واقعہ سے متعلق "عبرانی" "یونانی" اور "سامری" زبانوں کے بائبلوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً خلقتِ عالم عبرانی حساب سے ۴۰۰۴ سال قبل مسیح میں ہوئی، یونانی حساب سے ۵۸۷۲ ق م اور سامری حساب سے ۴۷۰۵ ق م میں۔ اس فہرست میں ابتداً مذہبی اہمیت رکھنے والے واقعات بیان ہوئے ہیں مثلاً حضرت آدمؑ، شیثؑ، انوشؑ (یعنی نوح یا ادریس) نوحؑ، ابراہیم و عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ ولادت، سنہ ہجری کا آغاز۔ اس کے بعد عام تاریخی حالات کا ذکر ہے جو ۶۴ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس جدول کے مطابق حضرت آدم و حوا کی ولادت اور ان کا دُنیا میں نزول سب ایک ہی سال کا واقعہ ہے۔ قین (قابیل) آفرینشِ عالم کے ۲ سنہ میں پیدا ہوا۔ ہابیل کی ولادت ۳ سنہ میں ہوئی۔ قابیل اپنے بھائی کو ۱۲۹ سنہ میں قتل کرتا ہے۔ شیث کی ولادت ۱۳۰ سنہ میں، انوش کی ۲۳۲ سنہ میں۔ حضرت نوح کی ۱۰۵۶ سنہ میں۔ پھر نقشہ تاریخ واقعاتِ عظیمہ جن کا بائیبل میں ذکر آیا ہے کا جو ۱۴ صفحات میں بیان ہے۔

اس کے بعد دوسرا تتمہ چھیاسٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت کی گئی ہے۔ یعنی کہ سنہ ھ سے ۱۳۰۰ھ تک کس عیسوی سال میں کون ہجری سال تھا۔ یہ جدول جو عیسائی کتابوں پر مبنی ہے زیادہ قابل اعتماد نہیں کیونکہ مصنف یہ فرض کر لیتے ہیں کہ قمری سال کا ہر دوسرا مہینہ ہمیشہ انتیس ۲۹ کا ہوتا ہے یعنی محرم، ربیع الاول، جمادی الاول رجب، رمضان اور ذی قعدہ ہمیشہ تیس ۳۰ دن کے ہوتے ہیں اور باقی انتیس کے۔ اس سے اصول حساب میں تو سہولت پیدا ہوتی ہے لیکن حقائق کے مطابق نہیں ہوتی کیونکہ بعض وقت مسلسل کئی کئی مہینے انتیس کے بھی ہوتے ہیں اور کئی مہینے تیس کے اور علم ہیئت کے لحاظ سے اگر کسی ماہ میں چاند چین میں طلوع نہ ہوا ہو تو اس کے باوجود ممکن ہے کہ وہ چند گھنٹوں کے بعد عرب، مصر یا مراکش میں شام کے وقت نمودار ہو جائے اس لئے یہ جدولیں صرف اضافی حد تک کار آمد ہیں۔ اس میں سنہ ہجری کا آغاز یعنی یکم محرم ۱ھ کو ۱۶ر جولائی ۶۲۲ء کے مطابق دیا گیا ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ کے حساب سے ۲۱ر مارچ ۶۲۲ء کا واقعہ ہے [1]۔ اس بحث کے ساتھ سید احمد کی تفسیر بائبل کا حصہ اول ختم ہو جاتا ہے۔

تبیین الکلام حصہ دوم مطبوعہ ۱۸۶۵ء کا سرورق بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ حصہ اول کا، بجز اس کے کہ اس پر صراحت ہے کہ یہ توریت کی کتاب اول یعنی "پیدائش" (GENESIS) کی تفسیر ہے۔ فہرست مضامین کے مطابق شروع میں ایک دیباچہ ہے۔ پھر گیارہ ابواب ہیں باب اول میں عبرانی الفاظ کی تشریح اور ہم معنی عربی الفاظ دیئے ہیں (ص ۴-۹۷)۔ باب دوم میں سبت یعنی جمعہ کے دن کا بیان ہے (۹۸-۱۳۳)۔ باب سوم شیطان سے متعلق ہے جس میں جمہور کی رائے سے مختلف بیان ملتا ہے (۱۳۴-۱۸۲)۔ باب چہارم میں قابیل اور ہابیل کی پیدائش۔ ہابیل کا قتل۔ قابیل پر لعنت۔ شیث اور انوش کی پیدائش، پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں اور نواں باب عبری سپٹواجنٹ اور سامری توریت کے اختلافات کے بارے میں ہیں۔ بارہواں طوفان نوح کی بابت ہے (۲۷۵-۳۴۹)

[1] محمد حمید اللہ۔ عیسوی اور ہجری تقویم میں ایک نئی مطابقت کی ضرورت، جرنل ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۸۳ء ص ۱۶۲

آخری باب طوفان نوح سے حضرت ابراہیم تک کے حالات پر مشتمل ہے جو ص ۲۵۰ سے شروع ہوتا ہے اور اٹھارہ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔

ص ۲/۲ عہد عتیق کے اردو ترجمے کا دیباچہ اس بیان سے شروع ہوتا ہے کہ "بیبل جرمنی لفظ ہے" جب کہ دراصل یہ ایک یونانی لفظ ہے۔ انگریزی ترجمہ میں (GREEK) لکھا ہوا ہے جو صحیح ہے۔ اس کے بعد اس میں "خدا کی بھیجی ہوئی وہ وحیاں لکھی گئی ہیں جو انبیاء بنی اسرائیل اور حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں کو پہونچیں۔

یہ سرسید کا انفرادی خیال ہے ورنہ مسلمان علماء کا یہ خیال ہے کہ وحی صرف پیغمبروں پر اُترتی ہے کسی اور پر نہیں اور یہ کہ حضرت عیسٰی کے حواری (یعنی فرستادہ مبلّغ) مقدس ضرور ہیں لیکن پیغمبر نہیں اور سید احمد اپنے اس خیال کا بار بار اعادہ کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی کو وحی ہوئی تھی جیسا کہ قرآن میں کئی بار ذکر آیا ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن عام ناظر کو غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ جس انجیل کی حضرت عیسٰی کو وحی ہوئی وہ نہ انھوں نے خود لکھی اور نہ اپنے متبعین میں سے کسی کو املا کرائی اور نہ اپنے بعد کوئی تحریری چیز چھوڑی اور ان کے بعد انجیل دُنیا سے ناپید ہو گئی۔

اب ہمارے پاس انجیل کے نام سے جو چیز موجود ہے وہ ایک نہیں بہت سی ہمنام کتابیں ہیں جو حضرت عیسٰی کی سیرت یا سوانح عمری کہی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک کا مولف مختلف ہے جو اسے انجیل کا نام دیتا ہے ان میں چار کو کلیسا مستند تسلیم کر کے بائبل میں شامل کرتا ہے۔ ان انجیلوں میں سے بعض حضرت عیسٰی کے حواری ہیں اور بعض ان حواریوں کے تابعین حتیٰ کہ انجیل نگار لوقا (LUKE) کی اسکندریہ میں ۵۳ء میں، یعنی حضرت عیسٰی کے آسمان پر اٹھائے جانے کے ۲۷ سال بعد ولادت ہوئی۔ سب سے پہلے متی نے ایک سوانح عمری لکھ کر اسے انجیل کا نام دیا۔ دوسروں نے اس کی تقلید کی اور لفظ انجیل اتنا مقبول ہوا کہ ہر شخص نے وہی نام اپنی کتاب سیرتِ عیسٰی علیہ السلام کو دیا۔ ایسی کوئی ستر سوانح عمریاں ہیں جن کو انجیل کا نام دیا گیا ہے ان میں سے چار بائبل میں شامل کی گئی ہیں۔ اس تاریخی واقعے کو نظرانداز کر کے سرسید بائبل کے ان چار انجیلوں کے مجموعے کو "انجیل" قرار دیتے ہیں جو حضرت عیسٰی پر نازل ہوئی تھیں۔ بائبل کے حصہ عہدِ جدید میں نہ صرف چار مختلف مولفوں کی چار الگ الگ

انجیلیں ہیں بلکہ ان میں چند معلومات بھی مشترکہ ہیں لیکن بعض معلومات ایک میں ہیں۔ دوسری میں نہیں۔ حتیٰ کہ بہت سی معلومات میں باہمی اختلاف بھی ہے۔

پھر سید احمد خاں اِس بیان کا اعادہ کرتے ہیں کہ بائبل کو عیسائی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ عہدِ عتیق اور عہد جدید۔ عہدِ عتیق میں عیسائی علماء کے مطابق انتیس (۲۹) رسالے ہیں لیکن یہودیوں کے مطابق صرف بائیس (۲۲) ہیں۔ زمانۂ حال کے یہودی عہد عتیق میں چوبیس (۲۴) کتابیں شامل کرتے ہیں۔ سید احمد خاں عہد عتیق کی کتابوں کے شمار میں روتھ کی کتاب کا ذکر نہیں کرتے جو عام طور پر کتاب احکام کے بعد اور کتاب سامویل سے پہلے آتی ہے۔ شاید یہ سہو قلم ہے اور عمداً نہ ہو۔

وہ بحث جاری رکھتے ہیں کہ عہدِ عتیق کے مسلمانوں کے یہاں متعدد نام ہیں چنانچہ "کتاب" جو لفظ بائبل کا ترجمہ ہے "توریت" جو اصل میں لاوی کی کتاب لیوٹیکس (LEVITICUS) کا نام ہے جس میں قانونی احکام پائے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ کی پانچ کتابوں میں اِس دوسری کو وہ پورے مجموعہ کا نام دیتے ہیں یہودی کے یہاں بھی یہی رواج ہے اور وہ اسے (TORAH) (تورات) کہتے ہیں۔ مسلمانوں میں "صحف"، "زبور" اور "اسفار" کی اصطلاحیں بھی اُسی کے لئے بولی جاتی ہیں لیکن مسلمان اس مجموعہ کتبِ خمسہ کو ابواب میں تقسیم نہیں کرتے۔

یہ بھی ایک سوال طلب امر ہے کہ آیا عہدِ عتیق کی ساری کتابوں کو مسلمان تسلیم کرتے ہیں؟ وہ توریت (یعنی حضرت موسیٰ کی طرف منسوب پانچ رسالوں) اور حضرت داؤد کی زبور سے واقف ہیں اور وہ دیگر انبیاء کی طرف منسوب کتابوں کو بھی گوارہ کر لیتے ہیں لیکن روتھ (RUTH). اور الیشتر (ESHTER) جیسی کتابوں کا کم امکان ہے کہ وہ صحف سماوی سمجھی جائیں اور اس سے بھی کم امکان جوڈیتھ (JUDITH) کی کتاب کے لئے ہے جسے بعض مولف عہدِ عتیق میں شامل کرتے ہیں چونکہ سید احمد خاں کی شرح ان مذکورہ کتابوں تک نہیں پہنچی ہے اس لئے ان کی رائے معلوم نہیں۔

توریت کس نے لکھی؟ کتاب خروج (۱۸/۳۱) میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے طورِ سینا پر اعتکاف کیا تو خدا نے اُن کو پتھر کی دو تختیاں دیں جن پر خدا نے اپنی انگلیوں سے

احکام لکھے تھے۔ اس کا مکرر ذکر کتاب تثنیہ (۹/۱۰) میں بھی ہوا ہے جہاں آگے چل کر (۱۷/۹) میں یہ بیان ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پرستش کرتے دیکھا تو مارے غصے کے انھوں نے یہ تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں مزید (۳۱/۲۲تا۲۶) لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اُن احکام کو ایک کتاب کی صورت میں لکھ کر حضرت یوشعؑ کی تحویل میں دے دیا تھا۔ حضرت موسیٰ کی وفات ۱۴۵۱ ق م میں ہوئی ۵۸۶ ق م میں عراقی بخت نصر (بنوخت نصر) نے فلسطین پر حملہ کر کے شہر یروشلم کو تاراج کر دیا تھا۔ طالوت (SAUL) ۱۰۹۵ تا ۱۰۵۵ ق م) یہودیوں کا بادشاہ تھا۔ حضرت داؤد اس کے جانشین ہوئے اور ۹۷۵ ق م تک حکومت کرتے رہے۔

توریت کے متعلق خدا کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تختیوں کی روایت کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمارے مصنف نے اس بات پہ اکتفا کی کہ حضرت موسیٰ نے ٹوٹی ہوئی تختیوں کے مندرجات کو نقل کیا۔ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قانون کے پہلے نص کے بعد، جو پتھر کی تختیوں پر لکھا ہوا تھا اور تختیوں کے ٹوٹنے پر ضایع ہو گیا۔ جب دوسرا نص ملا تو وہ بھی خدا کا دیا ہوا تھا اور جو کام حضرت موسیٰ نے کیا وہ صرف یہ تھا کہ ٹوٹی ہوئی تختیوں کی عبارت کو جس حد تک ہو سکے کتابی صورت میں نقل کر دیں۔ بہرحال (ص ۱۱ پر) بحث جاری رکھتے ہوئے سید احمد خاں لکھتے ہیں "یہ تحقیق نہیں کہ ۵۸۶ ق م میں جب بخت نصر نے توریت کے سارے مخطوطے جلا دیے تھے تو یروشلم کے معبد میں جو خزانے تھے ان کو وہیں رہنے کیوں دیا" اور گمان غالب یہ ہے کہ ان میں توریت کے مخطوطے بھی شامل ہوں گے۔ پھر (ص ۱۲ پر) توریت کے بہت سے نسخے باقی رہ گئے ہوں گے جن میں چند کو یہودی اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ جب وہ بابل سے جلاوطن کئے گئے تھے۔

ص ۲/۱۳ تا ۱۴: یہودیوں میں ایک روایت عام ہے کہ حضرت عذرا نے مقدس کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع کیا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ حضرت عذرا نے توریت کا جو نسخہ تیار کیا تھا اس کا مخطوطہ انطیوخوس نے تباہ کیا یا نہیں۔ اس سے واقف ہونے کی کوئی اہمیت بھی نہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ جوڈس میکبیوس نے جب یروشلم کے

معبد کی مرمت کی اور ہر ضرورت کی چیز وہاں مہیا کی تو اس میں کتاب مقدس کا ایک صحیح نسخہ بھی موجود تھا، چاہے وہ حضرت عذرا کا اپنا نسخہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نسخہ اس وقت تک یروشلم کے معبد میں رہا تاآنکہ رومیوں نے ٹائیٹس کی قیادت میں یروشلم پر حملہ کیا۔ اس وقت یہ نسخہ شان و شوکت کے ساتھ روم لے جایا گیا اور ویسپاشین کے شاہی محل میں رکھا گیا۔" اس پر مذہبی عقیدت مندی کی بناء پر یقین تو رکھا جا سکتا ہے کہ حضرت عذرا نے اپنے حافظے سے جو توریت کو دوبارہ لکھا وہ صحیح ہوگا کیونکہ وہ ایک پیغمبر تھے لیکن حضرت عذرا کا تیار کردہ نسخہ بھی انٹی ڈوکس دیڑھ سو انیٹوکس انطیوخوس (ANTIOCHOS) ایپی فانوس نے، پھر ٹائیٹس نے تلف کر دیا تھا۔ اس پر سید احمد بحث نہیں کرتے۔

ص ۲/ ۱۷ تا ۲۰: سید احمد خاں کا اپنا خیال ہے کہ بائبل کی اندرونی شہادت سے جس کی انھوں نے بہ کثرت مثالیں دی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ توریت حضرت موسیٰ کی تالیف نہیں کیونکہ اس میں ایسے مقاموں کے نام آتے ہیں جو اس وقت تک وجود میں نہ آئے تھے۔ اس طرح اس میں یہودی بادشاہوں کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی حضرت موسیٰ کے زمانے میں نہ تھے۔ کتاب تثنیہ کے باب (۳۴) میں حضرت موسیٰ کی وفات، تدفین اور ماتم منانے کا ذکر ہے اور ان بادشاہوں کا جو بعد ازاں ہوئے۔ ان کی رائے میں یہ امور حضرت عذرا نے توریت میں بڑھائے ہوں گے اور اس طرح ان کے سابق دعوے کی تردید ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ کی توریت میں عملاً کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

دیباچہ کتاب پیدائش : ص ۲/ ۲۴ : انگریزی لفظ (GENESIS) ایک یونانی الاصل لفظ ہے جس کے معنی "ہو جانا" کے ہیں اور جس کا "پیدائش" ترجمہ کیا جاتا ہے اور وہ حضرت موسیٰ کی طرف منسوب پانچ کتابوں میں سے پہلی ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ابتداء دنیا کی پیدائش اور انسان (آدم) کی نسل کا ذکر ہے، حضرت موسیٰ کی کتابوں کے اس حصّہ کا نام اِن یونانی مترجموں نے دیا جنھوں نے توریت کا سپٹواجنٹ کہلانے والا نسخہ تیار کیا تھا۔ لیکن خود یہودیوں کی عادت یہ ہے کہ کسی کتاب کو یا تو اس کے

مصنّف کے نام سے منسوب کرتے ہیں یا اس کتاب کی عبارت کے اولین لفظ سے (مسلمانوں میں بھی یہ رواج ہے اور وہ بھی سورۂ الحمد، سورہ الف لام میم، پارہ سیقول پارہ تلک الرسول سے منسوب کرتے ہیں۔) اس لیے تعجب نہیں کہ یہودی کتاب پیدائش کو "براشیت" کا نام دیتے ہیں جو اس عبرانی کتاب میں پہلا لفظ ہے۔ اس کے معنی "آغاز" کے ہیں۔ (راش عبرانی میں وہی لفظ ہے جو عربی میں "راس" یعنی "سرے" کے معنی ہیں مثلاً راس الامر یعنی کام کا آغاز۔

ص ۲/۲۴: سید احمد خاں کے مطابق حضرت موسیٰ کی پانچوں کتابوں کو حضرت عزرا نے دوبارہ لکھا تھا۔ پھر وہ اضافہ کرتے ہیں کہ عیسائی مورخ "یوسے بیوس" اور دیگر مولف جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب پیدائش حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی ہے اور اسے حضرت موسیٰ نے اس وقت لکھا جب وہ ایک مصری شخص کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے نکل کر مداین میں پناہ گزین ہوئے یعنی پیغمبر بننے سے بہت پہلے لیکن تھیوڈوربٹ اور مولڈن پادر اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ اس وقت کی تالیف ہے جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے کوچ کرکے طور سینا پر اعتکاف کرتے ہیں۔

یہودی مؤلف ربّی موزا ایس بن ناخماں (MOSES BEN NACHMAN) کے مطابق خدا نے حضرت موسیٰ کو تختیوں پر احکام عشرہ دیئے اور اس نے حضرت موسیٰ کو جبل طور پر اعتکاف کے اولین چالیس دنوں کے دوران کتاب پیدائش کے مندرجات املا کرائے اور یہ کہ پہاڑ سے نیچے اترنے پر انھوں نے ساری چیزوں کو قلمبند کیا۔ یہ مولف اپنی تائید میں کتاب خروج (۱۲/۲۴) کا حوالہ دیتا ہے کہ: خدا نے موسیٰ سے کہا: مجھ سے ملنے پہاڑ پر آ اور وہیں میں تجھے پتھر کی تختیاں اور ایک قانون دوں گا اور وہ احکام جو میں نے لکھے ہیں تاکہ ان کی تعلیم دے سکے۔ (صفحہ ۲۵) اور کتاب خروج (۸/۳۱) کا یہ جملہ بھی کہ اور موسیٰ کو جبکہ ان کی طور سینا پر خدا سے ملاقات ختم ہوئی تو احکام کی دو تختیاں دیں۔ جو پتھر کی تھیں اور جن پر خدا نے اپنی انگلیوں سے احکام لکھے تھے۔ نیز کتاب خروج (۱۵/۳۲ تا ۱۵۶) کے یہ الفاظ کہ: "پھر موسیٰ پلٹا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور احکام کی دونوں تختیاں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔ اِن تختیوں پر دونوں طرف عبارت لکھی تھی۔۔۔۔ اور یہ تختیاں خدا کی بنائی

ہوئی تھیں اور اُن پر عبارت بھی خدا نے ہی لکھ کر کندہ کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ پھر یہ پیش آیا ایک گاؤ سالہ ہے اور لوگ ناچ رہے ہیں۔ موسیٰ سخت غضبناک ہوا، اس نے تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں اور ان کو پہاڑ کے نیچے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔" اس سے آگے (۳۴/۱) میں ہے کہ "اور خدا نے موسیٰ سے کہا کہ پتھر کو تراش کر دو تختیاں تیار کر جو سابقہ تختیوں سے بالکل مشابہ ہوں اور میں اُن پر وہ الفاظ لکھوں گا جو ان سابقہ تختیوں پر تھے جن کو تو توڑ چکا ہے"۔
(۳۴/۲۸ اکے) یہ الفاظ "اور وہ وہاں رب کے ساتھ چالیس دن چالیس راتیں رہا۔ اسی اثنا میں نہ اُس نے روٹی کھائی اور نہ پانی پیا اور اس نے تختیوں پر احکام کے الفاظ لکھے یعنی احکام عشرہ"
مذکورہ بالا اقتباسات سے بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے کہ یہودی عقائد کے مطابق پتھر کی (یعنی) تختیوں پر جو حضرت موسیٰ نے تراشی تھیں لکھنے والا خود خدا ہے اور حضرت موسیٰ نہیں ہیں مگر سید احمد خاں اُس پر سکوت اختیار کرتے ہیں۔

ص ۲/۲۶: وہ بحث جاری رکھتے ہیں کہ ہورن نے اپنی انگریزی کتاب "بائیبل کے ناقدانہ مطالعے کی تمہید" جلد چہارم کے صفحہ ۴ پر نام بتائے بغیر ایک بڑے مذہبی مؤرخ کا قول نقل کیا ہے کہ "اس بات کو قرار دینا کہ اُن میں سے (یعنی جو رائیں در باب اختلاف زمانۂ تحریر کتاب پیدائش ہیں) کون سی رائے نہایت عمدہ اصلیت رکھتی ہے اور ہمارے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ موسیٰ اِس مقدس کتاب کی تصنیف میں ناقابلِ تصور رہویت سے مدد کیا گیا تھا اور جس کتاب کو موسیٰ نے قوانین اور احکام کا جو آئندہ کی کتابوں میں ہیں مناسب دیباچہ سمجھا ہے"۔ یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہورن کی انگریزی عبارت کا یہ اردو ترجمہ، جو غالباً سید احمد خاں نے کروایا یا خود کیا، کافی پیچیدہ اور سو سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے۔
اس اقتباس کے دینے کے بعد وہ اضافہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ بائیبل کی "کتاب پیدائش" الہام ربانی کے تحت لکھی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں کتاب پیدائش عالم کی وہ تفصیلات دی گئی ہیں جو ربانی الہام کی مدد کے بغیر کوئی شخص جان نہیں سکتا۔ اس طرح بہت سے قصّے اگلے زمانوں کے متعلق جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں اور جن میں ہم مسلمان ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے ہیں۔ انگریزی ترجمہ میں یہاں (IMPLICIT BELIEF)

ہے۔ وہ بھی اِس بائیبل میں پائے جاتے ہیں۔ کتاب پیدائش میں دُنیا کی پیدائش، انسان کی پیدائش اس کا زمین پر آنا۔ اُس کی نسل، طوفانِ نوح، زمین کا انسانوں میں بٹ جانا، زبانوں کا مختلف ہوجانا اور مختلف قوموں کے حالات جو حضرت یوسف کی وفات تک وجود میں آئے جو ۲۳۶۹ سالوں پر محیط ہیں اور بقول ڈاکٹر ہالسر ۲۳۱۹ کے دوران میں وقوع پذیر ہوئے۔ دُنیا اور آدم کی تخلیق کے متعلق جرمن ماہرین دینیات اور انگریز توحید پسند فرقے خاص کر جرمن مؤلفین بائیر، روزن مولر اور انگریز ڈاکٹر گیڈبیس کا دعویٰ ہے کہ تخلیق عالم اور حضرت آدمؑ کے زمین پر آنے کا جو قصّہ (بائیبل میں) ہے حقیقی واقعات کا تذکرہ نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ افسانہ جو حضرت موسیٰ نے پُرانے یونانی مورخوں کی طرح اختراع کیا ہے تاکہ ان قوانین کو زیادہ معتبر ثابت کریں جو وہ خود وضع کر رہے تھے اور ان کے پیشِ نظر یہ بتانا تھا کہ انسان میں جو شر پایا جاتا ہے وہ کہاں سے آیا ہے۔ پُرانے یہودی ماہرِ دینیات کا عقیدہ ہے کہ کتاب پیدائش کے پہلے تین بابوں میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

پھر صفحہ ۲۸ پر سید احمد خاں لکھتے ہیں۔ چند عیسائی مفسرین کے خیال میں کتاب پیدائش کے ایک حصے کو لفظی معنوں میں ماننا چاہیئے اور باقی کو محض ایک مجاز اور تمثیل سمجھنا چاہیئے۔ دیگر مؤلفین مثلاً ہارتن نے اصرار کیا ہے کہ ساری کی ساری کتاب کو لفظی معنوں میں لینا چاہیئے۔

ص/۳۰ تا ۳۵: جہاں تک مسلمانوں کے طریقۂ عمل کا تعلق ہے۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ وہ ہر عبارت کو لفظی معنوں میں لیتے ہیں۔ بجز ان سورتوں کے سیاق و سباق کا اقتضا کچھ اور ہو یا کسی اور دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کو لفظی معنوں میں نہ لیا جائے۔ چاہے مجازی معنوں میں لینے کی دلیل آیت میں ہو یا نہ ہو کہ قرآن مجید میں کسی اور مقام پر ہو۔ پھر اضافہ کرتے ہیں کہ یہ طرزِ عمل نہایت ضروری بھی ہے کیونکہ عمیق اور نازک حقائق کو جو ایک سادہ غیر ترقی یافتہ انسان نہیں سمجھ سکتا۔ استعارے کنائے سے بیان کیا جائے تاکہ بعد میں جب علم کی ترقی ہو تو انسان کتاب مقدس کے ان استعاروں اور حقائق میں کوئی تضاد نہیں پائے گا اور سمجھ جائے گا کہ قصور اس کی فہم اور معیارِ معلومات کا تھا نہ کہ خدا کے کلام کا۔ مزید برآں الہامی مقدس کتابوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اوّلاً ہماری خلقی اور روحانی تربیت کو وسیع کرے اور ان امور کو نہیں

جن کی ترقی ہمارے تجربات اور معیار علم و معرفت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیئے یہ ضروری تھا کہ جو الفاظ پیغبر کی زبان سے عام انسانوں تک پہنچانے کے لیئے ادا کرائے جائیں وہ اس قسم کے ہوں کہ ہر معیار، ہر طبقے اور ہر دور میں سمجھے جا سکیں۔ اسی طرح یہ بھی لازم تھا کہ استعارے میں ایسے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں جو اصل حقیقت کے خلاف ہوں تاکہ ہر دور کا انسان اپنے زمانے کی علمی ترقی اور معیار معلومات کے مطابق فائدہ اٹھا سکے۔

وہ آخر میں کہتے ہیں کہ مفسر کو چاہیے کہ تفسیر کو اپنے زمانے کے معیار علم کے مطابق بنانے میں پس و پیش نہ کرے ورنہ کچھ عرصہ بعد علم کی ترقی سے وہ معلومات از کار رفتہ ہو جائیں گی۔

توریت مقدس

کتاب پیدائش۔ باب براشیت میں سید احمد خاں کا طریقہ کار حسب ذیل ہے۔

۱۔ شروع میں باب کا (جس میں اسو جملے یا آیتیں ہیں) خلاصہ اردو میں دیا گیا ہے۔

۲۔ ہر جملے کا عبرانی متن درج کر دیا ہے۔

۳۔ اس کا بین السطور اردو ترجمہ اور پھر

۴۔ انگریزی ترجمہ ہے۔

۵۔ مماثل قرآنی آیتیں اور ان کے عربی متن کے ساتھ اردو اور انگریزی ترجمے

۶۔ کتاب پیدائش کی پہلی آیت: "سرے میں پیدا کیا۔ خدا نے آسمانوں اور زمین کو (مماثل آیات قرآنی میں ۱/۶، ۳۹/۶۲-۶۳)

سید احمد خاں کہتے ہیں کہ یہاں "سرے میں" یعنی "شروع میں" کے الفاظ سے "پہلی چیز" کا ذکر نہیں ہے جس کی تخلیق کی گئی ہو۔ پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بیان کیا کہ کتب مقدس کی دوسری عبارتوں میں ہے کہ کچھ نہ تھا بجز خدا کے، پھر پانی، تاریکی، روشنی، ہوا آسمان، زمین، نباتات، سورج، چاند، ستارے، پھر حیوانات اور آخر میں انسان (آدم) اور یہ ہی مذہب عالم شہادت کے پیدا ہونے میں ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔

ص ۲/۳۸ تا ۳۹ ؛ خدا کی قدرت میں تھا کہ تمام چیزیں ایک لمحے میں کُن فیکون کے طور پر پیدا کر دے اُس نے ترجیح دی کہ یہ کام چھ دن میں انجام پائے اور کیونکہ "اس نے اِس عالم اسباب کو بنایا ہے۔ اس لیے اِن چیزوں کا ظہور عالم شہادت میں بہ ترتیب اور بذریعہ اسباب کے کیا ہے"۔ (اس عبارت کا انگریزی ترجمہ یوں ہے "کیونکہ اُس نے چاہا کہ ان کو غیر تبدیل پذیر قوانین سبب و نتیجہ کے مطابق پیدا کرے")

عبرانی میں اللہ کے لئے "ایلوھیم" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو جمع کا صیغہ ہے (عربی زبان میں جمع کے لئے آخر میں "نون" بڑھاتے ہیں، مسلم سے مسلمین اور عبرانی میں اس کی جگہ "میم" یعنی ایلوہ کی جگہ (ایلوھیم) مگر یہ جمع احترام کے لئے ہے (جیسے اُردو میں بھی "اس نے" کی جگہ "انھوں نے" کہتے ہیں) پھر سید احمد خاں عیسائیوں کے اس استنباط کی تردید کرتے ہیں کہ اس صیغۂ جمع سے تثلیث کی طرف اشارہ ہے اور وہ کہتے ہیں کہ "اللہ" کے لئے عبرانی لفظ "یہوہ" ہے جس کی جمع کا صیغہ کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ ایلوھیم کا واحد ایلوہ ہوتا ہے مگر یہ خدا کا نام نہیں بلکہ خدا کی ایک صفت ہے جس میں رحمت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اگر خدا صرف عادل ہوتا تو کوئی چیز باقی نہ رہ سکتی۔ اُن کی برقراری کے لئے رحم کی ضرورت ہے۔ پھر وہ اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ خدا نے کائنات کی تخلیق سے بھی قبل کہا تھا کہ "میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی"۔

پھر ایک طویل جملۂ معترضہ بائبل میں ایلوھیم کے لفظ کے استعمال پر ہے۔ کبھی تو اس سے مراد حقیقی خدا ہوتا ہے، کبھی کبھی بادشاہوں، حاکموں کے لئے اور یہاں تک کہ (خروج ۷/۱ میں) خدا کی طرف منسوب قول: میں نے موسیٰ سے کہا کہ دیکھ میں نے تجھے فرعون کا ایلوھیم بنایا ہے اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا"۔ مکرر (خروج ۴/۱۶ میں) خدا نے موسیٰ سے کہا "اور تو اس (ہارون) کے لیے ایلوھیم ہوگا"۔

سید احمد خاں نے مزید کہا کہ مذکورہ عبارتوں میں ایلوھیم جمع کا صیغہ ہو نہیں سکتا جیسا کہ وہ ذیل کے جملے (تثنیہ ۳۲/۳۶ تا ۳۷) میں ہے : "کیونکہ یہوہ اپنی قوم کا حساب لیگا ..... اور کہے گا کہ ان کے ایلوھیم کہاں ہیں جن پر وہ بطور ایک چٹان کے اعتماد کرتے

تھے ؟" سیاق و سباق سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ کہاں واحد ہے اور کہاں جمع ؟

ص ۲/۴۱ تا ۴۲ : پھر مصنف نے بائیبل کے اِن مقاموں کی مکمل فہرست دی جہاں ایلوھیم کا لفظ بطور جمع کے بادشاہوں، قاضیوں، سرداروں، فرشتوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور جہاں وہ خدائے حقیقی کے لئے برتا گیا ہے اُس سے تثلیث مراد نہیں ہوتی اس کے بعد وہ کہتے ہیں :" اور اگر یہ بات کہی جاوے کہ گو جمعیت (= کثرت) وجودوں کی اس سے ثابت نہ ہو مگر اس لفظ کا بمعنی جمع بھی استعمال میں آنے سے پہلے ایک لطیفہ اور اشارہ جمعیت وجودوں کا نکلتا ہے۔ گو یہاں بمعنی واحد حقیقی استعمال کیا گیا ہے مگر یہ تقریر جب ہو سکتی ہے جب تثلیث وجودوں کی پہلی (پہلے) ثابت ہو جائے حالانکہ ہم مسلمانوں کے نزدیک تمام سِکرِ پچرز (= بائبل) سے بجز وحدت حقیقی کے اور کچھ ثابت نہیں ہے ۔" (ص ۴۲) یہاں اردو اور انگریزی متنوں میں بہت کم مطابقت ہے غالباً اردو کو ان کا انگریز مترجم سمجھ نہ سکا۔

ص ۲/۴۳/۴۴ : لفظ ایلوھیم ہی کی طرح اِس درس (آیت) میں لفظ " شمایم " آیا ہے۔ اس کا ترجمہ " آسمان " کیا جاتا ہے مگر " آسمانوں " بھی ترجمہ ہو سکتا ہے (جیسا کہ خود سید احمد خاں نے کیا ہے) اس بارے میں مترجمین میں اختلاف رہا ہے۔ ایک پُرانے ترجمۂ بائیبل ۱۸۴۵ء میں ترجمہ بطور جمع کے کیا گیا ہے۔

ص ۲/۴۵ : زیرِ بحث درس میں زمین کے لئے لفظ " ارض " آیا ہے جو واحد صیغہ ہے اور عبرانی زبان میں اِس لفظ کی جمع " آر اصوث " موجود ہے۔ سید احمد خاں کہتے ہیں کہ اس بارے میں نہ بائیبل میں کوئی تصریح ہے اور نہ قرآن میں مگر قدیم زمانے سے سب لوگ سمجھتے ہیں کہ زمین ایک گولے کی شکل کی ہے لیکن اس بارے میں اتفاق رائے نہ ہو سکا کہ آیا زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے یا آفتاب زمین کے گرد؛ بائیبل کے چند مقامات کی عبارت میں یہ امکان ہے کہ آخرالذکر مفہوم لیا جائے۔

ص ۲/۴۷ : یہاں کتاب پیدائش کے اِس باب کا دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے کہ

" ۲۔ اور زمین تھی ویران اور خالی اور اندھیرا اوپر منہ پانی کے۔ اور روح خدا کی سے نے والی (ہلنے والی) اوپر منہ پانیوں کے۔"

اُنھوں نے جو قرآنی آیتیں نقل کی ہیں وہ یہ ہیں کہ "سب تعریف اللہ کی جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو، اور کیا اندھیرا اور اُجالا" (۶/۱) "نکالنے والا صبح کے اوجالے کا" (۶/۹۶) "تو لاتا ہے رات کو دن میں، اور تو لاتا ہے دن کو رات میں" (۳/۲۷) "اور کیا ہم نے رات اور دن کو دو نشان، پھر مٹایا ہم نے نشان دن کا دیکھنے کو" (۱۷/۱۲)۔ ہمارے مصنف نے کتاب مشکاۃ المصابیح کی ایک حدیث یہ بھی نقل کی ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ سے پوچھا کہ مخلوقات کی تخلیق سے قبل ہمارا رب کہاں تھا؟ آپ نے جواب دیا کہ "وہ ایک "عماء" میں تھا جس کے نیچے ہوا تھی اور نہ اوپر۔ اور اس کا عرش پانی پر تھا" اس "عماء" کا ترجمہ بعد میں (مولف) کیا ہے: ابر اور پردہ جس سے اوٹ ہو جاتی ہے یعنی اس سے مُراد اپنے آپ میں پوشیدہ ہونا تھا۔

بائیبل میں ہے کہ "خدا کی روح پانیوں کی سطح پر متحرک تھی" ہمارے مترجم کے الفاظ میں: اور روح خدا کی سے نے (؟ ہلنے) والی اوپر منہ پانیوں کے۔ اور قرآن میں ہے اس کا عرش پانی پر تھا۔ "اس کا سید احمد خاں نے لکھا (ص ۵۸ پر) کہ "قاموس" نامی لغت کے مطابق "عرش کے معنی بزرگی اور جلال کے ہیں"۔

قرآن اور بائیبل کے بیانات کا مقابلہ کرتے وقت نظر آتا ہے کہ اندھیرے کے لیے قرآن میں "ظلمات" (یعنی جمع کا صیغہ: اندھیرے) آیا ہے اور واحد کا صیغہ "ظلمت" نہیں۔ (ہمیں شاید یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مماثل استعمال فرانسیسی میں بھی بعینہٖ جمع (TENEBRES) ہوتا ہے۔ بصیغۂ واحد کبھی نہیں ہوتا۔ اردو میں بھی اندھیرے اور تاریکیاں کہتے ہیں) شاید اس کی توجیہ قرآن (۲۴/۳۹ تا ۴۰) میں ملے گی جہاں ہے: جن لوگوں نے کفر کیا ہے۔ اُن کے اعمال ایک سراب کے سے ہیں۔۔۔۔ یا اُن اندھیروں کے سے جو ایک گہرے سمندر میں ہوں جس کو ایک موج ڈھانپے، جس کے اوپر ایک اور موج، جس کے اوپر ایک بادل۔ تاریکیاں جن میں سے ایک پر ایک کہ کوئی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے"۔ اسی طرح (سورہ ۳۹/۶) میں ہے: "اُس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا: پھر اس نے اس کا جوڑا بنایا۔۔۔۔۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین "تاریکیوں کے اندر تمہیں ایک خلقت کے بعد ایک اور خلقت دیتا ہوا پیدا کرتا ہے"۔ "تین تاریکیوں سے مُراد یہاں شاید سہ گانہ تاریکی (THREE FOLD GLOOM) ہے جیسا کہ پکھتال نے ترجمہ کیا ہے۔

ص ۲/ ۴۸ تا ۵۰ : بائبل کی دوسری ورس کی تشریح کرتے ہوئے سید احمد خاں کہتے ہیں: موجودہ دن اور رات والی عالم شہادت کی تخلیق سے بھی پہلے خدا نے اور چیزیں پیدا کی تھیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ یہاں وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ خدا ہمیں فہم کے مطابق علم دیتا ہے، چاہے توریت کے نزول کے وقت ہو یا قرآن مجید کے۔ اس کے بعد وہ کتاب مشکوٰۃ (مشکاۃ) کے حوالے سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ، "سب سے پہلے خدا نے قلم کو پیدا کیا پھر اس کو کہا کہ لکھ اس نے کہا: کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لکھ اندازۂ عالم کو پھر اس نے لکھا جو تھا اور جو ابد تک ہونے والا ہے" ہمارے مصنف کے خیال میں قلم سے مراد خدا کی "صفتِ ارادہ اور علم" ہے۔ (ص/ ۵۰)

ان کے خیال میں بہ حیثیت مجموعی کسی چیز کی تخلیق کے ۵ درجے ہوتے ہیں ص ۲/ ۵۳ تا ۵۵: انھوں نے ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ممکن ہے کہ یہ نظریہ لوگ آج اگر قبول نہ کریں لیکن بعد میں مان لیں گے اور ڈاروِن نے اپنا نظریہ اخوان الصفاء اور ابن مسکویہ کی کتابوں سے لیا ہے جنھوں نے ارتقاء کے مدارج میں انسان سے پہلے بندر کو اہم مقام دیا[1]

ص ۲/ ۵۷ : شروع میں زمین نے کوئی صورت اختیار نہیں کی تھی اور اس کے عناصر پانی پر منتشر تھے اور پانی ہی سے ہر چیز پیدا کی گئی۔ چنانچہ قرآن مجید (۲۱/ ۳۰) میں بھی اس کی صراحت ہے۔

ص ۲/ ۵۷، بائبل میں ہے کہ خدا کی روح پانیوں پر متحرک ہوئی۔ عیسائی علماء لفظ روح سے روح القدس مراد لیتے ہیں اور اس سے "تثلیث" ثابت کرتے ہیں لیکن ان کے خیال میں نہ یہودی یہ تاویل قبول کریں گے اور نہ ہی مسلمان؛

ص ۲/ ۶۲ : بائبل کے مطابق شروع سے دن اور رات میں امتیاز کے لئے روشنی اور تاریکی پیدا کی، سورج، چاند اور ستاروں کی پیدائش کو چوتھے دن پر چھوڑا ہے۔ اس

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ "المصادر الاسلامیہ لداروین فی نظریۃ عن اصل الانواع" مطبوعہ الدراسیات الاسلامیہ، ج ۱۶/ ۴۔ ۱۹۸۱ء اسلام آباد، پاکستان۔ ص ۴۳ تا ۵۸

طرح تاریکی اور روشنی کی پیدائش سورج کی روشنی سے الگ گویا ایک مستقل چیز ہے۔
ص (۲/۶۸) توریت کی کتاب پیدائش باب اول کے چھٹے فقرے میں ہے کہ خدانے کہا ہوا ایک پھیلاؤ (آسمان) پانیوں کے درمیان، اور وہ پانیوں کو پانیوں سے جدا کرنے والا۔ پھر (ص ۲/۶۹) سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ "پھیلاؤ" ترجمہ ہے عبرانی لفظ "رقیع" کا جو عربی میں بھی بعینہٖ وہی ہے اور اس سے مطلب پھیلاؤ یا پہلے آسمان کے ہیں۔ نیز بائیبل کے مختلف زبانوں کے تراجم میں اس لفظ کا متفرق ترجمہ ملتا ہے۔
ہمارے مصنف نے اسی انداز سے مختلف ابواب کی تفسیر کی ہے۔

تبیین الکلام۔ حصہ سوم

انجیل مقدس متیٰ از باب اوّل تا باب پنجم

مشمولہ تصانیف احمدیہ حصّہ اول، جلد دوم (ص ۲ تا ص ۱۳۱)

مطبوعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ باہتمام لالہ گلاب رائے ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء

اِس کتاب کی پہلی اشاعت مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دستیاب نہیں جو متن ہمارے سامنے موجود ہے وہ تصانیف احمدیہ جلد دوم میں ٹائپ میں چھپا ہے جس میں صراحت ہے کہ یہ حصّہ بھی ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء کی تصنیف ہے۔
اور یہی وہ زمانہ ہے جب ان کی تبیین الکلام حصہ اول غازی پور میں چھپی گویا اس کا یہ جزو دوم ہے اور دونوں اجزا ساتھ ساتھ چھپتے رہے لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کب اور کس شکل میں؟ چونکہ توریت کی شرح وہ مکمل نہ کرسکے۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ دونوں کی تالیف کا کام بیک وقت ہوتا رہا جو قرآن مجید کی تفسیر سے پندرہ سال قبل شروع ہوا تھا۔

اس کی اہمیت اس بناء پر ہے کہ ایک ہی مسئلہ پر جب تفسیر بائبل اور تفسیر القرآن میں جو مشترک باتیں بیان کی گئی ہیں اُن کے تقابل سے ان کے یہاں خیالات کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے اور ایسے مسائل ملتے ہیں مثلاً تفسیر القرآن میں لکھا کہ حضرت مریم کے ہاں حضرت جبریل کا آنا اور بی بی کو حاملہ کرنا خواب کا واقعہ ہے اور یہ کہ حضرت جبریل

کے واپس جانے کے بعد بی بی اپنے شوہر یوسف نجّار کے گھر چلی گئیں اور حضرت عیسٰی کی ولادت
کوئی خارقِ عادت واقعہ نہیں ہے لیکن انجیل کی زیرِ بحث شرح میں انھوں نے کہا کہ بن باپ کے
ایک باکرہ، باعفّت ماں سے ولادت ہوئی۔ یہ اسرار الٰہی میں ہے جس کے متعلق یہ نہیں پوچھنا چاہیے
کہ وہ کس طرح سے واقع ہوا۔ (ص ۳۸)

دوسرے الفاظ میں بائبل کی شرح میں وہ معجزوں کے قائل تھے لیکن بعد میں قرآن مجید
کی تفسیر لکھتے وقت اُن کی رائے بدل گئی۔ انجیل کے زیرِ بحث شرح کا آغاز ایک مقدمہ سے
کیا بعنوان: "مختصر تاریخ عیسائی مذہب کی مسلمانوں کے مذہب کے نکلنے تک" جو پندرہ
صفحوں پر مشتمل ہے ایک اور مقدمہ جو خاص "متھی" (یعنی متّی) کی انجیل کی تاریخ پر، دس
صفحوں کو محیط ہے۔ اُس کے بعد اس انجیل کی لفظ بہ لفظ شرح شروع ہوتی ہے جسے وہ بے تکلف
"تفسیر" کا نام دیتے ہیں۔ کبھی ایک ورس (آیت یا جملے) کی طویل شرح اور کبھی تین چار درسوں
کی تشریح یکجا کر دی ہے۔ انگریزی ناموں کا املا اردو رسم الخط میں دینے کی وجہ سے اصل نام
کا تعین دشوار ہو جاتا ہے۔ طباعت کے وقت پروف کی تصحیح پورے طور پر نہیں ہوئی مثلاً
حضرت سلیمان کے بیٹے کا نام (ROBOAM) عربی میں "رقیم" ہوتا رہا ہے۔ اس سے وہ واقف
بھی ہیں لیکن یہاں "رنسم" چھپ گیا ہے۔

عیسائی مذہب کی تاریخ: ص ۲ پر تاریخی پس منظر ہے کہ حضرت عیسٰی کی ولادت
کے وقت ان کی (یہودی) قوم میں تین فرقے تھے: فروسی، صدوقی اور اسینی (دیکھئے
متی ۳/۷)

فروسی توریت کے ظاہری اور ایک باطنی یعنی دو معنٰی کے قائل ہیں اور توریت
کے علاوہ کچھ اور روایات بطور حدیث کے بھی بتاتے ہیں (شاید یہ تالمود کی طرف اشارہ ہے)
مگر صدوقی اور اسینی آیت کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح یہ کہ اس زمانے
میں حضرت موسٰی کی شریعت میں بہت سی بدعتیں اور بت پرستوں کی رسمیں بھی شامل تھیں

ان حالات میں حضرت عیسیٰؑ ۶ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوئے[1]۔ اور جب وہ چھبیس سال کے تھے
تو انھوں نے حضرت زکریا کے بیٹے حضرت یحییٰ کے ہاتھوں جو ان کے خلیرے بھائی سمجھے جاتے ہیں۔
بپتسمہ لیا۔ اُس کے پانچ سال بعد ظالم اور بے اصول یہودی بادشاہ ہیروڈ نے حضرت یحییٰ کو قید
کر دیا۔ تو حضرت عیسیٰ صحرانشین ہو گئے اور ایک چلّے کے بعد شیطان کے ورغلانے میں نہ آئے تو اللہ
نے انھیں نبی مامور کیا اور وہ وعظ کرنے لگے۔ اس ناانصافی کے دور میں وہ چھپے رہنے پر مجبور تھے
اور وعظ بھی مخفی طور پر فرمایا کرتے تھے۔ تین سال بعد ظالموں نے ان کو سزائے موت دے دی
مگر اللہ نے اُن کو محفوظ رکھا اور آسمان پر اٹھا لیا (جس کے معنی سرسید کی رائے میں مرتبے
کی بلندی کے ہیں)

ص ۳: چونکہ انجیل متی (۱۰/ ۵ تا ۶ نیز ۱۵/ ۲۴) کے مطابق حضرت عیسیٰ نے خود ہی فرمایا
تھا کہ: "میں بھیجا نہیں گیا ہوں بجز بنی اسرائیل کی گُم کردہ راہ بکریوں کی طرف" اور حواریوں
کو جب تبلیغ کے لئے بھیجا تھا تو انھیں صراحت سے حکم دیا کہ غیر یہودی لوگوں کے یہاں نہ جاؤ اور
اس پر تعجب نہ کیا جائے کہ عیسیٰ نے صرف یہودیوں کو نصیحت کی اور ان کے سوا کسی اور کو
کچھ نہ کی۔"

پھر طویل بحث عیسائی فرقوں کے عقائد کے متعلق ہے ان میں توحید کے قائل بھی ہیں
اور تثلیث کے معترف بھی جو حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ بعض وہ
جو اس سے منکر ہیں۔ اور ایسے بھی جو تثلیث سے روح القدس کو خارج کر کے ان کے بجائے

---

[1] سنہ عیسوی حضرت عیسیٰ کی ولادت سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا عیسائیوں میں عام استعمال شارلمان
کے زمانے میں حضرت عیسیٰ کے کوئی آٹھ سو سال بعد شروع ہوا۔ تاریخ کا تعین چھٹی صدی عیسوی
کے مورخ دینس (DENYS) نے کیا اور اس سے حسابی غلطی ہوئی ہے اس کا بہت بعد میں پتہ چلا۔ اس لئے سنہ
کی تصحیح نہ ہو سکی بلکہ یہ تسلیم کر لیا گیا کہ حضرت مسیح کی ولادت قبل مسیح ہوئی۔ مشہور اطالوی مستشرق کائتانی کو رنے
لکھا ہے کہ سنہ عیسوی حضرت عیسیٰ کے آٹھ سو سال بعد شروع ہوا اور ہجری سنہ رسول اللہ کی
وفات کے چھ سال بعد۔

حضرت مریم کو شامل کرتے ہیں اور کچھ کے خیال میں حضرت عیسٰی کی ولادت کوئی معجزہ نہ تھی بلکہ ان کے ماں اور باپ دونوں تھے۔ ایسے فرقے بھی جو حضرت عیسٰی کی الوہیت سے انکار کرتے ہیں۔ پھر سید احمد خاں بتاتے ہیں کہ "تثلیث کا عقیدہ تقریباً ۳۲۵ء میں قبول کیا گیا اور اس سے انکار کرنے والوں کو جلسے سے خارج کر دیا گیا۔ اس توحید پسند گروہ کا لیڈر آریوس نامی ایک پادری تھا ان فرقوں کے علاوہ ایک گروہ کہتا تھا کہ حضرت عیسٰی میں خدائی اور انسانی دونوں حیثیتیں یا طبیعتیں" تھیں۔ ان فرقوں کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے۔

ص ۱۷، ما بعد میں متیٰ کی انجیل کی تاریخ کے سلسلے میں بحث ہے کہ کیا وہ اصل میں عبرانی زبان میں تالیف ہوئی تھی یا نہیں؟ یونانی ترجمہ کس نے کیا معلوم نہیں؛ سید احمد خاں نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اصل تالیف یونانی میں ہوئی اور یاد دلایا کہ حضرت عیسٰی غیر یہودیوں میں تبلیغ سے منع کرتے تھے اس لئے متیٰ کی انجیل کا دراصل عبرانی ہی میں ہونا قرین قیاس تھا ورنہ جب یونانیوں میں تبلیغ کرنا مقصود نہیں ہے تو ان کی زبان میں انجیل کیوں لکھی جائے گی۔

ص ۲۲ تا ۲۳: متیٰ کی انجیل حضرت عیسٰی کے دنیا سے رخصت ہونے کے فوراً بعد لکھی گئی اور اس کا یونانی ترجمہ بھی ہوا حتیٰ کہ بقیہ انجیلوں سے بھی قبل۔

ص ۲۶ و مابعد: انجیل متیٰ کے آغاز میں حضرت عیسٰی کا ان کی ماں اور ان کے شوہر یوسف نجّار کی وساطت سے نسب حضرت ابراہیم سے ملایا گیا ہے۔ سید احمد خاں نے بتایا کہ متیٰ نے اپنی انجیل کی تالیف صرف اس غرض سے کی کہ یہودیوں کو عیسائیت قبول کرنے کی طرف توجہ دلائیں اور اس لئے متیٰ نے ان معلومات کا غلط استعمال بھی کیا ہے۔ عہد عتیق کے اشعیاہ (۸، ۹ و ۲) نبی کی کتاب میں (۷/۱۴) ذکر ہے کہ ایک کنواری لڑکی بچہ جنے گی جس کا نام عمانوئیل رکھا جائے گا اور یہ آحاز یہودہ بادشاہ کا زمانہ ہے۔ جو حضرت مسیح سے سات سو سال قبل کا معاملہ ہے اور اس کو متیٰ نے حضرت عیسٰی سے متعلق بتایا ہے۔ اسی طرح اشعیاہ نبی کی کتاب (۴۲/۱) میں ایک ایسے نبی کی پیش گوئی ہے جو خدا کا محبوب بندہ ہوگا اور غیر یہودیوں میں خدائی احکام پھیلائے گا۔ حضرت مسیح کے اس قول کے

باوجود کہ وہ غیر یہودی لوگوں کے لئے مبعوث نہیں ہوئے ہیں، انجیل متیٰ میں اِس پیشین گوئی کو حضرت عیسٰی کی طرف منسوب کیا ہے (اگرچہ آغازِ اسلام کے زمانے کے مدینہ منورہ میں رہنے والے یہودی اشعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی میں پیغمبرِ اسلام کی آمد کی بشارت پاتے تھے۔) اُن کی ماں کے شوہر کو بڑا اہمی دکھایا گیا۔ حضرت عیسٰی کی ولادت کا 'بیت لحم' میں ہونا متیٰ نے اِس لئے لکھا ہے کہ میکا (MICAH) نبی کی کتاب (۵/۲تا۲) میں یہودیوں پر حکمرانی کرنے والے ایک بادشاہ کی جائے پیدائش کا نام بیت لحم افراطہ دیا گیا ہے اور متیٰ نے اِس میں تصرّف کر کے بیت لحم یہودیہ لکھا۔ سید احمد خاں (ص ۱۵) کہتے ہیں کہ یہودیا کا بیت لحم الگ مقام ہے، اور افراطہ کا بیت لحم دوسری جگہ ہے۔

سید احمد خاں نے "عمانوئیل" سے بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس مرکب لفظ کے معنیٰ ہیں "اللہ ہمارے ساتھ ہے" (ان اللہ معنا) اور عیسائی شارح نے اس کے معنیٰ یہ لکھے کہ خدا حضرت عیسٰی میں حلول کرے گا۔ پھر آخر میں اپنا ذاتی خیال ظاہر کیا کہ "ہمارے ساتھ کلمۃ اللہ جسمِ انسانی میں" یا "روح اللہ ہستیٔ انسان میں" ہے۔

ص: ۴۴ سے انجیل متیٰ کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے، اور ولادت مسیح کے وقت وقوع پذیر ہونے والے معجزوں میں سے ایک کا ذکر ہے کہ ایک خاص ستارے کے طلوع کی تعبیر میں چند مجوسی مشرق سے آئے اور تلاش شروع کی کہ نوزائیدہ بچہ کہاں ہے؟ اور بادشاہ ہیروڈ کو بتایا کہ وہ بچہ یہودیوں کا بادشاہ ہوگا۔ اِس لئے ہم اس کو دیکھنے آئے ہیں تاکہ اس کی عبادت (سجدہ) کریں۔ بادشاہ نے اس خوف سے کہ اس کی سلطنت چھن جائے گی۔ یہ حکم دیا کہ سارے نومولود بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس پر یوسف نجّار اپنی بیوی حضرت مریمؑ اور بچے حضرت عیسٰی کو ساتھ لے کر بھاگے اور مصر میں پناہ گزیں ہوئے تاآں کہ ہیروڈ کی وفات ہو جائے۔

اور ص ۶۱: لفظ "نصرانی" اور نصاریٰ پر جو عیسائی کا مترادف ہے، بحث کے ساتھ یہ باب ختم ہوتا ہے۔

تیسرا باب ص ۶۲ و مابعد: حضرت یحییٰ کے حالات، اُن کی پند و نصیحت، ان سے حضرت عیسٰی کا روحانی تعلیم پانا اور بپتسمہ کے لئے دریائے اردن میں گناہوں سے پاک ہونے سے بطور رمز

عمل کرنا پھر خود بھی وعظ و نصیحت شروع کرنی مراد ہے۔

ص ۸۴، (درس ۱۱ میں) ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت یحییٰ اپنے بعض مریدوں کو بپتسمہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لیکن وہ جو میرے بعد آنے والا ہے مجھ سے بھی بڑا ہے، میں اُس کی جوتیاں اُٹھانے کے بھی لائق نہیں۔ وہ تم کو آگ سے روح القدس میں غوطہ دلائیگا"

سید احمد خاں نے اس کی تاویل کی کہ یہ فروسی اور صدوقی مریدوں کو حیرت میں ڈالنے کے لئے فرمایا تھا اور آنے والے سے مطلب، عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ ہیں۔

ص ۸۷، (درس ۱۶ میں ہے کہ) حضرت عیسیٰ اصطباغ پر دریا سے باہر آئے تو آسمان سے آواز آئی کہ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں راضی ہوں" عیسائی اس سے تثلیث کا مفہوم لیتے ہیں سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ "باپ" سے مُراد رب اور پروردگار ہے، بیٹے سے مراد مقبول بندہ۔ پھر بائبل ہی سے بیٹے کے لفظ کے استعمال کی اکیس مثالیں دی ہیں۔

ص ۹۸ سے چوتھا باب شروع ہوتا ہے کہ اصطباغ کے بعد حضرت عیسیٰ بیابان میں معتکف ہوئے۔ چالیس دن تک نہ کچھ کھایا اور نہ پیا۔ پھر اُنھیں بھوک لگی تو اُن کی آزمائش کے لئے شیطان آیا اور طرح طرح سے چاہا کہ وہ کفر کریں مگر وہ ثابت قدم رہے۔ اِس سے شیطان ناکام ہو کر چلا گیا اور فرشتوں نے آکر حضرت عیسیٰ کی خدمت کی۔ اس اثنا میں ملک کے ظالم بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کو قید کرنا چاہا۔ یہ سُن کر حضرت عیسیٰ علاقہ جلیل میں چلے گئے اور وہاں وعظ و نصیحت میں مشغول ہوئے جس کی اشعیاہ نبی نے پیشین گوئی کی تھی کہ: "توبہ کرو آسمان کی بادشاہت نزدیک ہے" اوّلین ایمان لانے والے دو مچھیرے تھے پھر دیگر لوگ ایمان لاتے رہے (ص ۹۸)

پھر انجیل متی کا پانچواں باب (ص ۹۹ - ۱۲۹) جو حضرت مسیح کے پہاڑ پر وعظ کرنے یعنی اہم تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اِس میں حسنِ اخلاق کی تعلیم دی ہے جیسے غرور نہ کرو، حلیم الطبع رہو، نیکی کرنے کے خواہشمند رہو۔ پھر یہ کہ جو رحمدل ہوگا اللہ بھی اس پر رحم کرے گا اور جو صاف دل ہوگا وہ رویتِ باری سے مشرف ہوگا۔ پھر یہ اہم درس (نمبر ۹) کہ: "مبارک ہیں وہ جو صلح کرانے والے ہیں کہ وہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔"

اور یہ کہ مبارک ہیں وہ جو نیکی کرنے پر ستائے جاتے ہیں اور انھیں کو آسمان کی بادشاہت ملے گی (ورس ۱۰ صفحہ ۱۰۹) پھر ورس ۱۷ تا ۱۹ میں اعلان ہے کہ: "میں توریت اور انبیاء کی دیگر کتابوں کو منسوخ کرنے کے لئے نہیں آیا ہوں اور جو شخص اُن میں سے رتی برابر بھی کوئی حکم حذف کرے گا تو وہ آسمانی بادشاہت میں حقیر سمجھا جائے گا۔

پھر قتل وغصہ سے منع کیا اور زنا کی ممانعت کی اور ظلم پر صبر کرنے کی تلقین کی اور ورس ۳۸ تا ۴۲ میں کہا کہ ویسے تو آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت مگر میں بہتر سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی بُرا کرنا چاہتا ہے تو روکنے کی بھی کوشش نہ کرو بلکہ اگر کوئی تمہارے گال پر ایک طمانچہ لگائے تو دوسرا گال پیش کرو۔ کوئی تمہارا کوٹ لینا چاہے تو اسے اپنا فرغل بھی دے دو۔ کوئی تمہیں بیگار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو میل جاؤ۔

ورس ۴۳ تا ۴۵ میں اپنے ہمسائے سے محبت کرنے اور دشمن سے نفرت کرنے کا بیان ہے حضرت عیسٰی کے خیال میں دشمن سے محبت کرو اور اس کے لئے برکت کی دعا کرو کہ تم اپنے اس باپ کی اولاد ہو جو آسمانوں میں ہے کیونکہ وہ سورج کو بد اور نیک دونوں پر نکلواتا ہے اور بارش عادل اور ظالم دونوں پر برساتا ہے۔ ورس ۴۸: اس لئے تم بھی ویسے ہی مکمّل ہو جیسا کہ تمہارا وہ باپ کامل ہے جو آسمان میں ہے۔

اس پر یہ باب ختم ہو جاتا ہے ہر نصیحت کے ساتھ سیداحمد خاں نے اکثر قرآن وحدیث کے شواہد پیش کئے ہیں اور بعض وقت سابقہ قانون یعنی توریت کے حوالے بھی دیے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبوت اور تبلیغ کا حکم پالنے کے بعد حضرت عیسٰی کا یہ اولین وعظ تھا جس کو بہت فصیح وبلیغ اور موثر بنانے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کو پورے طور پر سمجھنا عام انسان کی استطاعت سے باہر ہے۔ تفسیر بائیبل کی تینوں جلدوں کے مطالعے سے ہمیں سیّداحمد خاں کے اسلوب اور طرز فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اُن کا یہ امتیاز ہے کہ وہ مُسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہودیوں، نصرانیوں کی مقدس کتابوں کی تفسیر لکھی اور مشترک اجزاء کی اساس پر تاثر قائم کیا کہ مذکورہ واقعات کے متعلق قرآنی بیانات جدید سائنس سے قریب تر ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ جدید ذہنیت کی تشفی کر سکیں۔

الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ

سید احمد خاں نے لندن کے دورانِ قیام سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف ماحومیت" (چار جلدیں ۱۸۵۵ء - ۱۸۶۱ء) کی تردید میں بارہ مقالے معہ چارٹ، نقشوں اور تصاویر بزبانِ انگریزی "۱۸۶۹ء ۔ ۱۸۷۰ء" میں شایع کئے، اس سلسلے میں انھیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے متعلق محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ :

"ایک انگریزی خواں اور ایک طالب علم جو مقامات نشاں دادہ کو کتب میں سے تلاش و نقل کر سکتا میرے ساتھ ہوتے تو ایک برس میں اس کا جواب لکھ لیتا۔ اب نہیں ہو سکتا مگر میں اس کے مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ رہا ہوں۔ . .

. . . . . میری دانست میں نہایت خیر خواہی اسلام کی اور سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں چھاپی جاوے اس لئے انگریزی چھاپنا شروع کر دیا اور اردو ابھی ملتوی ہے۔ علاوہ اس کے انگریزی عبارت لکھنے والے عمدہ اور کم قیمت پر یعنی بہ نسبت ہندوستان یہاں ملتے ہیں جو شخص کہ میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے اس کی لیاقت کا کوئی انگریز ہندوستان میں نہیں ہے اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔" [1]

انگریزی ترجمہ کی نظر ثانی اغلباً سید محمود نے کی ہوا اور اس کے مکمل ہونے پر خوش ہو کر انھوں نے مزید لکھا :

"میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔

---

[1] سر سید کے خطوط مرتبہ مولوی وحید الدین سلیم۔ حالی پریس پانی پت — صفحہ ۲۱ - ۲۸

جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میں نے ہاتھ چومے اس کی لذت میں جانتا ہوں .... کتاب جلد بندی سے تیار ہو گئی اور کتب فروش کی دوکان میں فروخت کو رکھی گئی۔"[1]

مجلد بارہ کتابچوں کے سرورق پر تصویر میں ایک اونٹ کھڑا ہے اور اس کے نیچے ایک سطر عربی میں ہے" فانظر الی الابل کیف خلقت" جس کے معنی ہیں" دیکھ اونٹ کو کہ اسے کیسے پیدا کیا گیا ہے" قرآن آیت ۸۸/۱۷۔ اس کے دیباچہ میں ۲ر مارچ ۱۸۵۷ء کی تاریخ درج ہے۔

ولیم میور کی کتاب انگریزی میں تھی جو قدیم اسلامی (عربی) ماخذوں پر مبنی تھی۔ اُن میں سے متعدد اس وقت چھپے بھی نہ تھے اور ان کے مخطوطے ہندوستان میں دستیاب نہ تھے۔ سید احمد خاں کے انگریزی داں دوستوں نے جب اس کے مندرجات سے آگاہ کیا تو انھیں شدّت سے احساس ہوا کہ اس کا جواب دیا جائے اور شاید وہ اس کام کے لئے مناسب شخص ہوں۔ اپنے لئے انھوں نے اس کا ترجمہ فارسی میں کروایا۔ مطلوبہ تردید کے لئے ضرورت تھی کہ قرآن اور بائبل کے مماثل بیانات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ قرآن کی فضیلت ثابت ہو سکے۔ وہ "تبیین الکلام" لکھ چکے تھے انھیں اندازہ تھا کہ متعلقہ تفسیری کتب ہندوستان میں کم ہیں اس لئے سید احمد خاں نے یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کا سفر کیا اور وہاں تقریبًا سوا سال تک اہم کتب خانوں، کتب فروشوں کی دوکانوں اور مستشرقین سے استفادہ کرتے رہے۔

اس سلسلے میں ان کے زمانے کے عوامل کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

(الف) ولیم میور کی شخصیت معمولی نہ تھی وہ ۱۸۶۵ء میں حکومت برطانیہ کے معتمد محکمہ خارجہ تھے اور ۱۸۶۸ء میں صوبجاتِ شمال مغربی (یوپی) کے لیفٹیننٹ گورنر متعین کیے گئے۔

(ب) اس زمانہ میں سید محمود کو ایک وظیفہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ملا کہ وہ انگلستان جا سکیں۔ اندیشہ تھا کہ سید احمد خاں کی تردید سے وہ منسوخ نہ ہو جائے۔

(ج) اسلامی علوم سے متعلق سید احمد خاں کو اپنی بے بضاعتی کا احساس تھا انھوں نے

---

[1] سید احمد خاں کے خطوط مرتبہ مولوی وحید الدین سلیم حالی پریس پانی پت — صفحہ ۶۴-۶۵

اپنے عالم دوستوں با خصوص محسن الملک سے مطلوبہ معلومات معہ مواد فراہم کرنے کی ضرورت محسوس کی اور ان سے مدد حاصل کی ۔

(د) جس قسم کی کتاب لکھنے کا انھوں نے ارادہ کیا تھا اس کے لئے نہ صرف انگریزی اور عربی جاننا ضروری تھا بلکہ یونانی، لاطینی، عبرانی اور شاید جرمن اور فرانسیسی بھی، وہ نہ صرف غلط اعتراضوں کی تردید بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو تقابل سے اسلام کی طرف راجع کرنا چاہتے تھے ۔

(ح) انھوں نے تامل نہیں کیا کہ ذاتی کتب خانہ، اثاثہ اور گھر بیچ ڈالا جائے اور یہ بھی کافی نہ ہو تو دوستوں سے قرض لیا جائے مگر جوابی کتاب کے چھپنے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔

سید احمد خاں نے ہندوستان آ کر انتظار کیا کہ اس شایع شدہ تصنیف کا انگلستان اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں کیا ردعمل ہوتا ہے؛ انھوں نے دوسری جلد کے چھاپنے کا بھی وعدہ کیا مگر اس کی نوبت نہ آئی اور اردو مسودے کو انگریزی ایڈیشن کے سترہ سال بعد ۱۸۸۷ء میں شائع کیا۔[1] لندن میں انھوں نے اس کا نام "مواعظ احمدیہ" تجویز کیا تھا مگر کتاب جب منظر عام پر آئی تو یہ "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ" سے موسوم تھی ۔ وہ اس کی طباعت کے متعلق اطلاع دیتے ہیں :

"الحمد للہ کہ کتاب خطبات اردو زبان میں مرتب ہو کر چھپ گئی ۔ انگریزی پڑھنے والے جب اس اردو کتاب کو انگریزی سے جو ۱۸۷۰ء میں چھپی ہے مقابلہ کر کے پڑھیں تو علاوہ اس اختلاف کے جو انگریزی زبان کی طرز تحریر اور اردو زبان کی طرز تحریر میں ہے اس اردو زبان کی کتاب کو زیادہ تر وسیع پاویں گے ۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انگریزی کتاب درحقیقت بطور خلاصہ ان مضامین جن کی یادداشت اول اردو زبان میں لکھی گئی تھی ۔ بنظر تسہیل ترجمہ انگریزی مرتب کی گئی تھی اور اس اردو کو ہم نے اپنی اردو یادداشتوں سے مرتب کیا ہے اور اس میں مضامین کو اسی وسعت سے کہ یادداشتوں میں تھے،"[2]

ولیم میور[3] آنحضرت کا نام "ماحومیت" لکھتا ہے محمد نہیں ۔ اس کی وجہ یہ بیان کی

---

[1] الخطبات الاحمدیہ پہلی بار "تصانیف احمدیہ" جلد دوم میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ سے ۱۸۸۷ء میں طبع ہوئی۔

[2] سید احمد خاں ۔ تصانیف احمدیہ حصہ اول جلد دوم مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۳ء آخری صفحہ ۲۲۹

[3] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مطابق ولیم میور کی ولادت ۱۸۱۹ء میں گلاسگو میں ہوئی اور وفات ۱۹۰۵ء میں ۔ اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس میں منتخب کیا گیا اور ۱۸۳۷ء تا ۱۸۷۶ء

کہ انگریزی میں یہی املا (MAHOMET) معروف ہے اور پیغمبر کے لئے مخصوص ہے۔ محمد نام کے اور لوگ بھی ہوتے ہیں وہ چاہتا تھا کہ اس کے ہم وطن انگریز ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں۔ جن کے باعث پیغمبر اسلام اور ان کے خلفائے کامیابیاں حاصل کیں۔ اس نے قبل اسلام کے عربوں خاص کر اہل مکہ کی تجارتی سرگرمیوں کے متعلق وسیع اور عمیق انداز میں غیر جانبداری سے لکھا اور اسلام کی قدیم تاریخ سے واقعات کو معروضیت سے پیش کیا۔ وہ آنحضرت کے لئے پیغمبر کا لفظ بکثرت استعمال کرتا ہے۔ ہم ولیم میور کے اخذ کردہ نتائج سے متفق نہ ہوں مگر اسے شر پسندی اور رشدت آمیزی کے لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ حضرت محمد کی سوانح عمری غیر مذہب اسلام پر متعدد کتابیں مغربی زبانوں میں موجود ہیں جب اُن سے مقابلہ کریں تو میور کی کتاب اتنی ہمدردی سے لکھی گئی ہے کہ کہیں کہیں اسلام کا دفاع معلوم ہوتی ہے۔

"الخطبات احمدیہ" کے بارہ مقالے مندرجہ ذیل موضوعات پر ہیں۔ اس کا جو اردو ایڈیشن[1] ہمارے سامنے ہے اس میں پانچ سو بیس ۵۲۰ صفحات ہیں اور فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

۱۔ جغرافیہ جزیرہ ہائے عرب مع نقشہ عرب۔

۲۔ قبل اسلام کے عربوں کے رسم و رواج۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ہندوستان میں ممتاز عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۸۶۷ء میں "سر" کا خطاب دیا گیا۔ اپنی منصبی مصروفیتوں کے دوران اُس نے عربی، فارسی عبرانی اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ اپنی مادری زبان انگریزی کے علاوہ دیگر یورپین زبانوں سے بھی واقف تھا۔ وہ اپنے آبائی مذہب عیسائیت پر ایمان رکھتا تھا اور باعمل تھا۔ اس نے چھ سات کتابیں لکھیں مگر اہم ترین تصنیف "لائف آف ماحومیت" ہے جس کا نظر ثانی کے بعد مختصر کر کے صرف چوتھائی حصہ باقی رہ گیا اور اب یہی ایڈیشن ملتا ہے اس کمی بیشی کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ میور نے پیغمبر اسلام کی ضرورت سے زیادہ مدح و ستائش کی تھی تاکہ اس کے خراب اثرات کو مغربی قارئین پر کم کیا جا سکے وہ پیشہ ور مستشرق نہ تھا۔

[1] سر سید احمد خاں۔ الخطبات الاحمدیہ۔ نفیس اکیڈیمی۔ کراچی نمبر ۱۔ ۱۹۶۴ء۔

(۳) قبلِ اسلام عرب کے مذاہب۔

(۴) اسلام ساری انسانیت کے لئے رحمت ہے اور سابقہ انبیاء کے مذاہب کی حمایت و مدافعت کرتا ہے۔

(۵) کتبِ احادیث و تفسیر و فقہ کے بیان میں۔

(۶) مذہب اسلام کی روایتوں کی اجازت اور ان کے رواج کی ابتدا۔

(۷) قرآن کا نزول کس طریقے سے ہوا۔

(۸) قبلِ اسلام کا کعبہ اور اس کے گذشتہ حالات۔

(۹) رسول اللہ کے نسب نامے کے بیان میں۔

(۱۰) توریت اور انجیل میں آنحضرت کی بشارت۔

(۱۱) شق صدر کی حقیقت اور معراج کی ماہیت کا بیان۔

(۱۲) آنحضرت کی زندگی کے ابتدائی بارہ سال کے واقعات۔

"خطبات احمدیہ کا ولیم میور کی کتاب کی فہرستِ مضامین سے مقابلہ کریں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ بذاتِ خود یہ بارہ خطبے سید احمد خاں کے حصول مقصد کے لئے ناکافی ہیں مثلاً اس میں عربوں کی تجارتی سرگرمیوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ جن پر ولیم میور نے بڑا زور دیا تھا۔ اُس کے خیال میں یہ ہی پیغمبرِ اسلام کی کامیابی کا اولین سبب تھیں۔ ولیم میور نے اپنی طرف سے اسلام پر کوئی خاص اعتراض نہیں کیا بلکہ اس نے قدیم مورخوں کے بیانات کو محض نقل کر دیا ہے۔ ان سے چونکہ سید احمد خاں متفق نہ تھے اس لئے طویل بحث کی گئی ہے جس سے اُن کے خیالات کی توجیہ تو ہو جاتی ہے لیکن ولیم میور کی تردید نہیں ہوتی۔

یہاں ان خطبات کا مختصر جائزہ لیا جائے گا اور اگر ہمیں سید احمد خاں کی تحریر و استدلال میں کوئی خامی نظر آئی تو ضمناً اس کی نشاندہی بھی کی جائے گی۔

ص ۵۴ کا حاشیہ: حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ کو حضرت ابراہیم نے گھر سے نکالا تو اُس وقت اُن کی عمر سولہ سال کی تھی۔ بائیبل کا یہ بیان اسلامی ماخذوں، بخاری کے بالکل برخلاف ہے۔ سید احمد خاں نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ حدیث نبوی کی کتابوں کے مقابلے

میں کیوں بائیبل زیادہ قابل اعتماد ہے۔

حضرت اسماعیل کا قصّہ عہدِ عتیق میں بہت ہی کم قابل اعتماد ہے۔ کیونکہ وہ متضاد بیانات سے لبریز اور ناممکن روایتوں کا حامل ہے۔ مثلاً کتاب پیدائش (۱۶/۱۶) میں صراحت ہے کہ حضرت اسماعیل اپنے باپ حضرت ابراہیم کے بڑے بیٹے ہیں اور (۵/۲۱) میں بیان ہوا ہے کہ حضرت اسحاق دوسرے بیٹے اس کے باوجود کتاب پیدائش (۲/۲۲) ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیم کو آزمانا چاہا تو اس نے کہا "اب اپنے اکلوتے بیٹے اسحاق کو لے اور موریا کے علاقے کو جا اور وہاں اُسے ان پہاڑوں پر جو میں تجھے بیان کروں گا آگ کے ساتھ قربان کر"۔ اگر حضرت اسحاق دوسرے بیٹے تھے تو وہ اکلوتے بیٹے ہو نہیں سکتے بجز اس کے کہ پہلا بیٹا (حضرت اسماعیل) فوت ہو چکا ہو مگر ایسا نہیں ہوا تھا اور کتاب پیدائش (۹/۲۵) ہی میں ہے کہ حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی تو تدفین میں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق دونوں شریک تھے اس سے یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ آجکل کی بائیبل میں اکلوتے بیٹے کے ساتھ "اسماعیل" کے لفظ کو عمداً بدل کر وہاں اسحاق لکھ دیا گیا ہے یا یہ کہ وہاں کوئی نام درج نہ تھا اور اسحاق کے لفظ کا اضافہ کر دیا گیا اور کتاب پیدائش ۲۹/۲۲ نیز کتاب اعداد ۳/۱۲، ۸/۱۷ کتاب حزقیل ۲۰/۲۶ میں وہ حکم دہرایا گیا ہے کہ بڑے بیٹے کی قربانی کی جائے اور اسحاق بڑے بیٹے نہ تھے۔ بلکہ دوسرے بیٹے تھے۔ مزید برآں اس سلسلے میں کتاب پیدائش (۹/۲۱) کی یہ روایت معقول نہیں معلوم ہوتی کہ جس دن حضرت سارہ نے " ابراہیم سے کہا کہ "اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال باہر کر تا کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ (نیز) وارث نہ ہو"۔

(۱۰/۲۱) حضرت اسحاق کی دودھ چھڑائی کے وقت انسانی کمزوری (اور جلن) کی بنا پر حضرت سارہ کو ترغیب ہو سکتی تھی کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو گھر سے نکالا جائے مگر اس میں اندرونی تضاد ہے۔ کسی لونڈی سے پیدا شدہ بچے کو باپ کی وراثت میں حصہ نہیں ملتا اگر وراثت میں شرکت کا خوف تھا تو اس کے معنی ہیں کہ حضرت ہاجرہ لونڈی نہ تھیں رابی سالومون نے بائیبل کی مشہور شرح لکھی اس میں صراحت کے ساتھ ہے کہ حضرت ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھیں اور فرعون نے اپنی بیٹی کو حضرت ابراہیم کی خدمت میں پیش کرتے

وقت اپنی بیٹی کو مخاطب کرکے کہا۔ "اس گھرانے میں خدمت گزار رہنا تیرے میرے محل میں شہزادی رہنے سے بہتر ہے"۔ صحیح بخاری میں بھی حضرت ہاجرہ کے متعلق ہے کہ حضرت ابراہیم و حضرت سارہ کی خدمت پر مامور کیا (اخدمھا) کے الفاظ ہیں۔ لونڈی کا لفظ مطلق نہیں۔ "لونڈی" کا لفظ سارہ نے خفگی کے عالم میں تحقیر کے لئے استعمال کیا ورنہ بائبل میں عام طور پر حضرت ہاجرہ کے لئے "مصری خدمت گزار" کا لفظ آیا ہے۔ اس دربدری کے وقت حضرت اسماعیل کی کیا عمر تھی؟ اور آثار و قرائن کیا تھے؟ بخاری میں اور دیگر اسلامی مآخذ کے مطابق ابھی وہ ایک شیر خوار بچہ تھے اور یہ کہ حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور اُن کے بیٹے کو محض یوں ہی گھر سے باہر نہیں نکالا جیسا کہ بائبل میں ہے بلکہ ان دونوں کو ساتھ لے کر، ربانی ہدایات کے مطابق صفا و مروہ (یہ موریاہ) کی پہاڑیوں تک آئے وہاں آزوقہ اور پانی چھوڑا جو اتنا تھا کہ بدوی قبیلہ کے وہاں سے گزرنے تک کافی ہو اور اس کے بعد حضرت ابراہیم فلسطین واپس چلے گئے۔ جاتے وقت انھوں نے حضرت ہاجرہ کو یقین دلایا کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ خدا کے احکام کے تحت تھا۔ بی بی پختہ ایمان رکھتی تھیں تقدیر پر راضی بہ رضا ہوگئیں اور کہا کہ خدا اسے ضائع نہیں کرے گا۔ ان کو مایوسی نہیں ہوئی اور زمزم نکلنے کے واقعات پیش آئے۔ بائبل میں ہے کہ حضرت اسماعیل کی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی قرآن (۳۷/ ۱۰۲ و مابعد) میں بیان ہوا ہے کہ جس وقت اکلوتے بیٹے کی قربانی کے حکم سے خدا نے حضرت ابراہیم کی آزمائش کرنی چاہی تو حضرت اسماعیل "دوڑ سکتے" تھے۔ گویا تین چار سال کے تھے اور سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے قرآن میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم خدا کی آزمائش میں پورے اُترے تو خدا نے نہ صرف بچے (حضرت اسماعیل) کی جان بچائی بلکہ حضرت ابراہیم کو جزا کے طور پر یہ خوش خبری بھی دی کہ ان کے ہاں ایک دوسرا بیٹا ان کی بانجھ بیوی (حضرت سارہ) سے پیدا ہوگا۔ اس طرح حضرت اسحاق کی ولادت اُس وقت ہوئی ہوگی جب حضرت اسماعیل زیادہ سے زیادہ پانچ برس کے ہوں گے اور حضرت اسحاق کی دودھ چھڑائی کے وقت (مکہ میں ہونے کی جگہ فلسطین میں مکان سے رخصتی کی روایت کو اگر درست مان لیا جائے تو) حضرت اسماعیل کی عمر سات سال کی ہو سکتی ہے، سولہ برس نہیں، بائبل میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے انھیں ماں کے کندھے پر بٹھایا اور حضرت ہاجرہ کو پانی کی ایک چھاگل دی اور حکم دیا کہ بچے کے

ساتھ گھر سے چلی جائیں۔ عیسائیوں کو بھی اس روایت کا قبول کرنا گراں گزرا۔ چنانچہ بائبل کا جب ولگیٹ WULGATE ترجمہ کیا گیا تو اس میں اس عبارت کی تصحیح کی کہ چھاگل کندھے پر رکھی اور بیٹے کو ہاتھ میں پکڑا دیا۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل بہت لاغر اور دُبلے پتلے تھے کہ سولہ سال کے باوجود ماں ان کو اپنے کندھے پر بٹھا سکتی تھیں۔ وہ ولیم میور پر تنقید کرنے اور اُسے بائبل کا اندرونی تضاد بتانے کی جگہ اس روایت کو قبول کر لیتے ہیں۔

ص ۷۶: سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ ۵۷۰ء میں ابرہہ اشرم نے بہت سے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا اور مفسرین کے مطابق ان ہاتھیوں میں سے ایک حبشہ سے آیا تھا" بہت سے ہاتھیوں کی روایت قرینِ قیاس نہیں، بلکہ مشتبہ ہے، جہاں تک حملہ کی تاریخ کا تعلق ہے وہ وہی سال ہے جب رسول اللہ کی ولادت ہوئی تھی یعنی ۵۶۹ء ولیم میور نے غلطی سے ۵۷۰ء لکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ کی وفات ۶۳۲ء میں ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی اور چونکہ عرب کی تقویم میں شمسی کا رواج تھا اور قمری مہینوں میں وقتاً فوقتاً ایک ماہ کا اضافہ کر کے شمسی سال کا تعین کیا جاتا ہے اور اس رواج کو رسول اللہ نے اپنی وفات سے صرف تین ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقعہ پر منسوخ فرمایا تھا۔ اس طرح رسول اللہ کی عمر ۶۳ سال کی تھی تو وہ قمری نہیں شمسی سال کے اعتبار سے تھی۔ سال وفات ۶۳۲ء میں سے ۶۳ سال حذف کریں تو تاریخ ولادت ۵۶۹ء ہوتی ہے۔

ص ۱۱۳: سید احمد خاں نے اظہار خیال کیا کہ قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں کہ حضرت ابراہیم کو کون سے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا؛ مگر جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ قرآن (۳۷/۱۱۲) کے مطابق جب حضرت ابراہیم بغیر تذبذب یا ناگواری کے بچے کی قربانی کا خدائی حکم بجا لائے تو خدا نے خوش ہو کر نہ صرف بچے کی جان بچائی بلکہ ایک دوسرے بیٹے کی ولادت کی خوش خبری بھی دی۔ اِس طرح حضرت اسحاق، جو فرزند دوم ہیں وہ بیٹا نہیں ہو سکتے جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ بائبل میں اندرونی تضاد ہے "اکلوتے بیٹے" اور "اسحاق" دونوں کا ایک ہی بیٹے پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایک اور اہم نکتہ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ یہودیوں کے ہاں تاریخ کے پُرانے واقعات کا جشن منانے کے لئے تقریبیں ہوتی ہیں لیکن اُن میں سے کوئی تقریب حضرت اسحاق کی قربانی دیئے جانے کے متعلق نہیں

ہے۔ اس کے برخلاف حضرت اسماعیل کی اولاد یعنی مکہ کے عرب اس کا جشن اسلام کے قبل ہی سے مناتے رہے ہیں اور یہ عید الاضحیٰ کی صورت میں ۱۰ ذی الحجہ کو قربانی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن (۳۷/ ۱۰۸) نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ جس بیٹے کو قربانی کے لئے پیش کیا جانا چاہیے تھا اس کے فدیے کو خدا نے ان کی آئندہ نسلوں پر بھی واجب کر دیا اور اسماعیلی لوگ اس کی تعمیل کرتے رہے۔

"کتب خمسہ"، جو بائبل کا قدیم ترین حصّہ ہے، حضرت موسیٰ کی طرف منسوب ہے، اس میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم کے یہاں اسماعیل نامی بیٹا پیدا ہوا، اس کے بعد ان کتابوں میں حضرت اسحاق کی اولاد کے واقعات بیان ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں حضرت اسماعیل کی اولاد میں پیغمبر حضرت محمدؐ کا نام کیسے آسکتا تھا۔ یہودی اور نصرانی مستشرقوں کا یہ خیال رہا ہے کہ حضرت محمدؐ کا حضرت اسماعیل کی اولاد میں ہونا اور ان کے سلسلہ نسب کو شمار کرنا محض قرآن کی اختراع ہے کیوں کہ ہزاروں سال کے نسب کو یاد رکھنا مشتبہ ہے۔ سید احمد خاں اس کے جواب اور اپنی تائید میں ریورنڈ فارسٹر کا "تاریخی جغرافیہ" کا ایک بیان نقل کرتے ہیں کہ "حضرت اسماعیل کے بیٹے قیدر (KEDAR) نے (کتاب پیدائش ۲۵/ ۱۳ میں مذکور) حقیقت میں حجاز میں سکونت رکھی اور یہ کہ یہ ایک ناقابل تردید واقعہ ہے۔"

ایک دوسرا مسئلہ اس سلسلے میں فاران کے صحرا کا ہے کیونکہ بائبل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ کو "فلسطین میں" گھر سے نکال دیا اور بی بی بیر شیبع (BEERSHEBA) کے صحرا میں بھٹکتی رہیں اور وہاں اُن کے پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا (دیکھئے کتاب پیدائش ۲۱/ ۱۴ تا ۱۶) پھر خدا نے بی بی کو ایک کنویں پر پہنچایا (۲۱/ ۱۹) اور بچہ صحرا میں پلا اور بڑا ہو کر ایک تیر انداز بنا۔ (۲۱/ ۲۰) اور غالباً یہ جگہ بیر شیبع کے قرب و جوار میں ہے اور "وہ پاران کے صحرا میں سکونت پذیر رہا" (۲۱/ ۲۱) ظاہر ہے کہ ولیم میور یہ قبول نہیں کر سکتے تھے کہ پاران سے مراد (جو عربی میں فاران ہوتا ہے) مکہ ہو اور جس کنوئیں کا ذکر ہے وہ بیر زمزم ہو سید احمد خاں نے بہت تلاش کے بعد ثابت کر دیا کہ مغربی تحقیق کے مطابق بھی "پاران" سے مراد مکہ ہوتا ہے اور یہ بھی اضافہ کیا کہ پاران نام کے کئی مقام ہیں۔

ص ۱۵۶ تا ۱۶۳: اسلامی روایات کے مطابق حضرت اسماعیل اور ان کی ماں مکہ میں بس گئے۔ چند سال بعد حضرت ابراہیم وہاں واپس آئے اور کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ اس سلسلے میں حجر اسود کا بھی ذکر ہے۔ سید احمد خاں یہ تو بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک میدان میں پڑا ہوا تھا لیکن یہ نہیں کہ کب سے؛ اسلامی روایات کے مطابق کعبہ کی تعمیر اولاً فرشتوں نے اس وقت کی جب حضرت آدم زمین پر آئے اور اس وقت ہی حجر اسود کعبہ کا جزو بنا۔ طوفان نوح کے وقت کعبہ ناپید ہو گیا تھا اور جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم سے کعبہ کی ایک اور تعمیر کی جو رسول اللہ کے زمانے میں، بعثت سے پانچ سال قبل ہوئی تھی۔ بائبل (پیدائش ۱۲/۷، ۱۲/۸، ۱۳/۱۸، ۲۲/۹) کے مطابق حضرت ابراہیمؑ جہاں بھی جاتے یا سکونت اختیار کرتے، خدا کی عبادت کے لئے ایک معبد تعمیر کر دیتے۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں کہ انھوں نے مکہ میں بھی اپنے بیٹے کے لئے ایک معبد تعمیر کیا ہو لیکن یہ قرینِ قیاس نہیں کہ انھوں نے مکہ میں، کعبہ کے علاوہ، کوئی دوسرا معبد تعمیر کیا ہو، جیسا کہ سید احمد خاں نے حجر اسود کے سلسلے میں خیال ظاہر کیا ہے۔

ص ۱۵۷: حضرت ابراہیم نے کعبہ کے لئے ایک ایسا حج تجویز کیا جس میں طواف کرنا ہوتا تھا۔ سید احمد خاں کہتے ہیں کہ عرب جاہلیت میں یہ طواف بالکل برہنہ ہو کر کرتے تھے کیونکہ وہ خدا کی عبادت کپڑوں کے ساتھ نہیں کرتے تھے کہ وہ ملوث ہوتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عام قاعدہ نہ تھا بلکہ ایسا شاذ و نادر ہوتا۔ ایک اور واقعہ تاریخ میں مذکور ہے کہ ایک عورت نے طلاق کی خواہش کی شوہر بڑی مشکل سے اس شرط پر آمادہ ہوا کہ اس کی بیوی طلاق کے بعد آئندہ کسی اور شخص سے نکاح نہ کرے ورنہ اسے کعبے کا سات بار طواف برہنہ ہو کر کرنا ہوگا۔ وہ اس پر آمادہ ہوئی اور اس کے نئے منگیتر نے انتظام کیا کہ وہ ایک دن بہت تڑکے کعبہ جائے جب کہ وہاں کوئی شخص نہ تھا اور اس طرح اس نے اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لئے بے جھجک برہنہ تیزی سے طواف کئے۔[۱]

یہودی قانون میں طلاق کی عام اجازت تھی۔ انجیل کے مطابق حضرت عیسٰی نے حکم دیا کہ زناکاری کے سوا کسی اور وجہ سے بیوی کو طلاق نہیں دی جا سکتی مگر اسلام نے طلاق کی

---

[۱] منقول از ابن حبیب کتاب المحبر

اجازت دی۔ اس بنا پر عیسائی مولفین اسلام پر طعن کرتے ہیں کہ وہ خلافِ اخلاق ہے مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اب وہ خود اپنے مذہب کی اس ممانعت کو ناقابلِ عمل پانے لگے ہیں۔

(ص ۱۵۹) پر سید احمد خاں ایک اور قسم کے طلاق یعنی "ظہار" کا ذکر کرتے ہیں جو اسلام سے قبل عربوں میں پائی جاتی تھی وہ اس کی تفصیل نہیں دیتے۔ اسلام میں ایسے طلاق کے بعد بھی مصالحت کی گنجائش ہے اور طلاق ظہار کو منسوخ کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ اخلاقی اصلاح کے لئے اس سلسلے میں قرآن (۵۸/۳-۴) نے حکم دیا ہے کہ طلاقِ ظہار کے بعد بیوی سے تعلقات پیدا کرنے سے پہلے مسلسل دو ماہ روزے رکھے۔

ص ۱۷۶ پر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ اسلامی طریقہ نماز صابی اور یہودی مذہب سے لیا گیا ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ صابی طریقہ کیا تھا لیکن یہودی سینچر کے دن اپنی عبادت گاہ میں جمع ہوتے ہیں اور کھڑے ہو کر ربی (امام) کی تلاوتِ توریت کو سنتے ہیں مگر اسلامی رکوع، سجدہ جیسی چیزیں ان کی عبادت میں نہیں ہوتی ہیں۔

ص ۱۷۹: سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ اسلام نے عیسائی مذہب سے دو عقیدوں کے سوائے کوئی اور چیز اخذ نہ کی ایک یہ کہ "اللہ کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل سے اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے پیار کر" (انجیل متی باب ۲۲۔ ورس ۳۷)

"دوسرا یہ کہ دوسروں سے ویسا ہی برتاؤ کرو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں"۔

(انجیل لوک باب ۶ ورس ۳۱) مگر یہ دوسری چیز کوئی عقیدے کا معاملہ نہیں بلکہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ایک نصیحت ہے اور اس کا انجیل سے بہت پہلے چین کے کنفوشس نے ذکر کیا تھا۔ اگر پیغمبرِ اسلام نے مماثل تعلیم دی تو مستعار لینے میں تو سبع کی روایت ملتی ہے۔

ص ۱۸۳ پر سید احمد خاں کے خیال میں اِسلام نے غلامی کو بالکل منسوخ کر دیا ہے۔

ص ۱۸۵: اُن کے نزدیک یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ انتظام مملکت فرائضِ نبوت کا جزو ہیں لیکن اگر کوئی پیغمبر سارے انسانوں کیلئے اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن (۳۳/۲۱) میں ہے تو یہ مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کے پیغمبر نے نہ صرف دینی تعلیم دی بلکہ ساتھ ہی ساتھ حکمراں اور سپہ سالار کی حیثیت سے بھی عملی نمونہ چھوڑا۔

ص ۱۸۸ پر سید احمد خاں نے واضح کیا کہ اسلام نے تجارت کو ٹیکسوں اور دشواریوں سے آزاد کر دیا۔ اسلام میں بھی درآمد پر اُس کے اپنے چنگی کے قواعد پائے جاتے ہیں۔ زراعت پر عشر بھی سارے باشندوں کے لئے نہیں ہے۔

ص ۱۹۵: حضرت عیسیٰ نے تعدد ازدواج کی ممانعت نہیں کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ سکوت کے ذریعے سے اُس کی ممانعت نہ کی، بلکہ ایک واضح اجازت بھی دی ہے چنانچہ انجیل (متیٰ ۲۵/ ۲-۱۲) میں دس عورتوں سے ایک شخص کے ایک ہی دن نکاح کرنے کا جو تمثیلی قصّہ بیان کیا گیا ہے اُس سے بہت سے عیسائی علمائے دین نے یہ قاعدہ استنباط کیا ہے کہ ایک آدمی ایک ساتھ دس عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔

اسلام پر اعتراض کے وقت عیسائی ان کے قانونِ مدنی اور قانون مذہبی میں فرق نہیں کرتے حالانکہ عملدرآمد اور رسم و رواج مختلف ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث کے احکام الگ چیز۔ ہمارے مصنف لکھتے ہیں کہ مذہب اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعددِ ازدواج کو روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کو پسند کیا ہے۔" (ص: ۱۹۶)

ص ۱۹۷: تعدد ازدواج پر بحث کے دوران سیدآحمد خاں نے اس امر پر توجہ دلائی وہ یہ کہ قرآن (۴/۳) نے جب تعدد ازدواج کی سابقہ غیر محدود تعداد کی اجازت کو بدل کر صرف چار تک محدود کر دیا تو اُس نے یہ بھی کہا:

" اور نکاح کرو ان عورتوں سے جو تمہیں اچھی لگیں دو، تین، چار۔ لیکن اگر تمہیں خوف یہ ہو کہ تم اُن میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک" اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ہی کرو تو بہتر ہے۔

ص ۲۱۶: ولیم میور نے اسلام پر نہ صرف تعدد ازدواج اور غلامی کے متعلق اعتراضات کیئے بلکہ اس پر بھی کہ اس میں رواداری نہیں۔ جواب میں سیّد احمد خاں کہتے ہیں "یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے کیا مراد ہے" ولیم میور نے اِس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اسلام میں ارتداد (تبدیل مذہب) پر سزا دی جاتی ہے۔ ارتداد پر سزائے موت رومی قانون اور متعدد دیگر قوانین میں بھی ہے۔ اسلام نے بھی اسے برقرار رکھا ہے۔

ص ۲۴۱: سیدآحمد خاں کے خیال میں محمد اسماعیل کی "بخاری تاریخ" مطلقاً قدر کے لائق نہیں اور وہ تفسیر قرآن کی کتابوں کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ اسرائیلیات سے مملو ہیں کتب تفسیر اور عام کتب تاریخ میں عموماً یہ قاری پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ سمجھ سکے کہ اسلامی کتابوں کا کون حصّہ

اسرائیلیات سے ماخوذ ہے؛ تاکہ اس کو ضرورت پڑنے پر آسانی سے رد کیا جا سکے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ رہا حدیث کی کتابوں کے متعلق (ص ۲۴۲) پر یہ کہنا کہ "وہ ایک فسانہ ہیں کہ وہ نہ تو صحابی کے دور میں مدون ہوئیں اور نہ تابعین کے دور میں"، لیکن شبلی، سلیمان ندوی اور اب حال میں مصطفیٰ اعظمی اور ان سے قبل خود اشپرنگر نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ حدیث نبوی کی تدوین کا کام عہد نبوی میں اور خود رسول اللہ کی اجازت سے شروع ہوا تھا۔

ساتویں خطبے (ص ۳۰۷: ۳۵۷) میں سید احمد خاں کو شکایت ہے کہ عیسائی عالم اسلام کے خلاف بے سروپا باتیں غیر ذمہ دارانہ طور پر کہتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایسے ہی چند اہم الزامات اور اتہامات کی پُر زور اور مدلل تردید کی جس میں ان کا انداز تحریر مدافعانہ اور معذرت خواہانہ نہیں اور نہ ہی انھوں نے عام طور سے جوابی اعتراضات کرنے کی روش اپنائی ہے۔

سید احمد خاں نے ہمفری پریڈ کی اس بات کو نہایت حیرت انگیز اور مضحکہ خیز قرار دیا کہ "محمد صلعم کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی اور انھوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا جس کا نام صندوقِ رسالت تھا اور ابوبکر نے جو ان کے جانشین ہوئے سب سے اول اس کو جمع کیا" اور گبن نے لکھا کہ "وجود قرآن بقول آنحضرتؐ یا ان کے متبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذاتِ الٰہی میں موجود ہے نور کے قلم سے لوح محفوظ پر لکھا ہے اور اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی حضرت جبرئیل فلک اول پر لے آئے تھے" (ص ۳۴۴)۔ وہ ولیم میور کی غیر جانب داری اور معقولیت پسندی کے قائل ہیں لیکن ان کو یہ گلہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں صرف ان روایات کو درج کیا جن کی صحت و درستی خود مسلمانوں کے نزدیک مشتبہ ہے۔

سید احمد خاں کا خیال ہے کہ "نہ صرف ولیم میور بلکہ دوسرے مستشرقین کو بھی لفظ منسوخ کے صحیح معنی سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ اس لفظ کے جو معنی عیسائی مصنفین سمجھتے ہیں ان معنوں میں قرآن مجید کی مطلق کوئی آیت منسوخ نہیں اور اگر اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تب بھی کوئی آیت عارضی مدعا کی قرآن مجید میں موجود نہ تھی اور نہ سب دائمی ترمیم مقصود تھی"۔[1]

---

[1] سر سید احمد خاں، خطبات احمدیہ، نفیس اکیڈمی، کراچی، اشاعت اول ۱۹۶۴ء ص ۲۴۲

قرآن مجید سے متعلق ولیم میور نے بقول سید احمد خاں ایک نئی اصطلاح "وحی کامل" وضع کی ہے جس سے اہلِ اسلام واقف نہیں اور نہ اُس کے قائل ہیں۔ میور کی اس سے مراد وہ وحی ہے جو محمد صلعم کے آخیر زمانے میں موجود اور مروج تھی۔ علاوہ اس کے جو شاید ضایع یا غارت یا غیر مستعمل ہو گئی ہو۔" اُن کا مزید خیال ہے کہ ولیم میور نے آیاتِ محکم کو وحی کامل سمجھا۔ آیات محکم کے وہ معنی نہیں ہیں جو انھوں نے سمجھے، "لیکن اگر ہم سر ولیم میور کی اصطلاح کو تسلیم کرلیں تو وحی کامل کا اطلاق اُن سب وحیوں پر ہوگا جو پیغمبرِ خدا پر نازل ہوئی تھیں اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ کبھی کوئی وحی ضائع یا غارت یا غیر مستعمل نہیں ہوئی ہے۔"[1]

سید احمد خاں نے مندرجہ بالا کے علاوہ اور بھی کچھ اعتراضات کے نہایت موثر اور مثبت جوابات دیے ہیں۔

آٹھویں خطبے میں ص ۲۵۸-۲۹۷ پر ہمارے مصنف کو اس بات پر سخت حیرت ہے کہ ولیم میور جیسے فاضل اور بڑی حد تک غیر متعصب شخص نے اپنی کتاب "لائف آف محمؐ" میں بلا کسی دلیل اور بغیر کسی وجہ کے ان تمام واقعات سے جن سے کسی مورخ نے انکار نہیں کیا، انکار کیا ہے اور ایک خیالی اور فرضی بات کو جو ان کے دل میں آئی حقیقتِ واقعہ قرار دیا ہے جس کی ہم تردید کرنا چاہتے ہیں۔"[2] وہ انگریز مصنف سے پوچھتے ہیں کہ انھوں نے مکہ کے قریب اسماعیل کے آباد ہونے یا یہ کہ وہ اہلِ عرب کے مورثِ اعلیٰ تھے، کو کیوں ایک فرضی اور غیر حقیقی بات کہا ہے؟ جب کہ ان کی بات کو تاریخی حقائق سے ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ عرب کی تمام تاریخیں جن کو عیسائی بھی تسلیم کرتے ہیں، اس بات پر متفق ہیں کہ وہ عرب کا مورث اعلیٰ تھا اور یہ ثابت شدہ حقیقت ولیم میور کے بے بنیاد انکار سے غلط ثابت نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنے دعوٰی کے ثبوت میں وزنی اور ناقابلِ تردید دلائل پیش کیے ہیں۔ اُن کے طویل جواب میں بیت اللہ اور اس سے متعلق تمام ضروری مقامات اور عمارات کی وہ تفصیلات ملتی ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور بہت از معلومات بھی۔

---

[1] سر سید احمد خاں: خطبات احمدیہ، نفیس اکیڈمی کراچی اشاعت اول ۱۹۶۴ء ص ۳۴۳

[2] " " " " " بلاسس اسٹریٹ کراچی نمبرا ۱۹۶۴ء ص ۲۹۸

نواں خطبہ (۳۹۸ - ۴۱۲) صرف چودہ صفحات پر مشتمل ہے اس میں دو شجرے درج ہیں ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام (۱۹۱۶ ق م) سے شروع ہو کر اُنہتر (۶۹) واسطوں تک عبداللہ پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے شجرے کا آغاز رسالت مآب سے شروع ہو کر سینتیس (۳۷) واسطوں سے مولف خطباتِ ہذا (یعنی سید احمد خاں) پر ختم ہوتا ہے۔

دسویں خطبہ (ص ۴۱۳ - ۴۶۴) کا تعلق اُن بشارتوں سے ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق ہیں۔ سید احمد خاں اس سلسلے میں یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر خدا کے نبوت سے سرفراز ہونے کی پیشین گوئیاں دُنیا کے کم و بیش تمام مذاہب کے صحیفوں سے ملتی ہیں۔ خاص طور سے توریت اور انجیل میں اس قسم کی بشارتوں کا جگہ جگہ ذکر ہے جن سے انکار صرف ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی ہو گی۔

مصنف خطباتِ احمدیہ نے آنحضرت کی نبوت کے سلسلے میں جو بشارتیں توریت اور انجیل میں ملتی ہیں اُن کی بڑی تعداد گیارھویں خطبے میں جمع کر دی ہیں۔ ہم یہاں دو بشارتیں نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایک توریت سے اور دوسری انجیل سے۔ اصل بشارتیں تو عبرانی میں ہیں۔ ان کا ترجمہ عربی اور اُردو میں بھی درج خطبہ ہے۔ یہاں اُن کا صرف اُردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

"میں نے تیری دُعا اسماعیل کے حق میں قبول کی۔ ہاں میں نے اسے برکت دی اور اُسے بار آور کیا اور اُسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اُس سے بارہ امام پیدا ہوں گے اور اس کو بڑی قوم کروں گا۔ (توریت کتاب اول باب ۲ - ۱۷) کہا اللہ نے ابراہیم سے تیری نظروں میں بُرا نہ معلوم ہو اس لڑکے اور اپنی لونڈی کی وجہ سے جو کچھ تجھ سے سارہ کہے اُس کی بات مان لے کیونکہ اسحاق سے تیری نسل کہلائے گی اور اس لونڈی کے لڑکے کو بھی ایک قوم کروں گا کیونکہ وہ تیری نسل ہے" (توریت کتاب اول باب ۲۱، ۱۲، ۱۳)[1]

ایک بشارت کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"جب بعد مصلوب ہونے اور قبر میں دفن کیے جانے کے حضرت عیسیٰ زندہ

---

[1] سر سید احمد خاں، خطبات احمدیہ، نفیس اکیڈیمی کراچی مارچ ۱۹۶۴ء، ۲۲۳

ہو کر اُٹھے اور حواریوں سے ملے اور اُن کے سامنے مچھلی کا ٹکڑا اور شہد کھایا تو
بیت ضیا میں جانے اور آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے انھوں نے حواریوں
سے یہ فرمایا اور دیکھو میں بھیجتا ہوں وعدہ اپنے باپ کا تم پر لیکن تم ٹھہرو شہر یروشلم
میں جب تک کہ تم پر عطا ہو قوت اوپر سے۔ انجیل لوقا۔ باب ۲۴ آیت ۴۹)"[1]

آخر الذکر بشارت کی تشریح کرتے ہوئے سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ "اب ہم کو اس شخص کی
تلاش کرنی مناسب ہے جس کے آنے کی حضرت عیسٰی نے بشارت دی۔ جب ہم اس آیت کو دیکھتے ہیں کہ حضرت
عیسٰی نے حواریوں سے فرمایا کہ اس کے وعدے کے آنے تک تم یروشلم میں ٹھہرے رہو۔۔۔۔ ٹھہرے رہنے
سے یہ مطلب نہیں ہے کہ جب تک وعدہ پورا ہو تم یروشلم سے وابستہ رہو اور اس کی عزت و تعظیم
جیسی کہ پیشتر سے کرتے آئے ہو کرتے رہو اُس کی طرف اپنا سر جھکاؤ اپنا منہ اس کی طرف رکھو
جب تک وہ وعدہ پورا ہو چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور وہ وعدہ
پورا ہوا۔[2]

سید احمد خاں نے اس خطبے کے پہلے حصہ میں وضاحت کر دی تھی کہ توریت اور انجیل میں
حضرت عیسٰی علیہ السلام اور رسول اللہ سے متعلق جو بشارتیں ہیں اُن کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو
اندازہ ہوتا ہے کہ "ہمارے پیغمبر صاحب کی بشارتیں حضرت عیسٰی کی بشارتوں کی بہ نسبت بہت
زیادہ روشن اور نہایت صاف صاف ہیں۔ جن کی صحت کو مخالف کا دل بھی قبول کر لیتا ہے"[3]

گیارہویں خطبہ (صفحہ ۴۶۴ تا ۴۹۷) میں آنحضرت محمدؐ کے سینۂ مبارک کے
شق کرنے کی حقیقت اور معراج کی اصلیت کا بیان ہے اور ان کی ماہیت واضح کی۔
(ص ۴۹۸-۵۲۰)

بارہویں اور آخری خطبے کا تعلق آنحضرت کی ولادت اور ابتدائی بارہ سالہ زندگی سے ہے۔

---

[1] سر سید احمد خاں۔ خطبات احمدیہ، نفیس اکیڈیمی کراچی مارچ ۱۹۶۴ء ص ۴۶۱
[2] " " " " " " " ص ۴۶۱-۶۲
[3] " " " " " " " ص ۴۱۸

صفحہ ۵۰۳ میں سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ کا بارہ سال کی عمر میں اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ ملک شام کا سفر کسی طرح ثابت نہیں مگر اس سفر کے واقعہ کا ذکر محدثین میں سے ترمذی او ر بیہقی نے کیا ہے اور مورخین میں سے ابن اسحاق، ابن سعد، ابن ہشام، ابن عسا کر الشامی اور مسعودی جیسے مشہور اشخاص نے کیا ہے۔

ولیم میور کے ایک جملہ کے ردعمل میں وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ قبل از وقت نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی بچہ آئندہ پیغمبر ہونے والا ہے اس لئے اس بچے کے اردگرد جو لوگ ہوتے ہیں وہ اُس کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں اُس پر زیادہ توجہ نہیں کرتے اور اگر توجہ بھی کریں تو اسی نوعمری کے زمانے میں اس سے بڑے کارنامے سرزد نہیں ہوتے۔ ولیم میور نے رسول اللہ کے اِس نوعمری میں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ملک شام کو جانے کے واقعے کو بڑی اہمیت دی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اِس سفر میں آنحضرت کی ملاقات بحیرا نامی راہب سے ہوئی تھی۔ ولیم میور کو اس ملاقات میں صرف یہ نظر آیا کہ آنحضرت نے اپنی ساری ربانی تعلیم (اسلام) اس وقت اِس راہب سے سیکھی تھی اور بعد میں اسے خدائی وحی کی طرف منسوب کردیا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت کی ملاقات مختصر تھی اور یہ خود ایک معجزہ ہوگا کہ ایک نوعمر بچہ اسلامی تعلیم کو اس مختصر وقت میں سیکھ لے۔ سید احمد خاں نے صراحت کی کہ یہ سفر اُن کی دانست میں پیش نہیں آیا۔ اِس لئے بحیرا سے سیکھنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

یہ کتاب نہ صرف ولیم میور کی تردید ہے بلکہ اس میں دیگر مغربی معترضین کے جوابات بھی دیے گئے ہیں مثلاً اشپرنگر گبن اور دیگر معترضین کی جو اختراع تھی کہ رسول اللہ کو مرگی کی بیماری تھی۔ دُنیا میں لاتعداد انسان مرگی کے مریض رہے لیکن اُن میں سے کسی نے بھی نبوت کا دعویٰ نہ کیا (نعوذ باللہ) اور حضرت محمد کو اس قسم کا کوئی مرض نہ تھا۔ وہ تندرست شخص تھے۔

(ص ۵۱۴ - ۵۱۶)

سید احمد خاں کی تحریروں سے ثابت ہے کہ وہ اسلام پر مستحکم ایمان رکھتے ہیں اور رسول اللہ کا بڑا ادب کرتے ہیں ان کی دلی آرزو رہی کہ معترضین کی مدلل تردید کریں اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے انھوں نے معروضی طرز بیان اختیار کیا۔

تفسیر القرآن وھو الھدیٰ والفرقان

یہ کتاب قرآن مجید کے اردو ترجمے اور تفسیر پر مشتمل ہے۔ سید احمد خاں کو بخوبی اندازہ تھا کہ اسلام میں قرآن کو کتنا اہم اور بنیادی مقام حاصل ہے۔ انھوں نے ۱۸۷۷ء میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی۔ ان کی یہ تفسیر سات جلدوں میں پہلی بار "تصانیف احمدیہ" میں شائع ہوئی جس کی ابتدا تیسری جلد ۱۸۸۰ء سے ہوتی ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ تفسیر القرآن جلد اول مشمولہ تصانیف احمدیہ (حصّہ اول جلد سوم)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ باہتمام شیخ علیم اللہ ۱۸۸۰ء۔ صفحات ۳۱۳۔
تفسیر سورۂ فاتحہ۔
تفسیر سورۃ بقرہ۔

۲۔ تفسیر القرآن جلد دوم مشمولہ تصانیف احمدیہ (حصّہ اول جلد چہارم)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ باہتمام لالہ گلاب رائے ۱۸۸۲ء۔ صفحات ۲۵۵۔
تفسیر سورۃ آل عمران۔
تفسیر سورۃ النساء۔
تفسیر سورۃ المائدہ۔

۳۔ تفسیر القرآن جلد سوم مشمولہ تصانیف احمدیہ (حصہ اول جلد پنجم)

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ باہتمام لالہ گلاب رائے ۱۸۸۵ء۔ صفحات ۲۹۳
تفسیر سورۃ انعام۔
تفسیر سورۃ الاعراف۔

۴۔ تفسیر القرآن جلد چہارم تصانیف احمدیہ (حصہ اول جلد ششم)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ باہتمام لالہ گلاب رائے ۱۸۸۸ء۔ صفحات ۱۹۳
تفسیر سورۃ انفال
تفسیر سورۃ توبہ۔
تفسیر سورۃ یونس۔

۵۔ تفسیر القرآن جلد پنجم مشمولہ تصانیف احمدیہ (حصہ اوّل جلد ہفتم)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ باہتمام شیخ علیم اللہ ۱۸۹۲ء صفحات ۲۰۷۔
تفسیر سورۃ ھود۔
تفسیر سورۃ یوسف
تفسیر سورۃ رعد
تفسیر سورۃ ابراھیم۔
تفسیر سورۃ الحجر
تفسیر سورۃ النحل

۶۔ تفسیر القرآن جلد ششم مشمولہ تصانیف احمدیہ (حصہ اول جلد ہشتم)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ باہتمام محمد امداد الدین ۱۸۹۵ء صفحات ۱۷۳۔
تفسیر سورۃ بنی اسرائیل

۷۔ تفسیر القرآن ہفتم مشمولہ تصانیف احمدیہ (حصہ اوّل جلد نہم)[1]

[1] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے سرسید روم میں "تفسیر القرآن" کی سات جلدیں موجود ہیں جن میں سے چھ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کی شائع کردہ ہیں اور ساتویں جلد ان کے انتقال کے بعد مطبع مفید عام آگرہ نے ۱۹۰۴ء میں چھاپی تھی۔

مطبع مفید عام آگرہ بہ تصحیح مولوی سید جلال الدین حیدر ۱۳۰۳ھ ۔ صفحات - ۱۶۹
تفسیر سورۃ الکہف
تفسیر سورۃ مریم
تفسیر سورۃ طٰہٰ

یوں تو سید احمد خاں اپنی متعدد تصانیف میں اسلام کے بیشتر مسائل سے متعلق اپنی آراء کا اظہار کر چکے تھے ۔ مثلاً غلامی، تعدّد ازدواج، وحی کی ماہیت، فرشتہ، شیطان اور معجزہ۔ جو لوگ ان کے خیالات پر اعتراض کرتے تھے وہ سب دلیل کے طور پر قرآن کی آیتوں کو نقل کر کے ان کو اپنے نظریہ کے مطابق معنی دیتے تھے چونکہ وہ ہر معترض کا جواب فرداً فرداً نہیں دے سکتے تھے ۔ اس لئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ خود قرآن پاک کی ایک ایسی تفسیر لکھدیں جس میں وہ اپنے نظریات کی بخوبی وضاحت کر سکیں ۔ انھیں کچھ ایسے علماء اور فضلا کی علمی استعانت حاصل تھی جن پر وہ کلی اعتماد کر سکتے تھے ۔ قرآن مجید میں ایک سو چودہ (۱۱۴) سورہ ہیں ۔ ان میں جملوں کی تعداد کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہے اور ہر جملے کو آیت کہتے ہیں ۔ سب سے چھوٹی سورہ یعنی کوثر میں صرف تین آیتیں ہیں سب سے بڑی سورۃ یعنی بقرہ میں دو سو چھیاسی اور یہ آیتیں بعض وقت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہوتی ہیں (جیسے سورۃ رحمان ۵۵/۱ میں) اور بعض وقت ایک سو تنتالیس (بلکہ اس سے زیادہ ۔ اگر ضمیر متصل والے لفظ کو ایک نہیں بلکہ دو شمار کیا جائے ۔ جیسے بہ، لھا وغیرہ) یہ طویل ترین آیت سورۃ بقرہ (۲/۲۸۲) میں ہے ۔ رسول اللہ کی ہدایت سے قرآن کی ایک اور طرح کی تقسیم بھی ہوئی ہے اور وہ سات منزلوں کی ہے ہر منزل میں کئی کئی سورۃ داخل ہیں تاکہ پورے قرآن کی (شروع سے آخر تک) ایک ہفتے میں تلاوت کی جا سکے ۔ ایک تیسری تقسیم تیس پاروں کی ہے تاکہ تلاوت ایک ماہ میں مکمل ہو سکے ۔ بظاہر یہ رسول اللہ کی معین کردہ نہیں کیونکہ اس میں مختلف ملکوں میں کچھ اختلاف بھی ہے کہ کونسا پارہ کس آیت سے شروع ہوتا ہے ؟

اُن کی تفسیر بغیر کسی تمہید یا مقدمہ کے شروع ہوتی ہے اور براہ راست پہلی سورہ سے آغاز کیا گیا ہے ۔ ہم ذیل میں صرف ان مضامین سے بحث کریں گے ۔ جہاں ان کا نقطۂ نظر عام تراجم

اور تفاسیر سے مختلف ہے سید احمد خاں نے (صفحہ ۲ پر) لفظ "سورۃ" کی تشریح کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں کچھ عبرانی بھی آتی تھی وہ لکھتے ہیں کہ اس اصطلاح کے مفہوم کے متعلق علماء میں اتفاق نہیں ہے کہ سورہ کا لفظ سور سے مشتق ہے جس کے عام معنی (سور البلد) شہر کی فصیل کے ہیں کیونکہ وہ کسی شہر کو اس کے اطراف کے دوسرے رقبوں سے منفصل کر دیتی ہے۔ بہ ظاہر انھیں یہ معنی قابل ترجیح معلوم ہوتے ہیں کہ "سورۃ" کو کسی کتاب کا باب قرار دیا جائے۔ مزید براں یہودیوں کا دستور عموماً یہ ہے کہ ہر باب کو اس کے پہلے لفظ سے موسوم کریں مثلاً کتاب پیدائش کا پہلا لفظ عبرانی میں "براشیت" ہے۔ اس لئے وہ اس کتاب کو "پیدائش" نہیں بلکہ "براشیت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے ہاں بھی پارہ سیقول، پارہ تلک الرسول وغیرہ کہنے کا رواج رہا ہے۔

انسان کا خدا سے قرب حاصل کرنے کا راستہ (سلوک) طویل ہی نہیں بلکہ ابدی ہے دیگر سفروں کی طرح جو انسان کرتا ہے اس مقدس سفر میں بھی وہ سارے لوازمات ہوتے ہیں۔ جن کی دوسرے سفروں میں ضرورت پڑتی ہے یعنی دن بھر چلنے کے بعد ایک منزل ہو جہاں وہ دم لے سکے اس لئے قرآن میں سات منزلیں ہیں۔

سید احمد خاں شروع ہی سے اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ بائبل میں یہودیوں نے عموماً کوئی تحریف نہیں کی جیسا کہ مسلمان عام طور پر خیال کرتے ہیں۔ اس خیال کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی بھی بطور رد عمل قرآن پر حملہ کرتے ہیں اور ہمارے مصنف کی رائے میں غیر مسلموں کو اس وجہ سے سہولت پیدا ہو گئی ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ میں اختلاف قرأت کی روایتیں ہیں جو قرآن کے ابتدائی مخطوطوں کے باعث پیدا ہوئی ہیں کہ ان میں الفاظ پر نقطے اور اعراب نہیں ہوتے تھے اور عربی زبان کی مقامی بولیوں میں بھی فرق تھا۔ نیز ان روایتوں کی بناء پر کہ قرآن کے بعض حصے منسوخ ہیں (ص ۳) سید احمد خاں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بائبل میں بھی بہ کثرت اختلافات روایات ہیں اور ہورن (HORN) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس کے چار سبب تھے: (۱) دو عبارتوں میں تضاد ہو تو لازماً ایک ہی صحیح ہو گی۔ (۲) ان مخطوطات میں کتابت کی غلطیاں تھیں جن سے نئے نسخے نقل کئے گئے (۳) نقل نویس نے خود ہی کسی عبارت کی تصحیح کر دی ہو (۴) فرقہ وارانہ مفادات کے باعث بھی بائبل میں بعض تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

آغاز اسلام میں عربی رسم الخط مستحکم نہ تھا اس کے باوجود سید احمد خاں کی رائے میں حضرت عثمان کے زمانے کا املاء قرآن کیلئے برقرار رکھنا چاہیے (ص ۶)۔ پھر وہ (ص ۹) کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے مماثل آیت زردشت کی اوستا میں بھی ہے جہاں رحمان و رحیم کے بعد "عادل" کا زائد لفظ ہے۔

جلد اول : صفحہ دس (۱۰) سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ رکھا ہے کہ داہنے ہاتھ کے صفحہ پر اصل عربی متن ہے اور مقابل کے صفحے پر اس کا اُردو میں ترجمہ اور تفسیر ہے اور فٹ نوٹ بھی۔ ہر سورہ کے آغاز پر پیچھے وہ پوری سورۃ کا خلاصہ دیتے ہیں۔ ان کے ماخذ تفسیر بیضاوی، کشف الاسرار، مجمع البیان، امام رازی کی تفسیر کبیر، ابن عباس امام مسلم، ترمذی، مشکاۃ المصابیح اور ابن عربی کی فصوص الحکم ہیں۔

سر سید کی رائے میں دعا سے تقدیر نہیں بدلتی۔ اس سے تسلی اور روحانی راحت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ بقرہ شروع کرتے ہوئے وہ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ بعض سورتوں (بشمول سورۃ بقرہ) کے آغاز پر جو حروفِ مقطعات (الٓمٓ وغیرہ) ہیں۔ اُن سے کیا مراد ہے؟ اور لکھتے ہیں کہ یہ اُن کاتبوں کے نام ہیں جنھوں نے رسولِ خدا کے املا کو قلمبند کیا تھا۔ (ص ۱۲)

ص ۱۴ پر وہ اس امر پر قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ سورۃ بقرہ کی دوسری آیت میں "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" کے لفظ آئے ہیں اور یہ مکمل قرآن کے نزول سے قبل کا واقعہ ہے۔

ص ۱۶ تا ۲۲ پر انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ جبر و قدر کے متعلق قرآن ساکت ہے اور یہ کہ انسانی طبیعت کے بارے میں مزید علمی تحقیق کی ضرورت ہے جس کے بعد ہم اِس قابل ہوسکیں گے کہ اس بارے میں کوئی رائے قائم کرسکیں۔ بہر حال خدا کسی کو کسی کام کے کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ لیکن سید احمد خاں بہ ظاہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یکے بعد دیگرے آنے والے اسباب کا اصلی مسبب خدا ہی ہے۔ ص ۲۳ میں آیت (۲/۱۴) پر وہ کہتے ہیں قرآن اللہ کا کلام ہے لیکن انسانوں کی زبان کے مطابق ہے۔ اس آیت پر اللہ اُن سے استہزاء کرتا

ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کو لفظی معنوں میں نہیں لینا چاہیئے، یہ کنایہ ہے۔

ص ۲۸ و ما بعد میں آیت (۲/۲۱ و ما بعد) کے سلسلے میں وہ ماخذ بیان کیئے بغیر اس بات کو دہراتے ہیں کہ "میں نبوت کو ایک فطری چیز سمجھتا ہوں" اور پیغمبر ماں کے پیٹ میں بھی پیغمبر ہوتا ہے اور اس لیئے وہ غلطی سے مبرّا ہوتا ہے۔ پیغبری اُن کی رائے میں ایک قدرتی ملکہ ہے (جو خاص خاص لوگوں کو ہی حاصل ہوتا ہے)، اور دیگر قوائے فطری ہی کی طرح پیغمبر ہی بھی پیغمبر کے اندر ودیعت ہوتی ہے۔ پیغمبری کی صلاحیت "ناموس اکبر" پر ان کی بیوی حضرت خدیجہ اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس تسلی کے لیئے لے گئیں تو وحی کا قصہ سُن کر ورقہ نے کہا کہ "جو کچھ تم نے کہا وہ اگر سچ ہے تو وہ "ناموس اکبر" ہے جو موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا ناموس ایک یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معنے "قانون" کے ہیں اور اصطلاحی معنے یونانی، سریانی وغیرہ میں "توریت" کے ہیں۔ اس کو جبریل فرض کر لینا غلط فہمی پر مبنی ہے اور خدا کا کوئی مستقل اور علیحدہ پیغام رساں نہیں تھا۔ خدا آواز اور زبان سے بالاتر ہے اور پیغمبر خدائی پیغام کو اپنی پیغمبرانہ صلاحیت کی بنا پر سُن لیتا ہے۔ اسی ملکۂ نبوت کا جو خدا نے انبیاء میں پیدا کیا ہے جبریل نام ہے۔" صفحہ ۳۰

ص ۳۳: قرآن کے اعجاز کا صرف فصیح و بلیغ زبان پر انحصار نہیں بلکہ اس کی اخلاقی تعلیم پر ہے جہاں تک توریت کا تعلق ہے اُسے حضرت موسیٰ نے خود تختیوں پر لکھا۔ (اگرچہ بائیبل میں صراحت ہے کہ خدا نے اُسے اپنی انگلیوں سے لکھا۔)

ص ۳۴ پر انگریزی لفظ "سارسین" جس کے معنی "عربوں" کے ہیں وہ تفسیر میں "سارقین" (یعنی چور ڈاکوؤں) سے خلط ملط ہو گیا ہے۔

ص ۳۵: آیت (۲/۲۲) کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ ان اصطلاحوں کا مطلب آرام اور تکلیف کی چیزیں ہیں اور ان کے جو اوصاف بیان کیئے گئے ہیں ان کو لفظی معنوں میں نہیں لینا چاہیئے۔

وہ ص ۴۲ پر آیت (۲/۲۴) کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

" مچھر یا اس سے زیادہ حقیر چیز کی مثال دینے میں خدا شرماتا نہیں یعنی جو مثال چاہے

دے، مچھڑ اس سے بھی زیادہ" پکتھال کے ترجمے میں الفاظ بالکل حذف کر دیے گئے ہیں اور صرف یہ لکھا ہے "مثال خود مچھر کی" (SIMILITUDE EVEN OF A GNAT)

قرآن میں سات آسمانوں کا ذکر آتا ہے سید احمد خاں (صفحہ ۴۶ پر) لکھتے ہیں کہ آسمان سے مراد سات سیارے (PLANETS) ہیں۔

ص ۴۸ تا ۵۴: ان کی رائے میں فرشتہ اور شیطان سے مراد قوائے فطری ہیں۔ فرشتہ کوئی الگ مخلوق نہیں ہے۔ تخلیق آدم کے سلسلے میں فرشتوں سے جھگڑا واقعی طور پر پیش نہیں آیا تھا وہ ایک استعارہ ہے۔

ص ۷۵ پر آیت (۲/۲۸) کے متعلق لکھتے ہیں کہ کسی چیز کی خاصیت کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ فرشتوں کے لئے نا ممکن تھا کہ ان ساری چیزوں کو جان سکیں جو دنیا میں موجود ہیں (یہاں وہ فرشتوں کے وجود کے قائل نظر آتے ہیں) سجدے سے مراد اطاعت کے ہیں۔

ص ۵۹ : ہبوطِ آدم (عالم بالا سے زمین پر گرنا) کوئی امر واقعہ نہیں بلکہ آدمی کی طبیعت و فطرت ہے "ہبط" کے معنی عربی میں نہ صرف گرنے کے ہیں بلکہ جانے کے بھی ہیں۔

ص ۶۸ ؛ جنت سے مراد صالح انسان کی طبیعت ہے "بہ فطرتِ انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے ؛

ص ۸۳ : کئی بار حضرت موسیٰ کی لاٹھی (عصا) کا ذکر آیا ہے۔ اس سے نہ صرف چٹان سے چشمے پھوٹتے ہیں بلکہ وہی عصا ایک اژدھا بھی بن جاتا ہے سید احمد خاں کا بیان ہے کہ وہ اژدھے کی شکل کی لکڑی تھی۔

ص ۸۶ تا ۱۰۰ ؛ حضرت موسیٰ کے دریا کو عبور کرنے کی طویل بحث ہے (آیت ۲/۴۹ ومابعد) وہ لکھتے ہیں کہ "فاضرب بعصاک الحجر" میں ضرب سے مراد مارنے کے نہیں ہیں بلکہ لاٹھی پر ٹیک کر چلنے اور سمندر کو عبور کرنے کے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ "فاضرب بعصاک الحجر" میں چٹان کو ضرب لگانے کا ایک خصوصی اور ذاتی نظریہ ہے جس کا وہ بار بار ذکر کرتے ہیں کہ عربی میں "ضرب" کے معنے صرف مارنے کے نہیں بلکہ سفر کرنے کے بھی ہیں اسی لئے جب کبھی حضرت موسیٰ کے سلسلے میں ذکر آتا ہے کہ حجر (چٹان) کو ضرب لگاؤ جس سے

چشمہ پھوٹ پڑے، یا بحر (سمندر) کو ضرب لگاؤ کہ وہ پھٹ پڑے اور خشک راستہ نکل جائے تو ہمارے مولف ترجمہ کرتے ہیں کہ لاٹھی پر ٹیک کر چلو تاکہ اِس مقام پر پہنچو جہاں اُس پانی کے چشمے موجود تھے یا سمندر پایاب تھا۔ وہ یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ سمندر کو عبور کرنا خلیج سویس میں مدوجزر کے باعث ہو سکتا ہے اور اس کے لئے کسی معجزے کی ضرورت نہیں۔ پھر یہ اضافہ کرتے ہیں: "بطلیموس کے مطابق بحرِ احمر میں تیس جزیرے پائے جاتے ہیں"

ص ۹۷: بنی اسرائیل کے عبورِ بحر کے متعلق مدوجزر کے نظریے کو مزید تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے دریا کو عبور کرنا بحرِ احمر میں جزر کے وقت نہیں ہوا ہوگا بلکہ دریائے نیل کی طغیانی کے زمانے میں جب فرعون بنی اسرائیل کے فرار کی خبر سُن کر تھیبس سے آیا تو اپنی فوج کے ساتھ اُن کے تعاقب میں روانہ ہوا اور جب ڈالٹا کے ایک علاقے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل وہاں سے جا چکے ہیں۔ اِس پر وہ ایک دوسرے علاقے میں جانے کے لیے نیل کی شاخ کو عبور کرتا ہے تو عین اُس وقت وہاں یکایک سیلاب آجاتا ہے اور وہ ڈوب جاتا ہے۔ اس کے محافظ غوطہ لگاتے ہیں تاکہ اُسے بچائیں۔ مگر نعش بعد از وقت ملتی ہے اور مردہ بادشاہ کے جسم کو مومیا کر روایتی رسم و رواج کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے۔

ص ۱۰۳: آیت ۲/ ۵۴ میں گاؤ سالہ پرستی کی سزا میں بنی اسرائیل کو "مار ڈالو اپنے آپکو" کے حکم کے دیے جانے کا ذکر ہے۔ سید احمد خاں کہتے ہیں "اُن ہی کی نسبت آیا پھر خدا نے تم کو معاف کیا"

ص ۱۰۵: خدا کی طور سینا پر تجلّی کا جو بیان ہے اُس میں آگ کا بھی ذکر ہے۔ سید احمد خاں کہتے ہیں کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کا واقعہ ہے۔

ص ۱۱۲: آیت ۲/ ۶۰ میں چٹان کو لاٹھی سے مارنے اور اُس میں سے بارہ چشموں کے پھوٹ پڑنے کا ذکر بھی ہے۔ سید احمد ان کی توجیہ کرتے ہیں کہ جس مقام پر حضرت موسٰی مقیم تھے اُس کے آگے ایک پہاڑ میں میٹھے پانی کے قدرتی چشمے بہہ رہے تھے اور حضرت موسٰی کو وحی آئی کہ سفر کرکے وہاں جاؤ۔ یہ نہیں کہ چٹان پر ضرب لگاؤ جیسا کہ مکہ معظّمہ کے زمزم کا معاملہ ہے پہلے وہ چشمہ تھا جو بعد میں کنواں بن گیا۔ اس طرح حضرت موسٰی کے یہ چشمے بھی کنوئیں بن

گئے۔ جب کوئی چشمہ خشک ہو جاتا ہے لوگ اسے کھودتے اور خیال کرتے کہ ذرا نیچے پانی مل جائے گا۔

ص ۱۱۶ : آیت ۶۵/۲ میں ہے کہ بنی اسرائیل سینچر (یوم سبت) کو جو عبادت کا دن تھا اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو سزا میں خدا نے ان کو بندر بنا دیا۔
اس پر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ ان کا تابعدار لوگوں نے بائیکاٹ کیا تو اس کو بندر بنا دیے جانے کا نام دیا گیا۔

ص ۱۲۰ ، آیت ۶۷/۲ میں اس بقرہ (گائے) کا ذکر ہے جس کے ذبح کرنے کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ سید احمد خاں اس کا ترجمہ سانڈ کرتے ہیں اور وہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ ایک سانڈ تھا جو افزائش نسل کے لئے رکھا گیا تھا اور بنی اسرائیل اس کی پوجا بھی کرنے لگے تھے سنہری گاؤ سالہ کا قصہ بائیبل میں مشہور و معروف ہے۔

ص ۱۲۲ ، آیت ۶۸/۲ میں قرآن نے ایک وارداتِ قتل کا ذکر کیا ہے۔ اس آیت میں ضمیروں کا مرجع معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں لکھا ہے کہ: "اس (واحد مذکر) کو اس (واحد مونث، جو جمع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے) کے ایک جزو سے مار۔ اس طرح اللہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے.... " سید احمد خاں کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں: اللہ واضح کرتا ہے یا بتاتا ہے کہ مقتول کا نامعلوم قاتل کون ہے۔

ص ۱۴۰ و مابعد : فرشتوں سے مراد اللہ کی صفتیں ہیں۔ انسانوں نے غلطی سے انکو ایک مستقل مخلوق قرار دے لیا ہے پھر وہ لکھتے ہیں اس طرح کے نظر نہ آسکنے والے مخلوق کا وجود ممکن تو ہے لیکن اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

ص ۱۵۴ : فرشتے کی بحث جاری رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ بائیبل میں فرشتے کا لفظ مختلف چیزوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وبا (بیماری) ہوا، رسول، پیغمبر، کاہن یعنی عبادت کرانے والا امام، اور ایک فرستادہ۔ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت یعقوب نے ایک بار پھر فرشتے سے کشتی لڑی۔

ص ۱۵۶ : آیت ۹۲/۲ میں ہاروت و ماروت کی کہانی ہے۔ ہمارے مولف کی رائے

ہیں وہ دو انسان تھے چونکہ قرآن ۶/ ۱۱۲ میں "شیاطین الانس والجن،، (یعنی انسانوں اور جنات میں کے شیطانوں) کا ذکر آیا ہے۔ اس طرح فرشتوں کو بھی انسانوں میں سے ہونا چاہیے اور چونکہ مذکورہ دو فرشتے شریر انسانوں کی طرح عمل کرتے ہیں اسی لئے وہ بھی انسان ہی ہونگے نہ کہ فرشتہ۔

ص ۱۶۲ تا ۱۶۹ : آیت ۲/ ۱۰۰ میں بعض آیتوں کے دیگر آیتوں سے منسوخ ہو سکنے کا ذکر ہے تو سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ نسخ کا تعلق اسلام سے قبل کی نازل شدہ کتابوں سے ہے اور یہ کہ خود قرآن مجید کے اندر کوئی نسخ شدہ آیت نہیں پائی جاتی ۔

ص ۱۷۴ : قرآن ۲/ ۱۱۸ میں مقام ابراہیم کا ذکر آیا ہے جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد خود عمارت کعبہ ہے، کوئی الگ چیز نہیں۔

ص ۱۹۱ : اسلام پر اس کے مخالفین جو اعتراض کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ صحیح اسلامی قوانین اور ان قواعد کو خلط ملط کر دیتے ہیں جو بعض فقہاء کے مستنبط ہیں۔

ص ۱۹۷ : قرآن ۲/ ۱۴۰ میں بیان ہے کہ : "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ (شخص یا چیز کو) اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو لیکن ان میں سے ایک فریق حق کو جان بوجھ کر چھپاتا ہے"۔

مفسرین کی اکثریت متفق ہے کہ یہ پیغمبر اسلام کی طرف اشارہ ہے۔ پکتھال نے اس سے مراد "موجودہ وحی" (یعنی قرآن کے لئے ہیں یعنی یہ امر کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے) سید احمد خاں اس سے مراد قبلہ کی تبدیلی کے لیتے ہیں جو بیت المقدس کی جگہ کعبے کی طرف مقرر کر دیا گیا۔[1] اور یہ بات یاد دلاتے ہیں کہ انجیل یوحنا ۴/ ۲۱ کے مطابق حضرت عیسٰی نے ایک عورت سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ : "..... میری بات پر یقین کر کہ وہ گھڑی آرہی ہے جب تم لوگ نہ اس پہاڑ پر اور نہ شہر یروشلم میں (آسمانی) باپ کی عبادت کرو گے"۔ پھر سید احمد خاں بتاتے ہیں کہ حضرت عیسٰی نے ایک نئے یروشلم کے وجود میں آنے کی پیشین گوئی فرمادی تھی اور

---

[1] سرسید تفسیر القرآن۔ جلد اول آیت ۲/ ۹۷ تا ۹۸ ۔ صفحہ ۱۵۳

یہ اضافہ کرتے ہیں کہ ابن عباس، قتادہ اور دیگر علماء نے بھی یہی معنی لئے ہیں۔

ص ۱۹۸ آیت ۲/۱۴۸ میں شہیدوں کا ذکر ہوا ہے کہ ان کو مردہ نہ تصوّر کرو بلکہ وہ زندہ ہی رہتے ہیں۔ سرسید کے خیال میں اس کے معنی ہیں: "مذہب میں زندہ رہتے ہیں"۔ (ص ۱۹۹) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں ان کی یاد برقرار رہتی ہے یا یہ کہ انھوں نے اپنی جو جانیں نثار کی ہیں اس کے باعث مذہب زندہ رہتا ہے۔

ص ۲۰۹: آیت ۲/۱۷۰ میں ہے: "جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب سے (کتاب میں؟) نازل کی ہے...." اس سے اُن کی مراد خدائی احکام ہیں۔

ص ۲۱۵: قصاص کے قانون کی تفصیل دیتے ہوئے قرآن (۲/۱۷۴ و ما بعد) نے حکم دیا ہے کہ "جان کے بدلے جان" اور یہ بھی کہ: "..... اس (یعنی قاتل) کو اگر اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز معاف کردی جائے تو اچھے رسم و رواج کے مطابق عمل کیا جائے"۔ مسلمان فقہاء اس کے معنی یہ لیتے رہے ہیں کہ خون بہا لے کر مصالحت کرلی جائے اور سزائے موت نہ دی جائے۔ سید احمد خاں بیان کرتے ہیں کہ خونبہا لینا زمانہ جاہلیت کی واردات کے متعلق ہے اس لئے اب قتل عمد میں معافی کا کوئی سوال نہیں۔

ص ۲۱۸۔ آیت ۲/۱۷۹ میں بیان ہوا ہے کہ روزے کا حکم ماقبلِ اسلام کے مذہبوں میں بھی تھا۔ سید احمد خاں بائبل کی چند عبارتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے چالیس چالیس دن کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ "جب تم روزہ رکھو تو منافقوں کی طرح پژمردہ شکل اختیار نہ کرو"۔ (انجیل متیٰ ۶/۱۶)، اس عبارت میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے معلوم ہو کہ روزہ لازم ہے۔ اس میں روزے کا طریقہ بیان ہوا ہے، یہ نہیں کہ کتنے دن اور کتنا وقت، اور کس زمانے میں کھانا پینا ترک کردیں۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ اسلام نے رمضان کے روزے فرض کئے کہ "تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا"۔

ص ص ۲۴۴: حج کے زمانے میں جب حاجی عرفات سے منیٰ کو واپس آتا ہے رمی جمار یعنی منیٰ کے میدان میں تین ستون بطور نشان بنے ہیں ہر ایک ستون پر کنکریاں ماری جاتی ہیں جو

وہاں مختلف مقاموں پر نصب کیے گئے ہیں تمام ارکان حج اسلام میں بحال رہے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں تھے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہی رسم "رمی جمار" کی جو زمانۂ جاہلیت میں تھی اسلام میں بھی مثل دیگر ارکان حج کے عمل درآمد رہی۔" (صفحہ ۲۴۸)

سید احمد خاں کہتے ہیں کہ ان کا مقصد معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہے؟ پرانے مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اللہ کے لئے قربان کردیں۔ خدا نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ حضرت ابراہیم کو مزید آزمائشوں سے گزرنا تھا تاکہ وہ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ ہر چیز سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں چنانچہ شیطان نے اُن کو ورغلانے کی کوشش کی اور کہا تم کو خدا نے یہ حکم صرف خواب میں دیا ہے جو زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتا جب انھوں نے شیطان کی بات نہ مانی تو وہ اُن کی بیوی حضرت ہاجرہ سے جاکر کہنے لگا کہ اپنے شوہر کو اس بچے کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کرو۔ وہاں بھی دال نہ گلی تو ننھے بچّے کے پاس جاکر کہنے لگا کہ قربان ہونے سے انکار کردو۔ اِن تینوں نے شیطان کو پتھر مار کر واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔ اب ہم بھی اس مفہوم ذہنی سے یہی کام کرتے ہیں کہ شیطانی وسوسوں کو ماننے سے انکار کریں۔ بظاہر سرسید احمد خاں اس قصّے کو نہیں مانتے۔

ص ۲۵۵: وہ کہتے ہیں کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی قربانی کسی آیت قرآنی پر مبنی نہیں ہے۔

ص ۲۶۲ تا ۲۶۳: آیت ۲/۲۲۹ ومابعد میں طلاق کے احکام ہیں۔ ہمارے مولف نے اِس سلسلے میں تقابل کے لئے یہودی اور عیسائی احکام طلاق کی تفصیل بھی دی ہے۔

ص ۲۷۰: آیت ۲/۲۴۳ میں اِس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے اپنے ایک نبی سے فرمائش کی کہ ان کے لئے ایک بادشاہ نامزد کردیں: سید احمد خاں نے "حزقیل" اور "دُحکّام" نامی کتب بائبل کا حوالہ دیا ہے۔

ص ۲۷۴: آیت ۲/۲۴۷ پر بحث جاری ہے اور ایک پیغمبر نے طالوت کو بادشاہ نامزد کیا۔ سید احمد خاں بتاتے ہیں کہ اس نبی سے اشموئیل (ساموئیل) مراد ہیں اور یہ اضافہ کرتے ہیں کہ نہر کا پانی پینے کی ممانعت جدعون نامی بادشاہ کی فوج کو کی گئی تھی (جیسا کہ بائبل کی کتاب

احکام باب ۸ میں ہے) اور قرآن میں صراحت ہے کہ وہ حکم طالوت کی فوج کو دیا گیا تھا۔ سرسید یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ خود عیسائی مولف بھی اقرار کرتے ہیں کہ اشموئیل ۔نبی کی کتاب کی عبارتوں میں دشوار مقامات بھی ہیں۔

ص ۲۸۶: آیت ۲/۲۵۹ کے متعلق سید احمد خاں کا خیال ہے کہ الفاظ "یا اُس شخص کی طرح جو گزرا......" کو اس معنی میں لینا چاہیے کہ: "اس شخص کی طرح جو گویا کہ گزرا ہو" اور یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ یہ خواب کا واقعہ ہے۔

ص ۲۹۱: ۲/۲۶۰ میں یہ قصہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے بعض پرندوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جانے اور مُردوں کے زندہ ہونے کے قصّے بائبل میں کتاب پیدائش (۱۵/۹ ومابعد)، اور کتاب حزقیل (۳۷/۱۰-۱۱) میں بھی ہیں۔

ص ۲۹۹ ومابعد: آیت ۲/۲۷۵ میں سود کے حرام کئے جانے کا ذکر ہے۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ غریبوں، محتاجوں سے غیر پیداآور قرضوں پر سود لینے کی ممانعت ہے، دیگر اقسام کے قرضوں پر سود کی ممانعت قرآن میں نظر نہیں آتی۔

ص ۳۰۸ تا ۳۰۹: وہ ہندوستان کے متعلق بعض تاریخی واقعات لکھتے ہیں:

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ایک فتویٰ دیا تھا کہ پرامیسری نوٹ جائز ہیں نیز یہ کہ بہادر شاہ کے زمانے میں یہ رواج تھا کہ بادشاہ عام لوگوں سے کچھ رقم لیتا اور اس کے سود سے ان کو پنشن دی جاتی مثلاً ہزار روپے لے کر ماہانہ دس روپے کے حساب سے ساری زندگی پنشن ملا کرتی تھی چونکہ ہزار روپے جو لیے گئے تھے وہ نو دس ہی سال میں ادا ہو جاتے اور قرض دہندہ کی باقی زندگی حکومت پر بار ہو جاتی۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد اس قانون میں ترمیم کر کے پنشن کی مقدار نصف کر دی گئی اور سابق میں جو رقم زیادہ بڑی پنشن کے وعدے سے لی گئی تھی وہ رقم دہندوں کو واپس کر دی گئی۔ مذکورہ "اصلاح" کے بعد نہ تو قرض دہندہ کو حق رہا کہ رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے اور نہ بادشاہ کو حق رہا کہ پنشن بند کر دے بجز اس کے کہ قرض دہندہ کو مکمل رقم بیکشت واپس کر دی جائے۔

جلد دوم: تفسیر کی جلد دوم ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں چھپی۔ ظاہر ہے کہ اس

کا بھی وہی اسلوب ہے جو پہلی جلد کا ہے۔ اس میں سورہ ۳ تا ۵ کی شرح ہے۔

ص ۳ و ما بعد: سورہ ۳/۴ میں محکم، اور متشابہ آیتوں کا ذکر آیا ہے۔ سید احمد خاں نے اس کی تفسیر میں کہا کہ قرآن مجید میں صرف محکمات آیات ہیں تاکہ اس کے احکام عوام و خواص کے فہم میں آسانی سے آسکیں اور ان کے بارے میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔

ص ۱۹، آیت ۳/۳۵ میں حضرت مریم کے قصے میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت زکریا بی بی مریم کو دیکھنے کے لئے جاتے تو وہاں نفیس و لذیذ غذائیں موجود پاتے۔ سید احمد خاں کے خیال میں یہ نیک اور مخیر لوگوں کے تحفے تھے جو وہ بی بی کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ حضرت زکریا بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں لیکن جب انھوں نے اولاد کیلئے اللہ سے دعا کی تو اللہ کے حکم سے ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا یعنی حضرت یحییٰ۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ اس "معجزے" کے چھے ہی مہینے بعد دوسرا "معجزہ" وقوع میں آیا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ یونانیوں کے ہاں رواج تھا کہ بڑے لوگوں کو خدا کا بیٹا کہیں مثلاً ہرکیولیس، دیاکوری، رومولوس، فیثا غورث، افلاطون۔ بلکہ یونانی تو افلاطون کی ولادت کا قصہ بھی انھیں حالات میں بیان کرتے ہیں جو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب ہیں پھر سید احمد خاں کا بیان کہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ کا لقب دیا تاکہ ان لوگوں کو مرعوب و متاثر کریں جن میں حوارین اپنے نئے دین کی تبلیغ کر رہے تھے۔ اسی مقصد سے انھوں نے انجیلیں تالیف کیں (ص ۲۹)

ص ۲۲۔۵۱: حضرت عیسیٰ کی ولادت میں ان کے نزدیک کوئی خلافِ عادت واقعہ نہیں ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھا لئے جانے کے متعلق سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا اور قرآنی الفاظ کی تاویل ان معنوں میں کرنی چاہیے کہ خدا نے ان کے درجے کو بلند کیا اور یہ کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر مرے نہیں بلکہ اس کے کچھ عرصے بعد طبعی موت سے ان کا انتقال ہو گیا اور مخفی طور پر ان کو دفن کیا گیا اور یہ خبر پھیلائی گئی کہ وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں۔

ص ۶۸ تا ۷۱: اس سورۃ میں آیت نمبر ۱۱۸ غزوۂ بدر کا ذکر آیا ہے کہ تین سو بارہ مسلمان اور نو سو پچاس مشرکین مکہ تھے اور آیت میں مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتوں کی آمد کا ذکر ہے سید احمد خاں یہاں تفسیر کے حوالے سے ابوبکر الاصم کی رائے نقل کرتے ہیں کہ فرشتے آئے ضرور،

لیکن انھوں نے لڑائی میں حصّہ نہیں لیا۔ قرآن میں ایک نکتہ ملتا ہے جو سید احمد خاں کی تائید کرتا ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان مورخوں کے مطابق دشمن کی تعداد نو سو پچاس تھی اور قرآن ۳/۱۲۴ تا ۱۲۵ کے مطابق پانچ ہزار فرشتوں کی آمد کا ذکر ہے۔ صرف ایک فرشتہ تن تنہا اس بات کے لئے کافی ہے کہ سارے دشمنوں کو شکست دیدے۔ فرشتے اگر اہل مکہ سے پانچ گنا زائد تھے تو اس سے فرشتوں کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوتا۔

ص ۸۶ تا ۸۹ : غزوۂ احد کا ذکر آیت ۳/۱۶۲ وغیرہ میں آیا ہے اور قرآن میں ہے کہ شہیدوں کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ اللہ کے نزدیک زندہ ہی ہیں۔ یہاں سید احمد خاں کہتے ہیں کہ یہ روحانی زندگی ہے جسمانی نہیں۔ اور اسی بات کو پہلے آیت ۲/۱۵۴ میں انھوں نے کہا ہے کہ یہ زندگی مذہب میں ہے یعنی ان کے نزدیک حیات سے "حیات فی الدین" مراد ہے[1]

ص ۹۲ : یہودیوں کی عادت تھی کہ ان جانوروں کی قربانی دیں جن کو آگ کھا لیتی تھی۔ تب ہی انسان پاک ہو سکتا ہے، اس کے گناہ کا کفارہ ادا ہوتا ہے (آیت ۳/۱۰۹) اسلام نے گناہوں سے پاک ہونے کے لئے کسی بے گناہ جانور کے مارنے کے بدلے خود گنہگار کے دل کی قربانی مقرر کی ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں توبہ و استغفار سے تعبیر کیا ہے اور یہی قربانی حقیقت میں حقیقی قربانی ہے"۔ (صفحہ ۹) سید احمد خاں اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ اسلام ایسی قربانیوں کا حکم نہیں دیتا۔" اگر کوئی مسلمان حاجی، احرام کی حالت میں کسی جانور کا شکار کرے تو حکم ہے کہ وہ کفارے کے لئے ایک جانور کو ذبح کرے۔ قصور آدمی کا تھا، جانور کو کیوں سزا دی جائے؟ اس طرح کے سوال کا جواب دینے کے لئے سید احمد خاں کہتے ہیں کہ اس بارے میں کئی نکتے ہیں جن پر توجہ کی جانی چاہیے : کفارے میں ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت جلا کر ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کائنات میں ہمیں نظر آتا ہے کہ ساری ہی مخلوق دیگر مخلوقات کو کھا کر زندہ رہتی ہے۔ یہ کوئی بے رحمی نہیں بلکہ فطرت کا قانون ہے۔

---

[1] سرسید تفسیر القرآن جلد اول۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۰ء ص ۲۱

چنانچہ درختوں کی غذا مٹی اور پانی ہے۔ چند جانور گھاس کھاتے ہیں تو دوسرے کچھ دیگر جانوروں کا گوشت کھا کر زندہ رہتے ہیں بعض اور جانور مثلاً مچھلی ہم جنس چھوٹی مچھلیوں ہی کو نگل جاتی ہے۔ گھاس کھانے والے اور گوشت کھانے والے جانوروں کے علاوہ بعض ایسے بھی ہیں جو گھاس اور گوشت دونوں چیزوں کو کھا کر پلتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی مخلوق اپنے سے باہر کی کوئی چیز غذا کے طور پر کھائے بغیر زندہ رہ سکے۔ ہمارے منہ میں جو دانت ہیں اُن میں سے بعض گوشت خور جانوروں کے دانتوں کی طرح ہیں اور بعض گھاس کھانے والے جانوروں یا دیگر جانوروں کے دانتوں کی طرح۔ مجرم حاجی کی سزا یہ ہے کہ اسے کفارے کے جانور کو خریدنے کے لئے رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔

ص ۱۰۲ و مابعد: آیت ۴/۲ میں تعدد ازدواج میں چار تک نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کی تشریح میں سید احمد خاں کہتے ہیں کہ اس اجازت میں صراحت سے پابندی ہے کہ ساری بیویوں سے عدل اور مساوات کا سلوک ہو۔ عدل سے مراد محبت اور قدر و منزلت ہے۔ معاملہ پسند کا ہے مادی نہیں کہ عدل اور مساوات کی قانوناً تعمیل کرائی جائے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہے۔ پھر انھوں نے یہاں اپنا نظریہ دہرایا ہے کہ اسلام نے غلامی منسوخ کر دی ہے۔ اُن کی واحد دلیل یہ ہے کہ آیت ۴۷/۳ میں جنگی قیدیوں کے رہا کرنے کے احکام کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ یا تو انھیں مفت رہا کر دو۔ یا فدیہ لے کر چھوڑ دو تاکہ جنگ کے آثار باقی رہنے نہ پائیں اور اس آیت میں قیدیوں کو غلام بنا سکنے کا ذکر نہیں ہے۔

ص ۱۱۶ تا ۱۲۱ آیت ۴/۲۸: یہاں محدود مدت کے نکاح (متعہ) سے بحث کی گئی ہے اور اس کی تفسیر میں سید احمد خاں نے تمام مفسرین سے اختلاف کیا ہے۔

ص ۱۴۷ تا ۱۸۳: ان صفحات میں حلال اور پاک غذا کی بحث ہے۔ نہ صرف یہ کہ کمائی اچھے اور حلال طریقوں سے ہوئی ہو بلکہ یہ بھی کہ کونسی چیزیں پاک غذا میں شامل ہیں۔ آیت ۵/۵ و مابعد میں دوسری چیزوں کے ساتھ غذا کا ذکر ہے۔ قرآن نے جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کو کھانے سے قبل ان کو کس طرح ذبح کیا

جائے اور بعض طریقوں مثلاً گلا گھونٹ کر مارنے کی ممانعت کی ہے۔ اس آیت میں اس بات کی صراحت ہے کہ اہلِ کتاب (مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں) کی غذا مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔ اگر عیسائی کسی جانور کو گلا گھونٹ کر مارتے ہوں تو سید احمد خاں کی رائے میں اس کا کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے اور وہ محی الدین ابن عربی کے فتوے کا ذکر کرتے ہیں۔ سید احمد خاں کا منشا اصل میں یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور انگریزوں میں تعلقات پیدا ہوں تاکہ باہمی غلط فہمیاں دور ہوں۔ قرآن میں (۶/۸) میں غیر مسلموں سے سماجی میل جول کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ: "اہل کتاب کی غذا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہاری غذا اہل کتاب کے لئے۔"

ص ۱۸۴ تا ۱۸۶: آیت ۶/۵ میں نماز کے لئے طہارت کا ذکر ہے۔ سید احمد خاں کا بیان ہے کہ اس سے حواس خمسہ کے اعضاء کا دھونا مراد ہے یعنی چھونے، چکھنے، سونگھنے دیکھنے اور سننے کے اعضاء کا جہاں تک پیروں کا تعلق ہے ان کو دھونا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ محض بھیگے ہاتھ سے ان پر مسح کیا جائے۔

ص ۱۹۴-۱۹۶: آیت ۳۰/۵ میں قابیل اور ہابیل کا ذکر ہے جو حضرت آدم کے بیٹے تھے کہ ان میں سے ایک کی پیش کردہ قربانی خدا نے قبول کی اور دوسرے کی نہیں۔ اس پر اول الذکر نے خفگی اور حسد سے اپنے بھائی کو مار ڈالا۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ قبولیت کا پتہ کس طرح چلا کیونکہ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے پھر وہ بائیبل کے فارسی ترجمے کا اقتباس دیتے ہیں اور اس کا قرآنی بیان سے مقابلہ کرتے ہیں ہابیل اور قابیل کے قصے کے بعد سید احمد خاں نے قانون قصاص سے بحث کی ہے اور رہزنوں کی سزاؤں کا ذکر کیا ہے جن کا بیان آیت ۳۵/۵ میں ہے۔

ص ۲۰۲: چوری کی سزا یعنی ہاتھ کاٹنے کا ذکر آیت ۴۱/۵ میں ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے سید احمد خاں اس کے لئے "وحشیانہ سزا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش میں وہ لکھتے ہیں۔ یہ بمجبوری اختیار کی جاتی تھی کہ اس زمانے میں ملک میں قید خانے نہیں پائے جاتے تھے۔

ص ۲۳۲ - ۲۴۵: آیت ۱۰۹/۵ میں ایک ذیلی اشارہ حضرت عیسیٰ اور انجیل

کی طرف ہے اور اس میں حضرت عیسٰی کے بعض معجزوں کا ذکر ہے جس کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ وہ دودھ پیتے بچے کی حالت میں جب گہوارے میں تھے تو بھی باتیں کرتے تھے۔ سید احمد خاں اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ دو برس کے ننھے بچے نہ تھے بلکہ بڑی عمر کے لڑکے تھے۔ اس کے بعد حضرت عیسٰی کے مٹی سے پرندے بنانے اور ان میں پھونک مار کر زندہ جانور بنانے کا ذکر ہے جو اڑنے لگتے ہیں۔ ہمارے مولف کے خیال میں وہ واقعتہً نہیں اڑے اور یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ یہ قصہ غیر صحیح انجیلوں میں سے ایک یعنی "انجیل طفولیت" میں مذکور ہے۔ سید احمد خاں اپنی اردو تفسیر میں مغربی ناموں کو جب عربی رسم الخط میں لکھتے ہیں تو اس میں اکثر غلطیاں ہو جاتی ہیں خاص کر اس لئے کہ وہ اُن کا انگریزی زبان کے مطابق تلفظ کرتے ہیں اور یہ نام ناقابلِ فہم ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ قرآن مجید کے اس حصے میں قرآنی اصطلاحوں "کتاب" "حکمت" "آیات اللہ"، حضرت عیسٰی کے حواریوں کے ایمان لانے اور حضرت عیسٰی کے بیماروں کو تندرست کرنے کے متعلق خیالات ظاہر کئے ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنے کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ واقعی مر نہیں گئے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ اُن کا دل مر گیا تھا۔ کھانے کے دسترخوان (مایدہ) کے آسمان سے اُترنے کے متعلق جو آیت ۵/۱۱۲-۱۱۵ مذکور ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ واقعتہً نہیں اُترا بلکہ استعارہ ہے نیز یہ کہ خدا نے حضرت عیسٰی کو یہودیوں سے محفوظ رکھا۔

جلد سوم: تفسیر کی جلد سوم کے اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض مسائل کے متعلق ہمارے مولف یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ان کی عقلی توجیہ کی جائے۔

(سورہ ۶ انعام) ص ۱۰ تا ۱۴: معجزے کی حقیقت اور یہ کہ پیغمبر اسلام سے معجزے صادر ہوئے یا نہیں؛ ص ۴۶، (آیت ۶/۶۱) ملائکہ، حفظہ اور کراماً کاتبین کی تحقیق۔

ص ۵۳-۵: (۶/۷۱) لفظ کن فیکون اور صور کا پھونکا جانا۔ ص ۵۶: (۶/۷۴) حضرت ابراہیم کے باپ آذر کی تحقیق۔ ص ۵۷: (۶/۷۸-۷۶) حضرت ابراہیم کا ستارے، چاند اور سورج کو رب فرض کرنا ص ۷۹: (۶/۱۰۰) جنات اور ان کے اپنے خصوصی انبیاء۔

سورہ اعراف، ص ۱۰۲: (۷/۶) قیامت کے دن میزان اور وزن اعمال۔

ص ۱۰۹: (۷/ ۲۰ تا ۲۷) حضرت آدم اور حوّا کو برہنگی پر شرم محسوس کرنا۔ ص ۱۱۷: روح اور موت کے بعد اس کا باقی رہنا اور قیامت میں حشر اجساد۔ ص ۱۵۹: (۷/ ۵۴) کائنات کا چھ دن میں پیدا ہونا، اور خدا کا استنداد۔ ص ۲۰۲: (۷/ ۸۵-۹۳) حضرت شعیب کے حالات ص ۲۱۵-۲۱۱: (۷/ ۱۰۳-۱۰۱) حضرت موسٰی کے حالات کی تحقیق۔ ص ۲۱۰: (۷/ ۱۰۵) اصطلاحات "آیت" اور "بینۃ" کی تحقیق، سحر اور معجزہ میں فرق۔ ص ۲۵۷: (۷/ ۱) فرعون اور فرعون کا بنی اسرائیل کے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا۔ ص ۲۵۹: (۷/ ۱۲۹) طوفان، ٹڈی دل، پشو، مینڈک اور خون کی مصیبتوں سے فرعونیوں کا آزمایا جانا۔ ص ۲۵۹ فرعون کا ڈوب مرنا اور حضرت موسٰی کا مصر سے جاکر طور سینا پر اعتکاف کرنا ص ۲۶۳-۲۶۱ (۱۱۲/۱۱۳) خدا کا پہاڑ پر تجلّی کرنے، حضرت موسٰی سے کلام کرنے اور تختیوں پر قانون لکھنے کی تحقیق۔ ص ۲۶۳: (۷/ ۱۴۶-۱۴۵) گاؤسالہ پرستی اور سامری کے حالات۔ ص ۲۶۵ (۷/ ۱۵۳) خدا سے ملاقات کے لئے ستر آدمیوں کا انتخاب اور دنیا و آخرت میں دیدار الٰہی پر بحث صفحہ ۲ (۷/ ۱۵۹) پانی کی تلاش، ابر کا سایہ کرنا، من وسلوٰی۔ (۷/ ۱۶۰) دروازے سے گزر کر داخل ہونا ص: ۲۶۶ توریت اور انجیل میں آنحضرت کی بشارت ص ۲۸۱-۲۷۹ (۷/ ۱۷۴-۱۷۳) جس غیر معروف کافر کا ذکر ہے اس سے مراد کون ہے؟ سید احمد خاں کا یہ خیال ہے کہ اگر ان آیتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے جو فرعون کے متعلق قرآن مجید میں ہیں تو ہر کافر کا تعین ہم بآسانی فرعون سے کرسکتے ہیں۔ ص ۲۸۴: (۷/ ۱۸۹) آدم سے حوّا کا پیدا ہونے کی بابت وہ کہتے ہیں کہ: "اس آیت کے معنی بہت صاف ہیں خدا فرماتا ہے کہ میں نے تم کو اور تمہاری عورتوں کو جانِ واحد سے پیدا کیا ہے یعنی مرد و عورت سب میں ایک ہی جان ہے دونوں خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں ص ۲۸۸: (۷/ ۲)

جلد چہارم: سورہ (۸) انفال ص ۱۱: (۸/ ۸) غزوۂ بدر کے حالات۔ ص ۱۳: (۸/ ۹) فرشتوں کا بدر اور حنین میں مسلمانوں کی مدد کے لئے آنا۔ ص ۱۶: (۸/ ۱۱) مسلمانوں کے اونگھنے کے ذکر سے کیا مراد ہے ۲-۱۹ (۸/ ۱۶) آیت کہ "تیر چلانا تیرا نہیں خدا کا کام تھا"، کی تحقیق ص ۲۵: (۸/ ۳۱) کافروں کا پتھروں کی بارش کی دعا کرنا، اور رسول کی موجودگی میں ایسا نہ ہوسکنا۔ ص ۳۳: (۸/ ۴۹) شیطان کا بُرے کاموں پر رجھانا۔ ص ۴۰ (۸/ ۶۷-۶۸) بدر

کے قیدیوں سے فدیہ لینے میں جو غلطی ہوئی اس کی تحقیق۔

سورہ (۹) توبہ: ص ۴۴: غزوات نبوی جبراً اسلام پھیلانے کے لئے نہیں تھے ص ۴۹ قتل نبوی کا ارادہ اور ہجرت حبشہ و مدینہ۔ ص ۵۷: مذہب کی آزادی کی آیتیں ص ۶۹ تا ۱۰۵؛ غزوات نبوی کا یکجا ذکر۔ ص ۱۰۷: (۲۹/۹) جزیہ۔ ص ۱۱۸: (۲۹/۹) حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنے والے یہودی۔ ص ۱۵۴: (۹/۱۱۳ تا ۱۱۴) کافر ماں باپ یا دیگر رشتہ داروں کی مغفرت کی دعا کرنا ص ۱۵۶: (۱۱۷/۹) اللہ کے نبی کی توبہ کو قبول کرنے کی تفسیر۔ سورہ (۱۰) یونس ص ۱۸۸ (۹۳/۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی کے متعلق اشتباہ سے بحث۔

جلد پنجم: سورہ (۱۱) ہود۔ ص ۱۰: (۳۸/۱۱) طوفان نوح؛ (۷۳/۱۱) فرشتوں کا ذکر حضرت ابراہیم کا بیٹا پیدا ہونے کی بشارت دینا۔ حضرت لوط کا قصہ۔ سورہ (۱۲) یوسف۔ ص ۱۶۸ (۱۲/۴، ۳۶) حضرت یوسف، بادشاہ مصر اور قیدیوں کا خواب دیکھنا ص ۹۰؛ (۲۴/۱۲) یوسف زلیخا کا قصہ ص ۱۱۴: (۸۴/۱۲، ۹۶) حضرت یعقوب کا غم سے نابینا ہو جانا ص ۱۲۴؛ (۱۱۰/۱۰۰) حضرت یوسف کے قصے کے حیرت آموز ہونے کا قرآنی دعویٰ۔

سورہ (۱۳) رعد سورہ (۱۴) ابراہیم (۱۵) حجر۔ ص ۱۵۸: (۱۵/۱۵) اس آیت میں آسمانی بروج کا ذکر ہے۔ ص ۱۵۹، (۱۷/۱۵) آسمان یا بروج کا شیاطین آسمان سے محفوظ ہونا۔ جنات کی مسنون آگ سے تخلیق۔ سورہ (۱۶) نحل۔ ص ۱۸۱: (۱۶/۱۴) زمین میں پہاڑوں کے گڑے ہونے کا ذکر۔

جلد ششم: سورہ (۱۷) بنی اسرائیل۔ ص ۴ تا ۱۵۰: (۱/۱۷) معراج۔ ص ۱۵۰: (۱۷/۵۹) خدا کی نشانیوں کے بھیجنے کی وجہ کی توضیح۔ ص ۱۵۲ تا ۱۵۱ (۶۱/۱۷) شجر زقوم۔ ص ۱۵۸: لفظ شاکلہ کی تفسیر۔

جلد ھفتم: سورہ (۱۸) کہف کے شروع میں اصحاب کہف و رقیم کی طویل بحث ہے (۱۸/۱۱ میں) کئی سال تک مسلسل سوتے رہنے والوں کا ذکر ہے پھر آگے (۲۵/۱۸) میں مزید صراحت ہے کہ "تین سو سال جس میں نو مزید سال اضافہ کرنے کا ذکر ہے"۔ اس کی بڑی اچھی علمی توضیح حضرت علی کی طرف منسوب ہے کہ تین سو شمسی سالوں کے تین سو قمری

سال ہوتے ہیں اس طویل نیند کے امکان کے متعلق سید احمد خاں نے اول توریت (۲۲) سے بحث کی ہے جس میں قرآن نے اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف پائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ پھر آگے آیت (۲۵) میں جہاں آیت کے الفاظ ہیں "اور وہ غار میں تین سو سال رہے اور ان میں نو کا اضافہ کیا" سید احمد خاں اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اصحاب کہف حقیقت میں صرف تین پہر (تقریباً نو گھنٹے) سوئے تھے، نہ کہ تین سو سال"۔ پکتھال کا بھی یہی خیال ہے۔ اور ترجمہ کرتے وقت بین القوسین کے الفاظ بڑھا دیے ہیں۔

ص ۸: سید احمد خاں کی رائے میں اصحاب الکہف والرقیم سے دو مختلف گروہ نہیں بلکہ ایک ہی جماعت مراد ہے۔ وہ اپنا ماخذ بتائے بغیر لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ دقیانوس (رومی شہنشاہ DECIUS کے زمانے میں (۲۴۹ء تا ۲۵۱ء) پیش آیا جو عیسائیوں کو اذیت رسانی کی وجہ سے مشہور ہے اور آخر میں لکھتے ہیں کہ: "یہ غار اس قسم کا ہوگا جیسے کہ انگلستان میں برسٹل میں ہے جو میں نے بھی ۱۸۷۰ء میں اپنے قیام لندن کے دوران جاکر دیکھا ہے"۔ اور یہ بھی لکھتے ہیں: بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ غار اٹلی میں تھا بعض دمشق کے قرب و جوار اور بعض جنان الورد (اندلس) میں؟ بعض قسطنطنیہ میں اور بعض شہر چہار شنبہ (روسی ترکستان) میں بتاتے ہیں۔

ص ۴۴: میں نامۂ اعمال اور قیامت کے دن، اعمال کے وزن کئے جانے کا ذکر ہے۔ اور ان بلند مرتبت کاتبوں کا بھی جو انسان کے ہر عمل کو ہر وقت رقم کرتے رہتے ہیں۔ سید احمد خاں کے خیال میں انسان میں جو افتاد طبع ودیعت کی گئی ہے اس کو "فرشتہ" کا نام دیا گیا ہے اور ہر انسان کے اچھے اور برے اعمال سے اس کی روح پر جو تاثر ہوتا ہے اس کو نامۂ اعمال سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کہ ان کو ترازو میں تولا جائے گا۔ یہ ایک رمز اور استعارہ ہے۔ اچھے آدمی کو اس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں اور برے کو بائیں ہاتھ میں دیا جانا یہ بھی ایک استعارہ ہے کیونکہ قرآن (۵۶/۵۷ اور ۵۶/۴۱ میں) اچھے اور برے لوگوں کو اصحاب الیمین (داہنے ہاتھ والے لوگ) اور اصحاب الشمال (بائیں ہاتھ والے لوگ) کا نام دیا گیا ہے اور وہاں نامۂ اعمال کا کوئی ذکر نہیں ہے اسی لئے اگر تحریری نامۂ اعمال کا ذکر ہو تو اسے ایک غیر مادی مفہوم میں لیا جانا چاہیے یعنی اچھے اور برے لوگ۔

ص ۵۶ : میں حضرت موسیٰ اور ان کے ہمسفر نوجوان خدمت گزار کا ذکر ہے اور یہ کہ کس طرح مری ہوئی مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی اس سلسلے میں سید احمد خاں اپنی جدید مغربی تحقیقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے شہر ہیلیو پولیس (عین الشمس) کی جامعہ میں تعلیم پائی تھی۔ انھیں ریاضیات، جہاز سازی آلات تعمیر اور جنگ سے بھی پوری واقفیت تھی۔ مزید یہ کہ وہ ہیرو غلیف رسم الخط سے واقف تھے جب مصریوں نے ایتھوپیہ (حبشہ) پر حملہ کیا تو مارخور پرندوں کی مدد سے حضرت موسیٰ نے ان سانپوں کو مار ڈالا جو ان کی فوج پر حملہ کر رہے تھے اور یہ کہ لڑائی کے اختتام پر حضرت موسیٰ نے ایتھوبیہ کی شہزادی سے نکاح کیا۔

ص ۶۲ : مچھلی کے اس قصے میں حضرت موسیٰ سے انکا خادم کہتا ہے کہ میں مچھلی سے غافل ہو گیا۔ تو وہ پانی میں کود پڑی، جواباً حضرت موسیٰ کہتے ہیں کہ میں اس مقام کی تلاش میں تھا۔ دونوں اُلٹے قدم واپس آئے۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو تلاش اس مقام کی نہ تھی بلکہ انھیں تلاش مچھلی (غذا) کی تھی کیونکہ وہ بھوکے تھے۔ آیت ۱۸/۶۶ میں حضرت موسیٰ اس شخص سے جس سے ان کی ملاقات ہوئی تھی کہتے ہیں کہ اجازت ہو تو میں تمہارے ساتھ رہوں۔ مقصد شہر مداین کا راستہ دریافت کرنا تھا کوئی اور چیز پیش نظر نہ تھی۔ حضرت موسیٰ اس وقت ایک مصری شخص کو قتل کرنے کے باعث حالت فرار میں تھے اور مداین جانا چاہتے تھے مگر انھیں راستہ معلوم نہ تھا۔ دیگر یہ کہ ابھی حضرت موسیٰ نبی نہ بنے تھے (اس لئے غصے کی حالت میں کسی کو مار ڈالنا بعید از قیاس نہیں) خضر کے قصے میں (۱۸/۱۷) جس بچے کو قتل کرنے کا ذکر ہے وہ سید احمد خاں کے خیال میں نابالغ بچہ نہ تھا بلکہ بالغ ڈاکو تھا اور اس بارے میں وہ تفسیر رازی کا حوالہ دیتے ہیں۔

ص ۱۸ - آیت ۱۸/۸۲-۹۸ میں جس ذوالقرنین کا قصہ ہے وہ سید احمد خاں کی رائے میں سکندر اعظم نہیں ہے اور جس دیوار کے بنانے کا ذکر ہے وہ دیوارِ چین ہے۔

ص ۸۵ - ۸۷ میں یاجوج ماجوج کے متعلق سید احمد خاں کہتے ہیں کہ ماڈسل کی کتاب پیدائش ۱۰/۲ میں گوگ اور ماگوک کے نام سے انھیں کا ذکر ہوا ہے۔

ص ۸۸ - ۹۱ - دیوارِ چین وہاں کے بادشاہ چی وانگ ٹی نے بنائی جو ۲۲۵ تا ۲۴ ق م کا زمانہ ہے۔ یہ بادشاہ حریص تھا اور خزانے جمع کرنے کا شائق تھا اسی نے ملک گیری کی ہوس

میں جنگیں شروع کیں اور یہ کہ ذوالقرنین (دو سینگوں والا) سے یہی بادشاہ مراد ہے۔ اِس چینی حکمراں نے ساری کتابیں تلف کرادیں۔

ص ۹۲ - ۱۰۴ - میں آفتاب کے ڈوبنے کے مقام کا ذکر ہے۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ یہ خلیج بنگال تھی اور وہاں کے مذکورہ گرم چشمے سے مراد ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سرخ کرنیں ہیں۔

ص ۱۰۶ : قصے کو جاری رکھتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ سکندر ایک زنا ولد تھا۔ چی وانگ ٹی بھی ایسا ہی تھا۔ سکندر کو اس افسانوی چشمے کی تلاش تھی جس میں آب حیات پایا جاتا ہے۔ چی وانگ ٹی کو بھی اس کی تلاش تھی۔

آیت ۱۹/۷ میں ہے کہ حضرت زکریا کو اُن کے بیٹے حضرت یحییٰ کی ولادت کی بشارت دی گئی۔ یہ کسی نے دی؛ فرشتے نے یا کسی اور نے؛ اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ سورہ آلِ عمران میں فرشتے ہی کی بشارت وغیرہ کا ذکر ہے لیکن ان کے نزدیک اِس بحث میں پڑنا ضروری نہیں بشارت دینے والا ہاتف غیبی تھا۔ آیت ۱۹/۱۰ میں ہے کہ حضرت زکریا کو تین دن تک نہ بولنے کا حکم دیا گیا۔ ۱۹/۱۲ میں یہ بحث ہے حضرت عیسٰی کس عمر میں نبی بنے اور اُن کے لڑکپن میں حکم حاصل کرنے سے کیا مراد ہے؟ سید احمد خاں کے خیال میں لفظ حکم کے معنی عقل کے ہیں مؤ!!

۱۹/۱۴ میں حضرت مریم کے مشرقی مکان کو جانے کا ذکر ہے۔ وہاں جانے کا مقصد کیا تھا۔ مشرقی مکان میں حضرت مریم کے جانے کی وجہ حالیہ مصنف کے نزدیک استراحت تھی۔

آیت ۱۹/۱۵ تا ۲۲ میں بیان ہے کہ حضرت مریم کو ایک فرشتے نے حاملہ کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ خواب میں پیش آیا۔

آیت ۹/۲۳ کے سلسلے میں یہ بحث ہے کہ حضرت مریم کو حالت اضطراب میں کس نے پکارا تھا؛ سید احمد خاں کہتے ہیں کہ وہ کوئی فرشتہ نہیں ایک انسان تھا۔

آیت ۱۹/۵۶ میں حضرت ادریس کے ایک سچے نبی ہونے کی بات کہی گئی ہے۔

پھر ۱۹/۷۱ میں بحث ہے کہ : تم میں سے کوئی شخص نہیں جسے کچھ عرصے کے لئے وہاں یعنی جہنم جانا نہ ہو سید احمد خاں کہتے ہیں کہ "تم میں سے یعنی کافروں میں سے" اگر کافروں میں کوئی مرنے سے قبل مسلمان ہوجائے تو اسے جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

آیت ۸۷/۱۹ میں شفاعت کا ذکر ہے اور اس پر سید احمد خاں نے ایک مبسوط بحث کی ہے۔ جو صفحہ ۱۳۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۴۲ یعنی سورۂ مذکور کے آخر تک پھیلی ہوئی ہے۔

سورہ طٰہٰ صفحات ۱۴۶ - ۱۶۹ - تفسیر القرآن جلد ہفتم پر محیط ہے۔ اس سورہ میں حضرت موسیٰ کی پیغمبری، اُن کے معجزوں، ان کی فرعون کے دربار میں حاضری، اس سے اپنی موت کے بارے میں گفتگو، دریائے نیل کو عبور کرنے اور فرعون کے لشکر کے غرقاب ہونے کا خاص طور سے ذکر ہے۔ اس میں سامری اور اس کے بچھڑے کے متعلق بھی آیات ہیں۔

ہم نے اس باب میں سورہ طٰہٰ کی تفصیلی بحث اس لئے نہیں کی ہے کہ اس کے مندرجات سے متعلق سید احمد خاں نے اپنے خیالات و اعتقادات کا ذکر نہیں کیا ہے اور اگر کسی آیت کے سلسلے میں کہیں کچھ لکھا بھی تو صرف اتنا کہ انھوں نے زیرِ نظر آیت یا آیات کے بارے میں اپنی تفسیر کی فلاں جلد میں شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

ان کی "تفسیر القرآن" سولھویں پارے کی بیسویں سورۃ طٰہٰ پر ختم ہو جاتی ہے۔ جنت دوزخ عدل و میزان، فرشتے اور اجنہ، معجزات و کرامات اور اسی نوع کے دیگر الفاظ جو قرآن مجید میں آئے ہیں ہمارے مصنف کے یہاں ان کے وہ معانی نہیں جو بالعموم مسلمان مفسرین لیتے ہیں ان کے خیال میں یہ سب اصطلات مجازی اور استعاراتی ہیں۔

بد قسمتی سے سید احمد خاں کو اپنی تفسیر مکمل کرنے اور نظرِ ثانی کے بعد شائع کرنے کا موقع نہ ملا جس میں انھوں نے محنت اور خشوع کے ساتھ تعلیمات اور احکامات قرآنی کی مدلل اور پُر زور مدافعت کی ہے۔

تحریر فی اصول التفسیر

یہ کتاب سید احمد خاں نے ۱۸۹۲ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شایع کی جو باسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلامی مسائل سے متعلق ان کے خیال اور رجحانِ طبع کو معلوم کرنے کے لئے یہ ایک بنیادی تحریر ہے۔ اگرچہ یہ کتاب ان کی زندگی کے آخری زمانے میں شایع ہوئی لیکن اس میں وہی تمام چیزیں بیان ہوئی ہیں جو اوائلِ زندگی سے ان کا عقیدہ تھیں اس سے قبل ان کی اردو تفسیر قرآن شایع ہو چکی تھی۔ اس میں اوّلاً وہ یہ بیان کرتے ہیں:

"اما بعد، جب کہ غدر کا زمانہ گزر گیا، مسلمانوں پر بھی جو کچھ گزرنا تھا گزر گیا تو مجھ کو اپنی قوم کی اصلاح کی فکر ہوئی۔ میں نے اس میں بہت غور کی، اور ایک زمانۂ دراز کی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ان کی دینی و دنیوی اصلاح بغیر اس کے کہ ان کو علوم و فنونِ جدید جو اور قوموں کے سرمایۂ افتخار ہیں اور اس زبان میں جو ہم پر بہ مشیت اللہ حکومت کرتی ہے، تعلیم نہ دی جاوے، اور کسی طرح ممکن نہیں۔

اس طریقے سے دنیوی اصلاح کے ہونے کا تو ایسا مسئلہ ہے جس میں کچھ اختلاف نہیں ہو سکتا، مگر یہ مسئلہ کہ دینی اصلاح کے لئے بھی وہ مفید ہے، معرض بحث میں تھا۔ یہ مشکل کچھ اسی وقت میں پیش نہیں آئی بلکہ اس وقت بھی پیش آئی تھی جب کہ فلسفۂ یونانی مسلمانوں میں پھیلا تھا اور مذہبی اصول و عقائد کو اس نے درہم برہم کر دیا تھا۔ مگر اس زمانے کے علما نے اس پر توجہ کی اور علم کلام ایجاد کیا اور مذہب کی حمایت میں فلسفۂ یونانی سے مقابلہ کیا اور انھوں نے صرف تین کام کیے؛ یا تو مسائل مذہبی کو فلسفۂ یونان کے مطابق کر دکھایا، یا ان کے دلائل کو غلط کر دیا یا مشتبہ۔ مگر اس زمانے میں جو سخت مشکل پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفہ اور طبیعیات یونانی بھی جس کی بناء پر اُس زمانے کے علماء نے بہت سے مذہبی مسائل بھی قائم کیے تھے، علوم جدیدہ سے غلط ثابت ہوا ہے اور علوم جدیدہ کے دلایل صرف قیاسی اور فرضی نہیں رہے بلکہ تجربہ اور عمل نے ان کو درجۂ مشاہدہ تک پہنچا دیا ہے، یہاں تک کہ عام طور پر یہ مسئلہ محقق مانے جانے لگا ہے کہ علوم مذہب کے مخالف ہیں اور وہ مذہب کو اس طرح جلا دیتے ہیں جیسے پودے کو پالا۔

جب کہ میں نے علوم جدیدہ و انگریزی زبان کو مسلمانوں میں رواج دینے کی کوشش کی تو مجھ کو خیال ہوا کہ کیا درحقیقت وہ علوم مذہبِ اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے؛ میں نے بقدر اپنی طاقت کے

تفسیروں کو پڑھا اور بجز ان مضامین کے جو علم ادب سے علاقہ رکھتے ہیں باقی کو محض فضول اور مملو بروایات ضعیف و موضوع اور قصص بے سروپا سے پایا ......

پھر میں نے ...... کتب اصول تفسیر پر توجہ کی، اس امید پر کہ ان میں ضرور کوئی ایسے اصول قائم کئے ہوں گے جن کا ماخذ خود قرآن مجید یا کوئی اور ایسا ہو گا جس پر کچھ کلام نہ ہو سکے مگر ان میں .... کوئی ایسے اصول نہیں بتائے ہیں جن سے وہ مشکلات جو درپیش ہیں حل ہو سکیں۔ پھر میں نے بقدر اپنی طاقت کے خود قرآن مجید پر غور کی اور چاہا کہ قرآن ہی سمجھنا چاہیئے ...... میں سمجھا اور میں نے پایا کہ جو اصول خود قرآن مجید سے نکلتے ہیں۔ ان کے مطابق کوئی مخالفت علوم جدیدہ میں نہ اسلام سے ہے اور نہ قرآن سے۔ اگر راست پرستی من شاکر قرآن ام .... پھر میں نے انھیں اصول پر ایک تفسیر قرآن مجید لکھنی شروع کی جو اس وقت تک سورۃ النحل تک ہو چکی ہے۔ اس تفسیر کے چھپنے اور مشتہر ہونے پر لوگوں نے مخالفت کی اور اس کی تردید میں کتابیں لکھیں۔ میں نے اس پر کچھ التفات نہیں کیا اور نہ دیکھا، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ انھوں نے کیا لکھا ہو گا مگر ان دنوں میں پیارے مہدی نواب محسن الملک نے بھی مجھے دو خط لکھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی تفسیر کے بعض یا اکثر مقامات کی نسبت اسی قسم کے شبہات ہیں جو اور لوگوں کو ہیں، اور وہ دونوں خط اور ان کے جواب یہ ہیں ....." [1]

پہلا خط دو صفحوں میں مورخہ ۹ر اگست ۱۸۹۲ء حیدر آباد دکن سے لکھا گیا ہے جس میں محسن الملک نے سرسید کی تشریحوں کو قرآن کے خلاف کہا اور یہ کہ انھوں نے مفسرین کی توہین کی ہے اور انھیں یہودیوں کا مقلد بتایا۔[2] اس کے بعد ان کا جواب الٰہ آباد سے ۱۷ر اگست

---

[1] سید احمد خاں تحریر فی اصول التفسیر۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۲ء ص ۲۔۵

[2] سید احمد خاں " " " " ص ۵۔۶

۱۸۹۲ء کو دیا گیا ہے جو چھ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں وہ اپنی عقل پسندی کی مدافعت کرتے ہیں "میں نے بہت سے عالموں کو یہ بات کہتے سُنا ہے کہ فلاں بات دل میں نہیں بیٹھتی مگر قرآن یا حدیث میں آئی ہے مان لینی چاہیے۔ اس طرح مان لینے پر یقین اور ایمانِ کامل کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔" پھر محسن الملک کا جواب الجواب پندرہ صفحوں میں حیدرآباد دکن سے ۱۵ ستمبر ۱۸۹۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں وعدہ کیا گیا ہے کہ بعد میں ایک مفصل خط لکھا جائے گا اور اس بات کی تردید کی جائے گی کہ نام نہاد عقلیت پسندی خدا سے اور قانونِ قدرت سے انکار کے مترادف نہیں ہے۔ سر سید اس خط کا جواب الہ آباد سے چار صفحوں میں ۸ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو دیتے ہیں اور اس میں یہ تصریح ہے کہ محسن الملک کا موعودہ خط غالباً ان کی مصروفیت کے باعث نہیں لکھا جا سکا۔

اس کے بعد نفس کتاب میں (ص ۳۰ و مابعد پر) سید احمد خاں نے لکھا کہ:

"میرا ارادہ تھا کہ جب میری تفسیر پوری جاوے گی اور اول سے آخر تک قرآن بنظرِ غائر تمام ہو جائے گا اس وقت میں دیباچہ تفسیر لکھوں گا اور اس میں وہ تمام اصول بیان کروں گا جو تفسیر لکھنے میں میں نے اختیار کیے ہیں لکھدوں اور باقی اصول اس وقت پر منحصر رکھوں جب تفسیر تمام ہو جائے اور خدا کی مرضی ان کے لکھنے پر ہو۔ پس یہ چند مقدم اصول ہیں جن پر میری تفسیر مبنی ہے....

اور میں نے اس کا نام بھی تحریر فی اصول التفسیر رکھا ہے۔"[1]

ان کے بیان کردہ اصول پندرہ ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) اللہ ایک ہے اور خالقِ کائنات ہے (ص ۳۱)

(۲) اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء مبعوث کئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ برحق اور خاتم المرسلین ہیں (ص ۳۱)

(۳) قرآن مجید کلامِ الٰہی ہے جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوا۔ آپؐ جھوٹ نہیں بولتے تھے جیسا کہ قرآن ہی میں بیان ہوا ہے۔ (ص ۳۲)

---

[1] سید احمد خاں فی اصول التفسیر مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۲ء۔ ص ۳۰ تا ۳۱

(۴) قرآن مجید بلفظہ آنحضرت کے قلب پر نازل ہوا۔ عام علمائے اسلام کہتے ہیں کہ فرشتہ جبریل نے آنحضرت تک پہنچایا۔ میرا اپنا مذہب یہ ہے کہ ملکۂ نبوت نے جو روح الامین سے تعبیر کیا گیا ہے، آنحضرت کے قلب پر القا کیا ہے۔ پھر شاہ ولی اللہ دہلوی کی تفہیمات الٰہیہ کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ وحی میں صرف مفہوم آتا ہے، الفاظ رسول اللہ کے ہوتے اور اس کی سید احمد خاں نے تردید کی ہے (ص ۳۲ تا ۳۳)۔ اس پر ہم آگے دوبارہ بحث کریں گے۔

(۵) قرآن سارے کا سارا برحق ہے اور اس میں کوئی بات غلط یا خلاف واقعہ مندرج نہیں ہے (ص ۳۳)

(۶) خدا کی صفات ثبوتی و سلبی جو قرآن میں مذکور ہیں، سب درست ہیں مگر ان صفات کی ماہیت کا جیسا کہ وہ حقیقت میں ہیں، جاننا انسان کی عقل سے بالاتر ہے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ان صفات کے جو معنی مصدری ہیں وہ ذات باری میں موجود ہیں، یعنی علم، ایجاد، قدرت، حیات وغیرہ (ص ۳۴)

(۷) صفات باری عین ذات ہیں، چاہے ان کا ظہور کسی طرح سے ہو (ص ۳۵)

(۸) تمام صفات باری نا محدود اور مطلق عن القیود ہیں اسی لئے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے مگر وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا اس نے وعدہ کیا ہے کہ فطرت کے لئے اس نے جو قانون بنایا ہے اس کے خلاف نہ کرے گا (اس کے معنی ضمناً یہ ہیں کہ معجزوں کی توقع نہ کی جائے (ص ۳۵ تا ۴۲)

(۹) قرآن مجید میں کوئی ایسا امر نہیں ہے جو قانون فطرت کے برخلاف ہو (ص ۴۲ تا ۴۶)

معجزات کے متعلق شاہ ولی اللہ دہلوی نے "تفہیمات الٰہیہ" میں لکھا ہے کہ خدا ایک مرتبہ میں احدیہ ہے اور صفات سے بھی مجرد ہوتا ہے، تو دوسرے مرتبے میں وہ مقرون بالصفات ہوتا ہے اسی لئے نفس الامر کے مقامات میں تفاوت ہوتا ہے۔ ایک مقام میں اسباب پائے جاتے ہیں، اور ایک صورت میں علت و معلول اور سبب و مسبب ہوں گے اور ہمارے خیال میں صحیح بات یہ ہے کہ خدا نے اسباب کو نہ کبھی ترک کیا اور نہ آئندہ ترک کرے گا جیسا کہ قرآن میں ہے کہ:

"تو اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا"، جہاں تک معجزات اور کرامات کا تعلق ہے وہ امور اسبابی ہیں جن پر سبوع (؟) غالب آجاتا ہے۔ اس لئے وہ دیگر اسبابی امور سے

مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس اقتباس کے بعد سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ قرآن میں جن معجزوں کا ذکر آیا ہے وہاں الفاظ کے لغوی معنی دوسرے بھی ہو سکتے ہیں اور ان آیتوں میں کوئی چیز قانونِ فطرت کے خلاف نہیں نظر آتی۔ خود خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے قانون کے خلاف نہ کرے گا۔ اس لئے معجزے نہ پائے جاتے ہیں اور نہ پائے جا سکتے ہیں۔ آخرت کے متعلق جو بیانات ہیں وہ انسانی تفہیم سے بالا ہیں کیوں کہ ایک حدیث میں صراحت ہے کہ وہاں کی چیزیں ایسی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ سے کبھی دیکھا، نہ کسی کان نے کبھی سنا اور نہ کبھی وہ کسی ذہن میں آ سکیں اسی لئے جنت دوزخ جن کا خدا نے ذکر کیا ہے وہ استعارہ ہے (ص ۴۲ تا ۴۶)

(۱۰) سارا نازل شدہ قرآن محفوظ ہے۔ اس میں سے ایک حرف کم ہوا نہ زیادہ (ص ۴۶)

(۱۱) قرآنی سورتوں میں آیتوں کی ترتیب رسولِ خدا کی مقرر کردہ ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی الفوز الکبیر سے استنادکیا ہے (ص ۴۶ تا ۴۷)

(۱۲) قرآن میں ناسخ و منسوخ نہیں ہیں۔ قرآن میں جس نسخ کا ذکر آیا ہے وہ اسلام سے پہلے کی شریعتوں کے متعلق ہے (ص ۴۷)

(۱۳) قرآن مجید سارے کا سارا بہ یک وقت نازل نہیں ہوا بلکہ نجماً نجماً (پارچہ پارچہ) اور "وہ مختلف اوقات کے کلام کا مجموعہ ہے اور بطور ایک تصنیف کی ہوئی کتاب کے نہیں ہے جس میں مصنف ...... اس کے مضامین کو ترتیب خاص سے مرتب کرتا ہے"[1] اسی لئے اس کو ایک قصے کہانی کی کتاب نہیں سمجھنا چاہیے۔ آیات کی شانِ نزول پر کتابیں لکھی گئیں مگر ان کی بنیاد ضعیف روایات پر ہے۔ اس لئے زیادہ محتاط طریقہ یہ ہے کہ حتی المقدور صرف قرآن کے سیاق و سباق کلام سے ان کو تلاش کیا جائے اور جو اصول کہ قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کو ہر مقام پر ملحوظ رکھا جائے (ص ۴۸ تا ۵۰)

(۱۴) موجوداتِ عالم کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآنِ مجید میں کہا ہے وہ مطابق واقع ہے کہ خدا کا قول اس کے فعل کے خلاف نہیں ہوتا۔ قرآن مجید قولِ خدا ہے اور اس کی مصنوعات (مخلوقات)

---

[1] سید احمد خاں تفسیر فی اصول التفسیر مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۲ء ص ۴۸

فعل خدا میں سید احمد خاں نے کے قول کو "ورڈ آف گاڈ" اور اس کی مصنوعات کو "ورک آف گاڈ" سے تعبیر کیا ہے۔

(۱۵) قرآن مجید بلفظہ کلام خدا ہے مگر چونکہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کے معنی اس طرح پر لگائے جاویں گے جیسے ایک نہایت فصیح عربی زبان میں کلام کرنے والے کلام کے معنی لگائے جاتے ہیں ۔۔۔ قرآن مجید میں بھی استعارہ و مجاز و کنایہ و تشبیہ و تمثیل اور دلائل سب موجود ہیں"۔ الفاظ کے وہی معنی لئے جانے چاہئیں جن کے لئے وہ وضع ہوئے ہیں ۔۔۔۔۔۔ اگر وہ لفظ مشترک المعنی ہے تو یہ تحقیق کرنی ہوگی کہ وہ کس مقام پر کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ معنی کے تعین کے لئے لغت کی کتابوں اور اشعار جاہلیت کا لحاظ کیا جائے گا اور بعض جگہ لفظی معنی مقصود نہیں ہوں گے۔ مثلاً اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر سکنے کا ذکر محالات کے معنی میں لیا جائے گا ۔۔۔۔ قوانینِ فطرت سے بحث کرتے ہوئے طوفانِ نوح کا عالمگیر ہونا، حضرت ابراہیم کا آگ میں پھینکے جانے کے باوجود نہ جلنا، حضرت عیسٰی کا باکرہ عورت سے بغیر باپ کے پیدا ہونا، حضرت یونس کو مچھلی کا نگل جانا اور پھر صحیح سالم اس کے شکم سے نکل آنا وغیرہ ان معجزات کے متعلق سید احمد خاں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے کلام کی اتباع کریں گے، یہودی حکایات کی نہیں، اور چونکہ یہ حکایات قوانینِ فطرت کے خلاف ہیں اس لئے وہ غلط قرار دی جائیں گی اور وہ معنیٰ لیے جائیں گے جو مطابق فطرت ہیں۔ (ص ص ۵۱ - ۵۹)

اصول التفسیر میں چوتھے اصول کے تحت سید احمد خاں نے ایک اہم مسئلہ سے بحث کی ہے۔ اور اس کتاب کے آخر میں بھی اعادہ کیا ہے کہ آیا قرآن کے عربی الفاظ خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، یا کہ خدا نے صرف مفہوم کو وحی کیا اور یہ کام پیغمبر کا تھا کہ اس کو اپنے الفاظ میں بیان کریں؟ عیسائیوں کا اپنی مذہبی کتابوں کے متعلق جو نظریہ ہے، اس کے برخلاف سید احمد خاں سے کہتے ہیں کہ:

"مگر میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف مفہوم القا کیا گیا تھا اور الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جن سے آنحضرتؐ نے اپنی زبان سے جو عربی تھی اس مضمون کو بیان کیا ہے"۔[1]

---

[1] سید احمد خاں تحریر فی اصول التفسیر مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۲ء صفحہ ۳۲

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ القاء جبریل علیہ السلام کے ذریعہ سے ہوا ہو یا ملکۂ نبوت کے توسط سے جسے روح الامین سے تعبیر کیا جاتا ہے "ان دونوں کا نتیجہ متحد ہے اور اس پر بحث ضروری نہیں ہے۔"

وہ شاہ ولی اللہ سے اپنے اختلاف کو یکایک اردو کے بجائے عربی میں بیان کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ

"بڑی حیرت کی بات ہے کہ شاہ ولی اللہ جیسے بہت بڑے عالم نے اپنی کتاب "تفہیمات الہیہ" میں کہا ہے کہ تدلیات میں سے قرآن مجید بھی ہے اور وہ اس طرح کہ الفاظ قرآنی عربی زبان میں ہیں۔ جو رسول اللہ کے سوچنے اور بولنے کی مادری زبان تھی معنی مفہوم تو ان پر غیب سے اترتا تھا تاکہ آپ کو اس بات کی تعلیم ہو کہ وہ اسے کس طرح خلق دانسانوں تک پہنچائیں پس یہ مجموعہ (لفظ و معنی) کلام الٰہی بن جاتا ہے کیونکہ انسانوں کی بہبودی کا ارادہ رسول اللہ کی اس بات میں مدد کرتا ہے اور وہی ارادہ الفاظ کو جمع اور مرتب کرتا ہے اور پھر اس ترتیب کے کام میں مدد دے کر وہ لباس پہناتا ہے جو عالم جبروت کی صحیح صحیح نقل ہو اور اس طرح وہ تدلی الٰہی بن جاتا اور کلام اللہ سے موسوم ہوتا ہے۔"[۱]

اس اقتباس کے بعد عربی ہی میں سید احمد خاں اضافہ کرتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ

"ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تدلیات کی توضیح ہو اور شاہ ولی اللہ نے قرآن کو اس حیثیت سے کہ وہ معانی و مفہوم کا القاء ہے تدلیات کے تحت درج کر دیا ہو۔"[۲]

پھر وہ اردو میں لکھتے ہیں کہ: "مگر یہ قول شاہ صاحب کا عقل اور نفس الامر دونوں کے مخالف ہے..... نفس الامر کے اس لئے برخلاف ہے کہ خود تم اپنے نفس پر غور کرو کہ کوئی مضمون دل میں مجرد عن الالفاظ آ ہی نہیں سکتا اور نہ القا ہو سکتا ہے۔"[۳]

اس سے سید احمد خاں کا خیال واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شاہ ولی اللہ کی رائے سے متفق نہیں بلکہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا نے رسول محمد پر وحی کے ذریعہ مضامین اور الفاظ دونوں نازل کئے یعنی قرآن شریف مفہوم اور الفاظ کے اعتبار سے کلام ربانی ہے۔

---

[۱] سید احمد خاں تحریر فی اصول التفسیر مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۲ء ص ۵۸
[۲] ایضاً " " " " " ص ۴۳
[۳] ایضاً " " " " " ص ص ۴۳ ـ ۴۴

ابطال غلامی" المسمیٰ بہ تبریۃ الاسلام عن شین الامتہ والغلام

معہ ایک آرٹیکل کے کہ غلامی فطرت انسانی کے خلاف ہے ۶۰ ساٹھ صفحوں پر مشتمل مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۳ء میں شایع ہوئی۔ اس کا عربی ترجمہ "تبریۃ الاسلام عن شین الامتہ والغلام" کے نام سے ۱۸۹۵ء میں مطبع سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ سے نکلا۔

سید احمد خاں اس تحریک کے ہمعصر تھے جو انگلستان میں غلامی کو ختم کرنے کے لیے چل رہی تھی وہ اس کے عینی شاہد اور حامی تھے کہ یہ تحریک انسانی قدروں کی بناء پر کس طرح دنیا میں زور پکڑتی جارہی ہے انھوں نے اپنی تحریروں میں ثبوت فراہم کیا کہ اسلام غلامی کے خلاف ہے اور اپنے اس نظریے کو انھوں نے اس مذکورہ رسالہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ جب اسلامی قانون کی اصل اور ماخذ پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے غلامی کے انسداد کے لئے کوئی پیش قدمی نہیں کی جب کہ ان کے مذہب میں اسے قانوناً ختم کیا جا چکا ہے اس کے برعکس عیسائیوں نے اس کی کوشش کی حالانکہ اُن کے قانون میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔ اس صورت میں صرف دو باتیں ممکن ہیں۔

(الف) کوئی قانون اگر وحی الہٰی سے مدون ہے تو بھی سمجھ کر اس کی تعبیر کرنا انسانی فعل ہے یعنی قانون کے الفاظ کے معنی سمجھنے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ ایک متاخر عالم لوگوں کو اپنے علم سے اتنا متاثر کرسکتا ہے کہ وہ اس کی تعبیر پر عمل کرنے لگیں۔

(ب) اگر کوئی قرآنی حکم لازمی نہیں بلکہ مباح ہو تو کوئی شخص گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا چنانچہ مسلمانوں پر واجب نہیں ہوجاتا کہ وہ دوسروں کو غلام بنائیں۔ اس پس منظر میں سید احمد خاں کے نظریہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

تمہید: کتاب کے شروع میں دنیا کے مختلف ملکوں میں رائج غلامی کی تاریخ لکھی ہے۔ پھر صفحہ ۲ پر بیان کیا کہ "آزادی اور غلامی آپس میں ایسی نقیض ہیں کہ دونوں کا اجتماع نہیں ہوسکتا اور اس لئے یہ دونوں داخل مرضی پروردگار نہیں ہوسکتیں ورنہ خود پروردگار کی مرضی میں تناقص لازم آوے گا۔"

دنیا کے بیشتر ممالک میں غلامی کی تاریخ مختلف رہی ہے۔ سید احمد خاں کے خیال میں جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے "دھرم شاستر" کے مطابق غلامی مروج تھی اور مندرجہ ذیل

صورتوں میں ایک انسان دوسرے کو غلام بنا سکتا تھا۔

(الف) جنگی قیدی (ب) اگر کوئی قرض کے باعث یا قحط سالی کے وقت اپنے کو بیچ دے۔
(ج) بعض خاص جرائم کے ارتکاب پر عدالت کسی کو غلام بنانے کا حکم دے (د) ماں باپ غربت کی وجہ سے بچوں کو بیچ دیں (ھ) غلاموں کی اولاد۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ غلاموں کا بیع اور ہبہ سے تبادلہ تو عمل میں آسکتا تھا لیکن دو دھرم شاستر" میں ایسا کوئی حکم نہیں ملتا کہ وہ بے رحم آقا کے ظلم اور بدسلوکی سے محفوظ رہ سکیں مثلاً غلاموں کو اپنی کمائی سے استفادہ کا حق نہ تھا بلکہ وہ بھی مالک ہی کی پونجی ہوتی تھی۔ اگر غلام نے کسی خطرے سے آقا کی جان بچائی ہو تو وہ اور اس کا بیٹا مالک سے آزادی کی درخواست کر سکتا تھا۔ البتہ اگر آقا سے لونڈی کو اولاد پیدا ہو اور بیوی سے نہ ہو تو اس صورت میں لونڈی اور اس کے بچے آزاد ہو جاتے تھے (ص ۷-۸)

پھر وہ رومیوں کے قانون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ غلاموں کے متعلق بڑا سخت اور غیر انسانی تھا۔ محض تماشا دیکھنے اور دل بہلانے کے لئے نہتے غلاموں کو کئی دن کے بھوکے شیر کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا اور ان سے شدید محنت کا کام لیا جاتا تھا جب عیسائیت پھیلی ہابہاؤز نے (HOBHOUSE: MORAL IN EVOLUTION) میں لکھا کہ روما میں غلاموں کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی اور حقیقتاً بائیل میں بھی غلاموں کو آزاد کرنے کی سفارش کا ایک لفظ بھی نہیں ملتا جب نوآبادیاں وجود میں آئیں تو حبشی غلاموں کو بڑی مشقتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ سید احمد خاں نے نوآبادیوں سے غلامی ختم کرنے کے لئے انگریزوں کی کوششوں کو قابل تعریف بتایا۔

انیسویں صدی یعنی ہمارے مصنف کے زمانے میں ترکی اور مصر نے اس بارے میں عملی اقدام کئے لیکن دیگر اسلامی ممالک خاص کر سعودی عربیہ اس تحریک سے بے نیاز رہا۔ انھوں نے ولیم ہاورڈ رسل کا ایک قول نقل کیا کہ خدیو اسماعیل بادشاہ نے غلاموں کی آزادی کے لئے جو کام انسانی ہمدردی کا کیا وہ اسلام کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ سید احمد خاں کو اس بیان سے تکلیف ہوئی اور شاید اسی طرح کی آراء نے انھیں اس رسالے کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ وہ صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں کہ "یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسٰی مسیح نے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اس کی نسبت

کہا اس کو کسی نے نہ سمجھا، انھوں نے اس سلسلے میں لکھا: خدا تعالیٰ نے قرآن مجید (۹۰/۱۴۸) میں انسان کو اپنی چند نعمتیں یاد دلائیں کہ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ؟ اور کیا نہیں بتا دیے ہم نے اس کو (نیکی اور بدی کی گھاٹی) دو نمایاں راستے؟ کیا وہ گھس نہیں جائے گا؟ دشوار گذار گھاٹی میں؟ اور (اے محمدؐ) تجھے کیا معلوم کہ دشوار گذار گھاٹی کیا ہے؟ وہ غلاموں کو آزاد کرنا ہے۔ پھر ذیل کی آیت (۴۷/۴) کا ذکر کیا "اور لڑائی کے بعد جنگی قیدیوں کو چھوڑ دو یا تو احسان کر کے یا فدیہ لے کر" بعد ازاں انھوں نے ایک حدیث بغیر ماخذ بتائے نقل کی کہ "اللہ نے زمین کے پردہ پر کوئی چیز غلام آزاد کرنے سے زیادہ پیاری پیدا نہیں کی ہے۔"

باب اول ص ۲۶ تا ۲۸ میں سید احمد خاں نے ملک عرب میں اسلام سے قبل غلامی سے بحث کی ہے کہ وہاں غلاموں کو خریدا جا سکتا تھا اور وراثت میں بھی ملتے تھے۔ غلام کما کر اپنی قیمت ادا کرنے پر آزاد کیا جا سکتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں اپنے آپ کو بیچ دینے کا رواج سید احمد خاں کے خیال میں عرب میں یہودیوں سے آیا کیونکہ بائیبل (لیوی ٹیکس ۲۵/۳۹ تا ۴۲) میں اس کا ذکر ہے کہ بعض والدین اپنے چھوٹے بچوں کو فروخت کر دیتے تھے۔ پھر لیوی ٹیکس ۲۵/۴۴ تا ۴۶) کے مطابق لوگ چرا کر بھی کمسن لڑکے لڑکیوں کو دیگر مقامات پر بیچ دیتے تھے بالغ اشخاص بھی قید کر کے غلام بنائے جاتے تھے مثلاً دشمن قبیلے کے لوگ اجازت بغیر آ جاتے تو گرفتار کر لیئے جاتے تھے اور جنگی قیدی بھی چاہے مرد ہوں کہ عورت غلام بن جاتے تھے۔

باب دوم ص ۲۸ میں ہے کہ غلامی کی نسبت اسلام کیا کیا؟ سید احمد خاں کے نزدیک اسلام نے نئے لوگوں کو غلام بنانے کی ممانعت کر دی ہے اور پرانے غلاموں کی رہائی کی ترغیب دی۔

ص ۳۰: غلامی کے انسداد کے لیئے اہل مغرب نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ مادی ہیں مگر پیغمبر اسلامؐ کی "تدبیریں زیادہ تر روحانی چیزوں سے متعلق تھیں" چنانچہ آپ نے فرمایا کہ غلاموں کو آزاد کرنا اللہ کو بہت محبوب ہے اور بعض گناہوں کے کفارے میں غلام کو آزاد کرنا داخل کیا۔ ص ۳۱ پر سید احمد خاں نے سوال اٹھایا ہے کہ اگر غلامی معدوم کر دی

گئی تھی تو وہ احکام قرآن مجید میں کیوں دیے گئے؟ اس کا مفصل جواب دیا کہ یہ آیتیں قدیم غلاموں کے متعلق ہیں ۔ نئے لوگوں کو غلام بنانے کے لئے نہیں ۔

ص ۴۱ تا ۴۲ : آیت ۳۳/۵۰ میں رشتہ دار اور غیر رشتہ دار عورتوں کا ذکر ہے جن سے رسول اللہ نے نکاح کیا " اے نبی ہم نے حلال کیں تیری وہ بیویاں جن کا تو مہر دے چکا ہو اور جو تیرے دائیں ہاتھ کی ملکیت ہو چکی ہیں ۔ ان میں سے جن کو اللہ نے تجھ کو دیا ہے " سید احمد خاں نے یہاں بیان کیا کہ حضرت ماریہ قبطیہ کو مصر کے حکمراں مقوقس نے رسول اللہ کو بطور تحفہ بھیجا تھا ۔ اور فئی یا افاء کے معنی عام طور پر اس مال کے ہیں جو مسلمان کسی غیر مسلم سے بغیر لڑائی کے حاصل کرے اگرچہ مجازاً اس کے معنی جنگ کے مال غنیمت کے ہوتے ہیں اور یہ کہ تحفہ بھی فئی کہلاتا ہے " ۔

ص ۴۵ پر ایک دوسری قرآنی اصطلاح " رقبہ " ہے ۔ جس کے لفظی معنی " گردن " کے ہیں اور جو گناہوں کے کفارے میں یا خیرات کے طور پر آزاد کئے جانے والے غلام کے لئے برتی جاتی ہے سید احمد خاں نے اعادہ کیا ہے کہ اس میں نئے لوگوں کو غلام بنانے کا ذکر نہیں نیز یہ بھی کہ اگر کسی وقت کفارے میں آزاد کرنے کو غلام نہ ہو تو متبادل چیزیں غلام کی جگہ کفارے میں دی جا سکتی ہیں اور اس سے ضمناً مستقبل کی غلامی کی ممانعت ثابت ہوتی ہے ۔

ص ۴۷ پر اصطلاح " الرقاب " (رقبہ کی جمع) قرآن میں دو جگہ ۲/۱۷۷ اور ۹/۶۰ میں آئی ہے سید احمد خاں کے خیال میں رقاب کی مدد کرنے کا حکم قدیم الوقت غلاموں کے لئے ہے نئے غلام بنانے کے لئے نہیں ۔

ص ۴۸ پر " عبد " کا لفظ غلام کے معنی میں قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے مگر مستقل غلام بنانے کے لئے نہیں ۔

ص ۴۹ پر لفظ اُمتہ (جمع اماء) لونڈی کے معنی میں آیت ۲/۲۲۱ اور ۲۴/۳۳ میں آیا ہے اور ص ۵۰ پر لفظ " فتیات " بھی لونڈی کے لئے مگر کہیں بھی مستقبل کی لونڈی کا ذکر نہیں ۔

باب سوم ص ۵۱ تا ۶۲ میں جنگ میں غلامی کو تسلط اور استیلا قرار دیا ہے نیز یہ بھی کہ اسلام میں سارے انسان آزاد اور برابر ہوتے ہیں ۔ محض تحفہ دینے یا فروخت کر دینے

سے کوئی غلام نہیں بن جاتا۔

سید احمد خاں کی رائے ہیں جنگ میں حاصل شدہ مال کو تو مالِ غنیمت کہا جا سکتا ہے مگر گرفتار انسانوں کو کیوں غلام بنایا جائے جبکہ اس کا قرآن و حدیث میں صراحت سے حکم نہیں۔
باب چہارم ص ۶۲-۷۱ میں اپنی رائے کے مطابق جنگی قیدیوں کو غلام بنانے سے مفصل بحث کی ہے۔

باب پنجم ص ۷۲ - ۱۰۶ میں جنگی قیدیوں سے برتاؤ کے متعلق قرآن کے حکم کو آیتِ حریت کا مفہوم یہ دیا ہے کہ جنگ کے اختتام پر جو دشمن گرفتار ہوں اُن کو مفت یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔
(جس میں قیدیوں کا باہم تبادلہ بھی شامل ہے)۔

باب ششم (ص ۱۰۶ - ۱۳۲) یہ ہے کہ آیت حریت کے نزول کے بعد کیا رسول اللہ نے کسی کو غلام بنایا؟ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی واقعات بیان کئے ص ۱۲۴ پر پانچواں واقعہ بنی تمیم کے قیدیوں کے متعلق ۹ھ یعنی فتح مکہ کے بعد کا ہے جس پر سید احمد خاں نے غلامی کے مکمل انسداد کے لئے اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔

باب ہفتم (ص ۱۳۲ - ۱۵۲) یہ وہ روایتیں درج ہیں کہ رسول اللہ نے کیا کسی کو لونڈی یا غلام بنایا؟ سید احمد خاں نے اپنے ثبوت میں آخری مثال غزوہ بنی المصطلق سے دی ہے کہ اس جنگ کے قیدیوں میں سے آپ نے ایک لونڈی حضرت جویریہ کو آزاد کر کے نکاح فرمالیا تو صحابیوں نے مال غنیمت میں ملی ہوئی ساری لونڈیوں اور غلاموں کو اس بناء پر بلا فدیہ رہا کر دیا کہ وہ سنت رسول اللہ کے رشتہ دار ہو گئے تھے۔ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ غلام بنانے کے حق میں نہیں تھے۔

سید احمد خاں ص ۱۵۲ پر دو اہم نکتوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں کہ:
"جنگی قیدیوں کے متعلق خلفائے راشدین کا طرزِ عمل کیا تھا؟ اور گزشتہ ہزار بارہ سو سال سے مسلمان فقہا کا کس بات پر اجماع رہا ہے؟ وہ خلفائے راشدین کا ادب سے ذکر کرنے کے بعد اس اشکال سے یہ کہہ کر گلو خلاصی کر لیتے ہیں کہ مسلمان مورخین کی کتابوں کے بیانات ناقابل اعتماد ہیں اور جہاں تک فقہا کے اجماع کا تعلق ہے اسے وہ اس بناء پر رد کر دیتے ہیں کہ ان فقہاء نے ایک

اجتہادی غلطی کا ارتکاب کیا کہ متاخر اجماع سے سابقہ اجماع منسوخ ہو سکتا ہے۔ پھر وہ صفحہ ۱۵۹ پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو غلامی کے جواز کی بدنامی سے جو ان کے مذہب میں نہیں ہے نجات حاصل کرنی چاہیے۔

سید احمد خاں کے خیال میں اسلام نے غلامی کو منسوخ کر دیا تھا وہ اپنے قارئین کو اس کا یقین دلانے کے لئے استنباط سے کام لیتے ہیں جس سے اُن کی نیک نیتی ظاہر ہوتی ہے۔

مذہبی رسالے اور آخری مضمون

سید احمد خاں نے مستقل تصانیف کے علاوہ چند ایسے مضامین لکھے جن کے موضوعات مختلف ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق وقتی مسائل سے تھا مگر ان کی افادیت آج بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔

ڈاکٹر ھنٹر کے الزامات کی تردید: ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" لکھی اس میں دو باتیں قابلِ توجہ تھیں۔ اوّل یہ کہ برطانوی حکومت کو مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ اسلام مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔
(DR. HUNTER) کی اس کتاب سے مسلمانانِ ہند کی حالت زیادہ خراب ہونے کا امکان تھا۔ چنانچہ سید احمد خاں نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کے الزامات کا مدلل جواب دیا جائے اس غرض سے انھوں نے اردو میں مضامین کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جن کی مجموعی تعداد چودہ ہے اور یہ مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مورخہ ۲۴ نومبر ۱۸۷۱ء سے ۲۳ فروری ۱۸۷۲ء تک چھپتے رہے ان کا انگریزی ترجمہ بہ یک وقت انگریزی روزنامہ "پاینیر" الٰہ آباد میں شایع ہوا۔ اردو کے ساتھ انگریزی ترجمہ کو ایک "ہمدرد قوم" نے کتابی شکل میں لندن سے بھی ۱۸۷۲ء

میں شایع کیا[1]

سید احمد خاں کے ان مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند بھی حکومتِ انگلشیہ کے اتنے ہی وفادار اور خیرخواہ ہیں جتنے ہندوستان کے دیگر باشندے اور یہ بات قطعاً غلط فہمی پر مبنی ہے کہ اسلام عام حالات میں غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے جواب میں مدلل طریقہ پر صراحت کر دی کہ ڈاکٹر ہنٹر کو مسلمانوں کی طرف سے بلاوجہ شک و شبہ پیدا ہوا اور جہاد کی فقہی تعریف کرتے ہوئے وہ اس الزام کی تردید کرتے ہیں کہ اسلام حکومتِ وقت سے جہاد یا فوجی بغاوت پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ صلح و دوستی کا سبق اور مل جل کر رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

"ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانے کیلئے" سید احمد خاں نے کونسل کی رکنیت کے دوران مسلمانوں کی فلاح کے لئے یہ رسالہ ۵ نومبر ۱۸۷۹ء میں شایع کیا۔ اس مسودۂ قانون کی افادیت سے مسلمانانِ ہند کو آگاہ کرنے، اس کے منظور کیے جانے کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے نیز اس کی خوبیوں سے مستفید ہونے کی غرض سے پہلے انھوں نے اسے تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور دیگر اخبارات میں چھاپا اور اس کی غرض و غایت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

> "مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے اور جو امیر اور ذی مقدور خاندان تھے ان کی اولاد نہایت غریب اور مفلس ہو گئی ہے اور جو باقی ہیں دو پشت میں ان کی جائدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر قرضہ میں بک جاویں گی اس لئے مجھ کو اس بات کا خیال پیدا ہوا ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کی جاوے جس سے مسلمانوں کی ریاستیں قائم رہیں اور مسلمانوں میں ذی مقدور لوگ دکھائی دیں جن سے مسلمانوں کی قوم میں عزت اور امتیاز قائم رہے اور وہ تدبیر بھی ایسی ہونی چاہیے کہ سنی اور شیعہ دونوں فریق کے فقہ کے مطابق

---

[1] ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا از روئے ایمان ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنی فرض ہے" پر سید احمد خاں کی نکتہ چینی جس کو ایک مسلمان نے جمع کر کے ہنری کنگ اینڈ کو، ۶۵، کورن ہل لندن ۱۸۷۲ء

: OUR INDIAN MUSALMANS, HENRY KING AND CO., 65 CORN HILL LONDON, L872.

ہو اور دونوں فریق کے مسایل مسلمہ مذہب کے برخلاف نہ ہو۔"[1]

پھر انھوں نے مسلمانوں کو شرعی مسئلہ سے اس طرح آگاہ کیا کہ "زمانہ حیات میں ہر مالک کو از روئے شرع اختیار کامل حاصل ہوتا ہے۔ چاہے وہ اس کو بیع کر ڈالے، چاہے کسی کو بخش دے، چاہے وقف کر دے، چاہے ایک ثلث کی پابندی قواعد شرع وصیت کر دے۔"[2]

مسودہ قانون وقف خاندانی کے جواز کے طور پر انھوں نے "فتاویٰ عالمگیری" کے ایک "باب فی الوقف علیٰ نفسہ وعلیٰ اولادہ ونسلہ" سے کچھ روایتیں معہ ترجمہ نقل کی ہیں اور اسی طرح "روایات شرایع الاسلام فقہ مذہب شیعہ" سے بھی کچھ بیانات دیے ہیں پھر ان کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو مذہب کی رو سے وراثت اور وصیت کے علاوہ اپنی جائیداد کو امورات مذہبی اور اپنی ریاست کو وقف خاندانی کرنے کا اختیار ہے اُن کے مجوزہ قانون وقف خاندانی سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوں گے۔

وہ جائیداد ہمیشہ کے لئے قائم و موجود رہے گی۔ کوئی شخص اس کو تلف نہ کر سکے گا۔

جو جائیداد اس طرح وقف ہوگی اس میں وراثت جاری نہ ہو سکے گی یعنی تقسیم نہ ہوگی ہمیشہ بلا تقسیم ریاست قایم رہے گی۔

جو ترتیب اور قاعدے مالک جائیداد نے تجویز کئے آیندہ ان ہی پر عمل درآمد ہوگا۔ مثلاً بڑا بیٹا بطور متولی جانشین ہوگا اور جائیداد کی آمدنی سے جن لوگوں کو مالک نے دینا تجویز کیا ہے اس پر عمل کرتا رہے گا۔

جانشینی کی ترتیب بالکلیہ مالک جائداد کی مرضی پر مقرر ہے اور شرع کی رو سے اختیار ہے کہ مالک جائیداد جو مناسب سمجھے اس کے مطابق طریقۂ جانشینی مقرر کرے یہ شرعاً جائز ہوگا۔

---

[1] سید احمد خاں۔ ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کی مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۹۶ء صفحہ ا

[2] ایضاً " " " "

مالکِ جائیداد کو اختیار ہے کہ جس جس مقدار سے مناسب سمجھے اور جس کے لئے مناسب سمجھے اس کی آمدنی سالانہ مقرر کرے اس میں کوئی قید اور ممانعت شرع کی رو سے نہیں۔

سید احمد خاں نے مجوزہ مسودہ قانون کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی:

" کہ سنی اور شیعہ دونوں فریق کے مذہب کے بالکل مطابق ہے اور جو مسئلہ شرعی اس وقت دونوں فریق کے فقہ کی کتابوں میں مندرج ہے اس کو زیادہ استحکام ہوجاتا ہے اور باایں ہمہ ہر شخص کو اختیار رہتا ہے کہ چاہے اس قانون کے مطابق عمل درآمد کرے چاہے نہ کرے"[1]

سید احمد خاں نے تحریر کیا کہ ہندوستان کے چند امراء اور رؤسا نے اس طرف پیش رفت کی تھی لیکن یہ ذاتی اقدام تھے اور حصولِ مقصد کے لئے ایسا کوئی ضابطہ یا کلیہ ترتیب نہیں دیا گیا تھا جس سے املاک وجائیداد کو استحکام حاصل ہو سکتا اور نہ ہی کوئی قاعدۂ جانشینی قرار دیا گیا جو غیر مشتبہ اور تنزع سے بری ہوتا۔ ان کے خیال میں سیدھے سادے انداز میں وقف کر دینے سے کوئی حکم حاکم وقت کا اس کی منظوری کی نسبت" نہیں ہو سکتا جو بموجب قول امام ابو حنیفہ ضروری ہے۔ اسی طرح اگر جانشین نالایق ہوا اور سرکار کو زر مالگذاری ادا نہ کرے تو کوئی " امر مذہبی یا قانونی مالگذاری ادا نہ کرنے کی بناء پر جائیداد کے نیلام ہونے سے نہیں بچا سکتا" غرضیکہ اگر یہ مسئلہ شرعی گورنمنٹ کی منظوری سے بذریعہ ایک قانون کے طے ہوجائے تو یہ تمام خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔

سید احمد خاں کی اس ذاتی تجویز پر جو عام ردعمل ہوا بقول حالی:

" بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعے سے اس کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا۔ بعضے شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور ممتاز لوگوں نے جلسے کئے اور اس تجویز کو نہایت پسند کیا۔ بعض نہایت مستند عالموں نے وقف خاندانی کے مسئلے کو تسلیم کیا اور اس کے جواز پر فتویٰ لکھ دیا مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاص کر مولوی ابو سعید عظیم آبادی اور اُن کے پیروؤں نے سخت مخالفت کی چنانچہ وقف خاندانی کے عدمِ جواز پر

---

[1] سید احمد خاں - ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندان کو تباہی سے بچانے کی۔ علی گڑھ نومبر ۱۸۷۹ء صفحہ ۱۰

فتوے لکھے گئے اور گورنمنٹ میں ان کے برخلاف عرضیاں اور میموریل بھیجی گئی"۔[1]

پھر وہ اس کو کونسل میں پیش نہ ہونے کی وجہ سے متاسف ہیں :

" افسوس ہے کہ وہ اس مسودے کو کونسل میں پیش نہ کر سکے، نہ اس لئے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہ تھا اور اس کی پابندی محض مالکِ جائیداد کی مرضی پر منحصر تھی بلکہ اس لئے کہ وہ اصول قانون کی رو سے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقیہہ کے مطابق بنایا گیا تھا اور فقہ کی رو سے ضرور تھا کہ جو وقف اس طرح اولاد کے لئے کیا جائے وہ وقف دوامی ہو نہ میعادی مگر ولایت کے مقننوں کی یہ رائے قطعی طور پر قرار پا چکی تھی کہ کسی جائیداد کو ہمیشہ کے لئے ناقابلِ انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچاتا ہے"۔[2]

سرکارِ انگلشیہ اوقاف کی دوامی حیثیت کے حق میں نہ تھی اور اس کو میعادی قرار دینا شرعاً جائز نہ تھا اس صورت حال سے دوچار ہونے پر سید احمد خاں نے مجبوراً اس مسودہ قانون کو کونسل میں پیش کرنے کا خیال ترک کر دیا اور ان کی یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔

" النظر فی بعض مسائل امام الھمام ابوحامد محمد غزالی" ایک سو بائیس صفحات پر مشتمل مطبوعہ فیض عام پریس علی گڑھ۔ یہ کتاب سید احمد خاں کے آٹھ مضامین و رسائل سے ترتیب دی گئی ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً امام غزالی کی تحریروں پر تنقید و تبصرہ کیا تھا۔ اس پر سنہ اشاعت مندرج نہیں البتہ مشمولہ رسالہ فی اصناف الفلاسفہ وعلومھم' کے آخری صفحے پر ۱۸۸۹ء تحریر ہے جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے مضامین (رسائل) بھی اسی سال چھپے اور بقول شیخ اسماعیل پانی پتی جنھیں سرسید کے نہایت عقیدت مند منشی سراج الدین نے اخبار سرمور گزٹ ناہن (گجرات) میں ۱۸۸۹ء کے دوران شایع کئے، صرف ایک مضمون " التفرقہ بین الاسلام والزندقہ پر ایک نظر" تہذیب الاخلاق شوال تا رمضان ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء صفحے ۱۰۲ تا ۱۳۹ پر طبع ہوا۔ ان مضامین کو اسماعیل پانی پتی نے "مقالات سرسید" کی تیسری جلد میں اخبار سرمور گزٹ

---

[1] الطاف حسین حالی: حیات جاوید مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء صفحہ ۲۴۰
[2] ایضاً " ۲۴۱

کی قایل ۱۸۸۹ء سے مع تاریخ اشاعت نقل کردیا ہے۔

امام غزالی کی جن تحریروں پر سید احمد خاں نے تبصرہ کیا وہ ان کی متفرق کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً المضنون بہ علیٰ اھلہ، المضنون بہ علیٰ غیر اھلہ، المنقذ من الضلال الاقتصاد فی الاعتقاد، التفرقہ بین الاسلام والزندقہ۔

النظر کے مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فی ذات اللّٰہ (المضنون بہ علیٰ غیر اھلہ)

۲۔ فی واردات القلبیہ (المنقذ من الضلال)

۳۔ فی اصناف الفلاسفہ وعلومھم (المنقذ من الضلال)

۴۔ فی الروح وحقیقتھا (المضنون بہ علی غیر اھلہ)

۵۔ فی اللوح والقلم (المضنون بہ علی غیر اھلہ)

۶۔ فی الصراط والمیزان (الاقتصاد فی الاعتقاد)

۷۔ فی ملئکۃ والجن والشیاطین (المضنون بہ علیٰ اھلہ)

۸۔ فی الاسلام والزندقہ (التفرقہ بین الاسلام والزندقہ)

مندرجہ بالاموضوعات کا تعلق ان اسلامی عقاید اور اسلامی فلسفہ سے ہے جن کے متعلق متقدمین اور علمائے متکلمین نے بہت کچھ لکھا ہے ان علماء میں امام غزالی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے عام روایت کے برخلاف اسلامی عقاید وتصورات کی تفہیم وتشریح میں عقلیت پسندی سے کام لیا اور تقلید سے اعلانیہ انحراف کی جسارت کی۔

ان کی نگارشات سے سید احمد خاں کی دلچسپی کا سبب بھی یہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اُن کی طرح تقلید کے قایل نہ تھے اور مذہب وعقاید کو عقل وبرہان کی کسوٹی پر کھرا کھوٹا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللّٰہ کے اندازِ فکر کی طرف سید احمد خاں کا جھکاؤ اس بناء پر تھا کہ یہ دونوں رسوم وقیود سے بڑی حد تک آزاد اور ان کے افکار مجتہدانہ تھے۔ ان بزرگوں کے خیالات سے سید احمد خاں کے مذہب کے تصور کو تقویت ملتی تھی۔

اسے امام غزالی کی تربیت کا فیض کہنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے مرشد معنوی کی تحریروں میں جہاں کہیں کسی طرح کا تسامح یا تناقض پایا، بے جھجک اس کی نشان دہی کی۔ چنانچہ انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں بھی امام غزالی پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے بہت سے مقامات پر ان کی تردید کی ہے کہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ باوجود اپنی آزاد خیالی اور روشن دماغی کے تقلید کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے تھے:

"انسان کا دماغ کیسا ہی روشن ہو جاوے اور وہ کیسی ہی دلی قوت اور نڈر جرأت اور بے خوف ملامت اون تعلیمی، تربیتی اور تقلیدی بندشوں کو توڑنا چاہے جن سے وہ اپنے چھٹپن سے بندھا ہوا ہے پھر بھی کوئی نہ کوئی بندش اوس کو باندھے رہتی ہے ہمارے ہاں کے علماء کا بھی جنھوں نے اور بندشوں کو توڑا اور میدانِ تحقیق میں بہادرانہ قدم رکھا اور جن کا سلسلہ رحمۃ اللہ ولی اللہ پر ختم ہوتا ہے یہی حال ہوا ہے۔ ان کی تصانیف میں اون سخت بندشوں کے جا بجا گہرے نشان پائے جاتے ہیں، نہایت عالی دماغی سے ایک عمدہ مضمون لکھتے چلے جاتے ہیں، جو مثل ایک شفاف اور خوشگوار دریا کے بہتا چلا جاتا ہے پھر جا کر اسی بند میں بند ہو جاتا ہے اور سڑا ہوا پانی معلوم ہوتا ہے۔ اون کی تصانیف کے ایک صفحہ کو دیکھو الہام ربانی معلوم ہوتا ہے اور دوسرے صفحے پر ایسا مضمون آجاتا ہے کہ جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔" [1]

سید احمد خاں نے امام غزالی کے رسالہ "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" (جو ۸۵ صفحات پر مشتمل ہے) پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ اس کے اکثر حصے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں اور ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

"ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم" مصنفہ سید احمد خاں مطبع مفید عام آگرہ پینسٹھ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا جس میں اصحاب الکہف والرقیم

---

[1] سید احمد خاں: النظر فی بعض مسائل الامام الہمام ابو حامد محمد غزالی مطبع فیض عام علی گڑھ ۱۸۸۹ء صفحہ ۳

کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کا سبب تالیف بیان کیا کہ:

"منجملہ اون قصّوں کے جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے ایک قصّہ اصحاب الکہف والرقیم کا ہے یہ قصّہ آنحضرت صلعم کی بعثت کے قبل ایشیا میں اور روم کے عیسائیوں میں اور عرب جاہلیت میں مشہور تھا اور جیسا کہ اس قسم کے قصّوں کا دستور ہے۔ بہت سی بے اصل اور عجیب وغریب باتیں اوس میں شامل ہو گئی تھیں۔ خدا تعالیٰ نے اوس قصّہ کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا اور بتایا کہ اصلی و صحیح قصّہ کیا ہے مگر مفسرین اور مورخین نے بعوض اس کے کہ ان بے اصل کہانیوں کو جو مشہور تھیں اوس قصّہ سے علاحدہ کرے۔ قرآن مجید کی تفسیروں اور اون تاریخوں میں جو زمانۂ اسلام میں لکھی گئیں اس طرح شامل کر دیا کہ گو یا وہ کہانیاں اسلام کی ہیں حالانکہ اسلام اس قسم کی بے ہودہ کہانیوں سے بری ہے۔

اس امر پر خیال کر کے میں نے چاہا کہ قصّہ اصحاب الکہف والرقیم کو صاف طور پر جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے بیان کر دوں ۔۔۔۔۔۔ للہ الحمد کہ یہ کام پورا ہوا۔"[1]

پھر اُنھوں نے مفسرین قرآن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا:

" تمام مفسرین کی، سوائے معتزلہ کے یہ عادت ہے کہ اپنی تفسیروں میں محض بے سند اور افواہی روایتوں کو بلا تحقیق لکھتے چلے جاتے ہیں اور ذرا بھی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے علاوہ اس کے اُنھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے جہاں تک ہوسکے ہر ایک سیدھی سادی بات کو بھی حیرت انگیز طریقہ پر اور عجائبات و کرامات کے نمونے پر بیان کریں اوسی عادت کے موافق اصحاف کہف کے قصّہ میں بھی عجیب وغریب باتیں ملا دی ہیں مگر قرآن اون سب کو غلط بتاتا ہے۔"[2]

---

[1] سید احمد خاں۔ ترقیم فی قصّہ اصحاب الکہف والرقیم۔ مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۸۸۹ء صفحہ ۲-۲

[2] ایضاً صفحہ ۲۱-۲۲

سید احمد خاں نے رسالہ کے آغاز ہی میں چند سوالات اٹھائے ہیں مثلاً یہ کہ کیا اصحاب کہف اور اصحاب رقیم ایک ہی گروہ کے دو نام ہیں ؟ یا یہ دونوں الگ الگ گروہ ہیں ؟ وہ خود دونوں کو ایک ہی گروہ مانتے ہیں ۔ پھر انھوں نے اصحاب کہف کی تعداد، غار میں ان کا مدّت قیام اور اسی نوع کے دیگر مباحث سے گفتگو کی ہے ۔ اصحاب کہف کی تفسیر کرتے ہوئے ہمارے مصنف نے عام طور پر مفسرین سے اختلاف کیا ہے اور ایسی باتیں لکھدی ہیں جو اسلام کے عام عقاید اور تصورات سے مطابقت نہیں رکھتیں ۔

سید احمد خاں نے لکھا کہ ابوالفدا کی تحقیق کے مطابق اصحاب کہف ۲۵۰ء میں تھے (اور یہ قراین سے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے) جہاں تک اصحاب کہف کے مذہب کا تعلق ہے وہ عیسائی اور حضرت عیسٰی کی امت میں تھے اور ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ایک ظالم بُت پرست بادشاہ کے خوف سے جو عیسائیوں کو قتل کرتا تھا، اپنی جان اور ایمان بچانے کی خاطر ترک وطن کیا تھا۔ انھوں نے بارنگ گولڈ کی کتاب "کیورس متھس آف دی میڈل ایجز" کے پندرہ صفحات کا ترجمہ جواز کے طور پر اپنے رسالے میں شامل کیا ہے جن میں سات سونے والے اصحاب کہف اور ان کے احوال وکوائف کی تفصیل ملتی ہے اور مصنف نے اپنے بیانات کی تائید میں تاریخی شواہد پیش کئے

"ازالۃ الغین عن ذی القرنین" چونتیس ۳۴ صفحوں میں ۱۸۸۹ء میں مفید عام آگرہ سے چھپا جس میں سید احمد خاں نے ذی القرنین اور یاجوج ماجوج کی روایتوں کی تحقیق کی اور ان سے متعلق آیاتِ کریمہ کی تفسیر منطقی اور تجزیاتی اعتبار سے پیش کی ہے انھوں نے اس رسالے کی وجہ تسمیہ ذیل کی سطور میں بیان کی :

"اس رسالے میں میرا قصد ہے کہ سدّ یاجوج ماجوج کی بابت جو قصّہ ذوالقرنین کا قرآن مجید میں مذکور ہے اس کو مورخانہ تحقیقات سے بیان کروں اور قرآن مجید کی آیتوں کو واقعی حالات سے مطابق کر کے دکھلاؤں کہ درحقیقت وہ قصّہ کیا ہے اور جس قدر بے سند اور ناقابلِ قبول روایتیں ہماری کتابوں اور تفسیروں میں اوس کے ساتھ شامل کی ہیں اون سے لوگوں کو آگاہ کروں اور جو حقیقت اوس قصّہ کی ہے اور اس کو کھول دوں اس لئے

میں نے اس رسالہ کا نام ازالتہ الغین عن ذی القرنین رکھا ہے اور خدا سے
اُمید ہے کہ ویسا ہی وہ ہوگا۔" [1]

اُن کے خیال میں ذی القرنین اور یاجوج ماجوج کی حکایت قرآن کریم میں صاف وسادے طریقہ پر بیان ہوئی ہے لیکن مفسرین نے اسے چیستاں بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں جس دیوار کا ذکر قرآن میں آیا ہے اُس سے دیوارِ چین مراد ہے جو چین اور تاتار کی سرحدوں پر بنائی گئی ہے جسے چی وانگ ٹی فغفور چین نے ۲۲۴۔۲۳۵ قبل مسیح میں بنوایا تھا۔

سید احمد خاں نے رسالے کے آخر میں جیمس کرکارن کی "تاریخ چین" کے ایک باب کا اردو ترجمہ نقل کیا ہے جو چی وانگ ٹی فغفور چین کے متعلق تفصیلات فراہم کرتا ہے۔

"تفسیر الجن والجان علیٰ ما فی القرآن" اڑتالیس صفحوں میں محمد قادر علی خاں صوفی کے زیر اہتمام مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۱ء میں شایع ہوا۔ اس رسالے میں سید احمد خاں نے جن اور جان کے الفاظ سے بحث کرتے ہوئے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنوں کا مستقل بالذات وجود نہیں اور نہ یہ انسانوں کی طرح کوئی مخلوق ہے جو اس دُنیائے آب و گِل میں پائی جاتی ہو اور اپنی بعض خلقی خصوصیات کی بناء پر انسان کی نظر سے اوجھل رہتی ہو بلکہ یہ انسانوں کے اس گروہ کا نام ہے جس کا تصوّر عرب جاہلیت کے مزعوماتِ باطلہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس رسالے کی غایت و معنویت یوں بیان کی:

"اس رسالے میں ہمارا مقصد جن اور انس کے الفاظ سے جو قرآن مجید میں آئے ہیں بحث کرنا ہے مگر جس جگہ قرآن مجید میں جن یا جان کے لفظ کا شیطان کے نام پر اطلاق ہوا ہے اور ان سے اس رسالے میں بحث مقصود نہیں ہے کیوں کہ وہ بحث درحقیقت شیطان سے متعلق ہے۔" [2]

---

[1] سید احمد خاں۔ ازالتہ الغین عن ذی القرنین مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء صفحے ۲۔۳

[2] سید احمد خاں۔ تفسیر الجن والجان علی ما فی القرآن۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۱ء صفحہ ۲

انھوں نے سورہ کہف، سورہ حجر اور سورہ رحمان سے ایک ایک آیت نقل کی جہاں جن اور جان کا اطلاق شیطان پر ہوا اُس مقام پر وہ جن اور جان کو ہم معنی قرار دیتے ہیں اور اس سے شیطانِ رجیم (ابلیس) مُراد لیتے ہیں۔

پھر بقول سیّد احمد خاں عرب کے زمانۂ جاہلیت میں جن کا لفظ اُن وحشی لوگوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جو دن میں پہاڑوں جنگلوں اور غاروں میں چھپے رہتے اور رات کے اندھیرے میں باہر نکل کر لوٹ مار کرتے، آبادیوں اور قافلوں پر ڈاکہ ڈالتے اور پھر اپنے خفیہ ٹھکانوں کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ ان وحشیوں کی بہیمانہ خصوصیات کی بناء پر اُن سے متعلق عجیب و غریب توہمات رواج پا گئے تھے چنانچہ اُن کے باطل تصورات اسلام میں بھی برقرار رہے اور ان ہی باطل تصورات کی تردید میں بعض آیتیں نازل ہوئیں اور بعض آیتوں میں اُن کی طرف اشارہ کیا گیا۔ سیّد احمد خاں کی تحقیق کے مطابق جن کا لفظ بہ معنی مزعوم و مظنون عرب جاہلیہ میں استعمال ہوا ہے۔

اُن کا خیال تھا کہ جن یا جان کی اصطلاح قرآن مجید میں مختلف معنوں میں آئی ہے مثلاً کبھی شیطان کے لئے اور کبھی زمانہ جاہلیت کے عرب سرکش اور جنگلی انسانوں کے لئے اور یہ کہ جن کا ایک الگ مخلوق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

خلق الانسان علیٰ ما فی القرآن تیرہ صفحات پر مشتمل مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں شایع ہوا۔ اس مختصر رسالے میں سیّد احمد خاں نے تخلیقِ انسان سے متعلق قرآن مجید کی بعض آیتوں کی تفسیر لکھی ہے اور اس میں انھوں نے علمائے جمہور کے طریقہ کار سے الگ عقلی اور سائنسی انداز میں استدلال کیا ہے اور غیر اسلامی تصورات کی تردید بھی کی۔

مسلمانوں کے عام عقاید کو اسباب و علل کی کسوٹی پر پرکھ کر اور معقولیت سے ہم آہنگ کرنے کے بعد سیّد احمد خاں نے ڈارون کے نظریے کا ذکر کیا جس کا ان کے زمانے میں بڑا غلغلہ تھا اور اس سے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم سب ہی متاثر تھے چنانچہ انھوں نے اس کا تجزیہ ضروری سمجھا اور نظریۂ ارتقاء کی تردید کے لئے انھوں نے مندرجہ ذیل بنیاد پر توجہ کی:

"جب کہ ہم تمام موجوداتِ عالم پر بقدر طاقت بشری نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو قانونِ قدرت بنایا ہے اور اوس قانون کے مطابق جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں کہ ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی وعلیٰ ہذالقیاس نہایت مشابہ ہوتی ہیں۔ پہلی چیز سے دوسری چیز کسی قدر ترقی یافتہ ہوتی ہے مگر وہ ترقی ایسی خفیف ہوتی ہے جس سے وہ مشابہت جو پہلی کو دوسری سے ہوتی ہے بدستور باقی رہتی ہے"۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے کچھ حد تک متاثر تھے مگر اُسے پُورے طور پر تسلیم نہیں کیا تھا سید احمد خاں کے خیال میں ارتقاء کے سفر میں شروع کی کڑیوں کا بعد کی کڑیوں سے مختلف ہونا ایک امر طبعی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ ترقی کرتے کرتے اشیاء کی ماہیت (یا جنسیت) بالکل ہی تبدیل ہو جائے۔ لہٰذا قدیم وجدید انسانی گروہ کی شکل وشباہت میں تدریجی اعتبار سے فرق تو ہو سکتا ہے لیکن یہ مشکل ہے کہ بندر جو حیوانات میں سے ہے ترقی کرتے کرتے انسان ہو جائے اور اس نظریے نے دانشوروں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے اور دھوکہ کا اصل سبب یہ ہے کہ لوگوں نے ارتقاء کا صحیح تصور قایم نہ کیا۔

ان کے نزدیک دنیا کی عمر کا اندازہ کرنا محال ہے مگر اس نظریے کے حامیوں نے دنیا کی محدود عمر متعین کر کے اس امر میں اشتباہ پیدا کر دیا کہ چھ سات ہزار برس کی مختصر مدت میں انسانوں کی بڑی آبادی وجود میں آ سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے جواز میں کچھ دلیلیں پیش کیں اور دنیا کی عمر کو لا محدود بتایا ہے۔

سید احمد خاں نے آیاتِ قرآنی اور فیزیالوجی کے اُصول کے مابین مطابقت پیدا کر کے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے برخلاف انسان کی تخلیق کے بارے میں اسلامی نظریے کی تائید کی ہے اور اسے قرینِ قیاس بتایا ہے۔

الدعاوالاستجابۃ گیارہ صفحوں میں مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۲ء میں شایع ہوا۔ اس مختصر رسالے میں سید احمد خاں نے دعا اور استجابتِ دعا کے مسئلہ سے بحث کی ہے۔ انھوں

---

[1] سید احمد خاں خلق الانسان علیٰ مافی القرآن۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۲-۳

نے قرآنِ کریم سے وہ تمام آیتیں جمع کیں جن سے ان کا مفہوم متعین کیا جا سکے۔ پھر ان آیتوں کی تفسیر تحقیق کے ساتھ لکھی۔ نفسِ عبارت پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دُعا کے وہ معنی نہیں جو غلطی سے مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔ انھوں نے تیقن سے یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ دعاء کی قبولیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ سایل کے سوال کو اس کی عین منشاء اور خواہش کے مطابق پورا کرے۔ اور وہ دعا کو عبادت ثانی قرار دیتے ہیں اور استجابتِ دُعا اس ذہنی یا قلبی کیفیت کا نام ہے جو پُرخلوص عبادتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

سید آحمد خاں نے قرآنِ کریم کی چند آیتوں کے باہمی تقابل سے ثابت کیا ہے کہ "دعا اور "ندا،، (جس کے معنی پکارنے کے ہیں) دونوں مترادف ہیں جو عبادت کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ دُعا سے مُراد خدا کو پکارنا، اس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کو حاضر سمجھنا اور معبود برحق ہونا کا اقرار کرنا ہے۔ پس جو شخص اس طرح خدا کو پکارتا ہے۔ خدا اس کو قبول کرتا ہے۔[1]

پس یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک طرف کلامِ الٰہی میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا قبول کرتا ہے اور دوسری طرف بہت سی دُعائیں جو عاجزی اور اضطرار سے کی جاتی ہیں قبول نہیں ہوتیں۔ خدا کے کلام میں تضاد کا پایا جانا ممکن نہیں اس لئے دعا کے معنی بجز عبادت کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے استجابتِ دعا کے روایتی مفہوم میں یہ اشکال ظاہر کیا کہ دعائیں نوشتۂ تقدیر کو نہیں بدل سکتیں۔ مزید یہ کہ تقدیر کی دو قسمیں برم اور معلق قرار دینا بچوں کی باتیں ہیں۔

یہاں سید آحمد خاں نے اپنی تحریروں میں نظریاتی وحدت برقرار رکھنے کی غرض سے "مقدرات،، پر اصرار کیا کہ تقدیر اور فطرت دونوں کو غیر مبدل قرار دیا جائے تا کہ معجزات و کرامات وغیرہ خرقِ عادت اور ماورائے فطرت حقایق کی تردید کی جا سکے۔

انھوں نے اپنے موقف کی حمایت میں دلایل پیش کرنے کے بعد یہ رائے قایم کی کہ دعا جملہ عبادات میں سے ایک ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہر دُعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ایاکَ نعبُد و ایاکَ نستعین کی تاکید سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر امر میں خدا کے

---

[1] سید آحمد خاں۔ الدعا و الاستجابہ۔ مطبع مفید عام آگرہ۔ ۱۸۹۲ء صفحہ ۲

سوا کسی سے بھی مدد نہ چاہیں۔

ازواج مطہرات: سید احمد خاں کا آخری مضمون ان کے انتقال سے نو روز قبل بستر مرگ پر لکھا گیا اور ان کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شایع ہوا۔

ان کے لٹریری اسسٹنٹ وحیدالدین سلیم نے لکھا کہ "اس مضمون کو ایک عیسائی کے رسالہ "امہات المومنین" کے جواب میں حضرت رسالت مآب کی ازواج مطہرات کی حمایت میں لکھا تھا اور اس کے بعد کچھ لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہم اس مضمون کو بطور یادگار آخیر عمر سرسید کے طبع کرا کر شایع کرتے ہیں۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ سرسید نے مرتے دم تک اسلام کی حمایت میں زندگی بسر کی ہے"[1]

سید احمد خاں نے اپنے مضمون میں کہیں بھی کسی خاص رسالے کا ذکر نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس میں اُن اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی جو دیگر مذاہب والے آنحضرتؐ کی ذات پر کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بڑا اعتراض تعددِ ازدواج کے سلسلے میں بقول سید احمد خاں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت محمد کی گیارہ ازدواج تھیں۔ انھوں نے پچیس سال کی عمر میں پہلا نکاح حضرت خدیجہ سے کیا۔ معاشرہ میں کثیرالازدواج ہونے کی روایت کے باوجود انھوں نے حضرت خدیجہ کی زندگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا البتہ اُن کے انتقال کے بعد متعدد نکاح کئے ان میں حضرت عائشہ کے علاوہ تمام ازواج مطہرات بیوہ یا مطلقہ تھیں حضرت محمد کی بعثت اور اس سے قبل کے دور میں کثرت ازدواج کا رکھنا مذہب اور رسم و رواج دونوں اعتبار سے کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔

اسلام نے مروّجہ غیر محدود تعداد کو صرف چار تک محدود کر دیا۔ چنانچہ اس اصول کے تحت حکم صادر ہوا کہ جس مسلمان کے پاس چار سے زائد بیویاں ہوں وہ بھی بقیہ کو رخصت کرے اور تعداد کا خیال رکھے۔ اس حکم پر سب مسلمانوں نے بہ طیب خاطر عمل کیا۔ مناکحت کے سلسلے میں

---

[1] سید احمد خاں "ازواج مطہرات" سرسید کا سب سے آخری مضمون۔ مرتبہ وحیدالدین سلیم، مطبوعہ تجارتی پریس، علی گڑھ اور بعد میں یہ مضمون "آخری مضامین" مرتبہ مولوی امام الدین گجراتی مطبوعہ منزل نقشبندیہ بازار کشمیری بعد لاہور ۱۹۲۴ء میں (صفحہ ۱۳۱ تا ۱۵۴) شامل ہے۔

جو حکم الٰہی صادر ہوا تھا اس سے آنحضرت کی ذات مستثنیٰ تھی۔ معترضین کو اس استثنا پر بھی اعتراض تھا۔ سید احمد خاں نے اس کا جواب دیا کہ:

"کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ کیوں ایسا حکم نازل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ کی زوجیت میں جو عورت آگئی ہو اس سے پھر کوئی شخص نکاح نہیں کرسکتا مگر یہ حکم نہایت عمدہ ہے اگر اس کا امتناع نہ ہوتا تو اسلام میں نہایت فتور واقع ہوتا۔ یہ عورتیں اپنے نئے خاوند کے سبب اور ان کے مطلب کے موافق سینکڑوں حدیثیں اور روایتیں رسولِ خدا کی بیان کرتیں۔"[1]

حضرت محمد ان خواتین کو جو آپ کی منکوحہ تھیں طلاق نہیں دے سکتے تھے کہ ان سے دوسرے مردوں کو نکاح کی اجازت نہیں تھی۔ خدا نے آنحضرت کو بھی کسی زوجہ کے طلاق دینے یا مزید نکاح سے منع فرمایا تھا۔ اس موقع پر سورۂ الاحزاب کی آیت نازل ہوئی جس کا ذکر سید احمد خاں نے حسب ذیل الفاظ میں کیا:

"جس قدر ازواجِ مطہرات موجود ہیں اس کے بعد تیرے لئے عورتیں حلال نہیں ہیں اور یہ بات تیرے لئے حلال ہے کہ ان کی جگہ اور جوروؤں کو بدل لے۔"[2]

تعدد ازدواج کا ایک اور مقصد جس کی طرف سید احمد خاں نے اشارہ کیا یہ بھی تھا کہ حضورؐ عرب کے متعدد قبیلوں میں نکاح فرما کر ان کی حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ انھیں دعوتِ اسلام میں آسانی ہو کیونکہ اس زمانے کے دستور کے مطابق اگر کوئی شخص کسی قبیلہ کا داماد ہوتا تو سب اس کی عزت و تکریم کرتے تھے حضرت محمد کو اس طرح دوسرے بارسوخ قبایل کی حمایت ملی اور اشاعتِ اسلام میں آسانی ہوئی۔

ازدواج کے سلسلے میں "امہات المومنین" میں جو اعتراض کئے گئے ان کا سید احمد خاں نے تسلی بخش جواب دیا اور ہر زوجۂ مطہرہ کا الگ الگ اور قدرے تفصیل

---

[1] سید احمد خاں بر سید کا سب سے آخری مضمون مرتبہ وحید الدین سلیم مطبوعہ تجارتی پریس علی گڑھ صفحہ ۱۳

[2] ایضاً " " " " " " " "

سے ذکر کیا مثلاً حضرت حفصہ بنت حضرت عمر فاروق کے متعلق الزام تھا کہ آنحضرت نے انھیں طلاق دیدی تھی۔ سید احمد خاں نے اس روایت کو غلط کہا اور وضاحت کی حضرت عمر کے بیٹے عبداللہ نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور اس مسئلہ پر حضرت عمر نے محمدؐ کی رائے دریافت کرنی چاہی تھی شاید راویوں کو اس سے غلط فہمی ہوئی ہو۔

مذکرہ بالا رسالہ کے مصنف نے ازواجِ مطہرات میں سب سے زیادہ اعتراضات حضرت زینب بنت جحش کے سلسلے میں کئے تھے کہ آنحضرت خود زینب سے نکاح کرنا چاہتے تھے کہ ان کو اچانک دیکھ لیا تھا اور فریفتہ ہو گئے اور اس بات کو دوسروں سے چھپانا چاہتے تھے۔

سید احمد خاں نے جواباً لکھا کہ حضرت زینب ان کی پھوپی زاد بہن تھیں اور آنحضرت سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اس لئے اچانک دیکھنے اور شیفتگی کی بات بعید از عقل ہے۔ مزید برآں آنحضرت نے ان کا نکاح اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارث سے اپنی مرضی سے کروایا تھا جو غلام تھے اور آزاد کر کے اُن کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ شاید غلام ہونے کی بناء پر حضرت زینب انھیں شوہر بنانے پر رضامند نہیں تھیں لیکن پھر بھی انھوں نے رسول اللہ کے حکم کی تعمیل کی۔ نکاح کے بعد دونوں میں نباہ نہ ہو سکا اور انھوں نے علیٰحدہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ جب حضرت محمدؐ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس امر سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن دونوں میں صلح صفائی نہ ہو سکی اور زیدؓ نے طلاق دے دی۔ اس وقت کے دستور کے مطابق ایک غلام کی طلاق شدہ بیوی سے کوئی فرد نکاح کے لئے مشکل سے ہی راضی ہو سکتا تھا پھر عرب معاشرہ میں متبنیٰ کی بیوی سے نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا کیونکہ متبنیٰ کو وہاں حقیقی اولاد سمجھنے کی مضر رسم پڑ گئی تھی۔ اس کو ختم کرنے کے لئے رسولِ خدا سے بہتر اور موزوں کون ہو سکتا تھا؟ خدا کے حکم کی تعمیل میں حضرت زینب کا نکاح آنحضرت سے ہوا اس موقع پر آیت نازل ہوئی جس کے معنی ہیں کہ:

"یعنی زید نے اس کو طلاق دے دی اور عدت بھی پوری ہو گئی تو ہم نے اس کو تیری زوجیت میں دیا تاکہ مسلمانوں کو اپنے لے پالک بیٹوں کی جوروؤں کے ساتھ نکاح کرنے میں کچھ تردد نہ ہو جب کہ وہ بیبیاں عدت کے دن

پورے کرلیں"۔[1]

سید احمد خاں نے آخر میں ایک اور نکتے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کی کہ مخالفین کا اعتراض ہے کہ اگر منہ بولے بیٹے کی بیوی سے جب وہ طلاق پا جائے، نکاح جائز ہے تو پھر ازواج مطہرات کا دوسرے لوگوں سے نکاح کیوں جائز نہیں؟ ان کے خیال میں یہ سوال مہمل ہے کہ ازواج مطہرات سے نکاح اس لئے جائز نہیں کہ انھیں منہ بولی امہات قرار دیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو حضورؐ کے احترام کے لئے محرمات سے نوازا اور یہ سب کو معلوم ہے کہ محرمات سے نکاح کسی صورت میں جائز نہیں۔

افسوس ہے کہ ان کا یہ مضمون تشنہ اور نامکمل رہ گیا اور وہ گیارہ میں سے صرف سات یعنی خدیجہ بنت خویلد سودہ بنت زمعہ، حفصہ بنت عمر فاروق، ام حبیبہ بنت ابی سفیان، ام سلمہ بنت الجامیہ، زینب ام المساکین، زینب بنت جحش کا ذکر کر سکے۔ اس مضمون کا انداز تحریر معروضی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ انھوں نے کسی اعتراض کو اس وقت تک رد نہیں کیا جب تک اس کے نہ قبول کرنے کے لئے کوئی قوی دلیل ہاتھ نہ آگئی ہو۔ اور انھوں نے جوابی اعتراضات سے بھی احتراز کیا۔ سید احمد خاں کا طرز استدلال حکیمانہ اور منصفانہ ہے۔ وہ عقلیت پسند ہیں اور بعض مسائل میں انھوں نے قرآن و حدیث کے بیانات کی جو تاویل کی ہے اُن سے عام مسلمان علماء اتفاق نہیں کر سکتے اور اگر کسی تاریخی واقعہ یا روایت کا انھیں کوئی عقلی جواز نہیں ملتا تو نہ صرف اُس روایت کو غلط قرار دیتے ہیں بلکہ بسا اوقات پُرانے لوگوں کے خلاف سخت الفاظ بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

ان کا یہ آخری مضمون حضرت محمد صلعم سے غیر معمولی محبت کا دلاویز مرقع ہے۔

---

[1] سید احمد خاں۔ سرسید کا سب سے آخری مضمون مرتبہ وحیدالدین سلیم، تجارتی پریس علی گڑھ صفحہ ۲۴

ناقدین:

دنیا کے دیگر مصلحین کی طرح سید احمد خاں کو بھی اپنی زندگی میں مسلسل مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کسی مخالف کو اُن سے کوئی ذاتی پرخاش اور عداوت نہ تھی بلکہ زیادہ تر اختلاف ان کے مذہبی معتقدات سے تھا جو جمہور کے اعتقادات سے مختلف اور متضاد تھے۔ اُن کے زمانے میں عام طور پر اسلام کی جو تفسیر کی جاتی تھی وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اعتقاد ہوں یا اعمال دونوں میں بیرونی آمیزش ہو گئی ہے اور اسلام میں شعوری اور غیر شعوری طور پر وہ چیزیں داخل کر دی گئی ہیں جن کا اُس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اُس اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے نزدیک درست اور مستند تھیں۔ تعلیمات اور اعمال کی درستی اور صحت پر سید احمد خاں کے اصرار نے اُن کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا اور انھیں نیچری، کافر اور اسلام دشمن قرار دیا گیا۔ اُن کے خلاف علمائے اسلام نے فتاوے دیے۔ اس مخالفت کی زد میں اُن کا تعلیمی مشن بھی آ گیا کہ مدرستہ العلوم میں پڑھ کر بچے اسلام سے منحرف اور برگشتہ ہو جائیں گے۔

اس سلسلے میں با قاعدہ جہاد کرنے اور تحریر و تقریر سے اُن کی مخالفت کرنے میں چند ممتاز اشخاص پیش پیش تھے جنھیں الحاج سید علی بخش بدایونی، مولوی امداد علی، سید ناصر الدین المنصور، جمال الدین افغانی اور مرزا غلام احمد قادیانی قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات نے سید احمد خاں کے نظریات کے خلاف متعدد رسالے اور کتابچے لکھے جن کا ذکر اس باب میں قدرے تفصیل سے ہو گا۔

سید احمد خاں کے اصلاحی خیالات سے چاہے وہ معاشرے سے متعلق ہوں یا مذہب سے، ان کی زندگی ہی میں اکثر اشخاص نے دل و جاں سے تائید بھی کی اور انتقال کے بعد تو ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ مابعد کے موافقین میں عبدالحلیم شرر اور خواجہ غلام الثقلین کے

نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان ناقدانہ تصانیف کے علاوہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سید احمد خاں میں اسلامی معتقدات کے سلسلے میں جو مراسلت ہوئی تھی وہ "تصفیۃ العقائد" کے نام سے شایع ہوئی۔ ہم اُس مراسلت کا بھی خلاصہ یہاں درج کریں گے۔

سید احمد خاں عام طور سے مخالفین کے اعتراضات کے جوابات نہیں دیتے تھے۔ لیکن جب کبھی ان کو یہ احساس ہوتا تھا کہ ان کی باتوں کو مکمل طور پر سمجھا نہیں گیا ہے یا معترض نے کسی بناء پر اسے کچھ کا کچھ کر دیا ہے تو وہ دفاع میں اپنے خیالات کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔ علی بخش کی کتاب "تائیدِ اسلام" اور "شہابِ ثاقب" کے متعلق بھی انھوں نے صرف وہی باتیں لکھیں جو ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ناگزیر تھیں۔ انھوں نے جواب میں جو مقالہ لکھا اس کا عنوان "دافع البہتان" ہے۔ یہ تہذیب الاخلاق ۱۵ شعبان ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں شایع ہوا تھا۔[1]

تائیدِ اسلام:[2] مصنفہ الحاج علی بخش بدایونی میں سید احمد خاں کے خلاف تیس الزامات لگائے گئے ہیں مثلاً وہ ملحد ہیں خدا کے وجود اور اس کی تمام صفات کے اس طرح قایل نہیں جس طرح جمہور اسلام ہے سید احمد خاں نے خاص خاص اعتراضات کا سلسلہ وار جواب دیا ہے بلکہ بعض مقامات پر انھوں نے اپنی بات پر اصرار کیا ہے اور کہیں کہیں اِس غلط فہمی کو بھی دفع کیا ہے جس کے علی بخش شعوری یا غیر شعوری طور پر شکار ہو گئے تھے۔ ذیل میں اُن کے چند جوابات کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

اس رسالے میں اُن پر خدا کی ذات اور اس کی صفات سے منکر ہونے کا الزام ہے۔

سید احمد خاں نے جواب دیا کہ وہ ایسے خیالات بالکل نہیں رکھتے اور یہ سراسر بہتان ہے اور معترض نے رسالے میں بے جا جسارت سے کام لے کر ان کی باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک خدا کی ذات اور اس کی صفات ایک ہی ہیں۔

---

[1] تہذیب الاخلاق ۱۵ شعبان ۱۲۹۱ھ جلد پنجم شمارہ ۱۱۔ صفحہ ۱۳۲ تا ۱۵۷۔

[2] انھوں نے ایک اور رسالہ شہابِ ثاقب کے نام سے بھی لکھا تھا۔

ایک اور اعتراض تھا کہ ان کے خیال میں خیر و شر کا وجود عقل سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ پیغمبروں کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ انھوں نے جواب میں کہا یہ معتزلہ کا خیال ہے اور میں بھی اس سے بڑی حد تک متفق ہوں مگر میں پیغمبر کی اہمیت کا قایل ہوں۔

قرآن مجید میں رسول اللہ کو خاتم النبین یعنی "نبیوں کی مہر کا" کا خطاب دیا گیا ہے اور سید احمد خاں پر اعتراض ہے کہ ان کے نزدیک نبیوں کی مہر کے معنی آخری نبی کے نہیں ہیں۔ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "یہ کسی کافر کا عقیدہ ہوگا" پھر اعتراض کیا گیا کہ پیغمبروں کو سید احمد خاں "نیچری فلسفی" خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب میں پیغمبروں اور فلسفیوں میں وہی فرق بتایا جو چرواہے اور بکریوں کے ریوڑ میں ہوتا ہے۔

معترض نے جبر و قدر کے نہ ماننے کا اُن پر الزام لگایا اور یہ بھی کہ سید احمد خاں رسول اللہ کی جنگوں کو بھی ویسی ہی سمجھتے ہیں جیسی فرانس اور جرمنی کی تھیں انھوں نے وضاحت کی کہ میں جبر و قدر کا قایل ہوں اور ساتھ ہی انسانی کوشش کو بھی اہم سمجھتا ہوں اور غزوات رسول اللہ اس لئے ہوئے تھے کہ خدا کا بول بالا کیا جائے اس کا دوسرے ملکوں کی جنگوں سے کیا مقابلہ؟

علی بخش نے یہ الزام لگایا کہ وہ زہد و ریاضت کو ایک بیکار شئے سمجھتے ہیں اور یہ بھی کہ سید احمد خاں کے خیال میں رمضان کے روزے گرمیوں میں واجب نہیں" انھوں نے دونوں کے جواب میں لکھا کہ یہ محض معترض کی اختراع ہے۔

اُن پر تہمت لگائی گئی کہ وہ تھوڑی مقدار میں شراب پینا اور تھوڑا سا جوا کھیلنا ممنوع نہیں سمجھتے اور یہ بھی کہ " قرآن میں نماز اور زکات کا تو ذکر ہے ، دیگر ارکان اسلام کا نہیں۔ حسب سابق سید احمد خاں نے اُن سے انکار کیا ہے پھر یہ بھی کہ وہ تعدد ازدواج کے قائل نہیں اس پر جواب دیا کہ عدل شرط ہے اور کئی بیویوں میں عدل قائم رکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لئے اس حکم پر عمل پیرا ہونا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔

امداد الاحتساب علی مداھنین فی احکام طعام اھل الکتاب" ایک سو صفحات پر مشتمل مولوی امداد العلی اکبر آبادی نے مطبع منشی بہاری لال (کانپور) سے ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۵ر نومبر ۱۸۶۸ء میں چھپوا کر ایک ہزار جلدیں مسلمانوں میں مفت تقسیم کیں۔ اُن کی مخالفت

بنیادی طور پر سید احمد خاں کے دینی عقاید وخیالات سے تھی۔ مولوی امداد العلی بھی سید احمد خاں کی طرح انگریزی حکومت کے ملازم تھے انھوں نے بھی ایام غدر میں وفاداری اور جاں نثاری کی ایک مثال قائم کی تھی۔ ملی حمیت اور قومی ہمدردی دونوں کا مشترک جذبہ تھا لیکن مذہبی معاملات میں دونوں کا مزاج مختلف تھا۔ سید احمد خاں کی طبیعت اجتہاد کی طرف مائل تھی اور مولوی امداد العلی راسخ العقیدہ لیکن کٹر قسم کے مسلمان تھے وہ کتاب کی ابتداء اس طرح کرتے ہیں:۔

"سید امداد العلی اکبر آبادی کہتا ہے کہ بہت بُرا اور نہایت نادان وہ آدمی ہے کہ اپنے دین کی ادنیٰ باتوں کو جو مکروہ طبع ایک غیر ملت کے ہوں، پیرایۂ رضیات اوس قوم میں جھوٹی تاویلوں سے بیان کرے تاکہ یہ قوم دھوکے میں آکر اس سے راضی ہوں بالخصوص اس محل میں کہ یہ قوم صاحب دانش اور ذی شعور ہوں کہ اُن کو اس کے کام پسند آنا دشوار ہے"۔[1] وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"خلاف اہل اسلام ان دیار کے نصاریٰ کے ساتھ کھانا کھانا، اون کا طریقہ کرسی اور میز وں پر بیٹھ کر چھری اور کانٹے سے کھانا اون کو مرغوب ہے اور تشبّہ کے ساتھ نصاریٰ کو اون کو محبوب بھر طرہ اوس پر یہ کہ مداہین وجوہ رکیک، اوس کے جائز ہونے کے لئے بناکر اہل اسلام کی اِس وضع کا شریک کرنا چاہتے ہیں اور ہوائے نفس کے لئے دین کا کچھ خیال نہیں فرماتے"۔[2]

اپنے دعوٰی کے ثبوت میں انھوں نے متعدد معتبر احادیث پیش کی ہیں جس کا سید احمد خاں نے جواب دیا کہ اہل کتاب اور کافرین کے ساتھ عدم مواکلت کے احکام ابتدائے اسلام میں رائج تھے۔ بعدازاں یہ احکام منسوخ کردیے گئے۔

۱۸۶۶ء میں سید احمد خاں سے سوال کیا گیا کہ اگر کھانے میں کوئی چیز مثل شراب اور سُور کا گوشت نہ ہوں تو کیا انگریزوں کے ساتھ کھانا جائز ہے انھوں نے جواب میں قرآن اور مستند احادیث سے ثابت کیا کہ اہل کتاب کے ساتھ کھانا جائز ہے۔

---

[1] سید امداد العلی اکبر آبادی، امداد الاحتساب علی مداہین فی احکام طعام۔ مطبع بہاری لال کانپور ۱۸۶۸ء صفحہ ۲

[2] ایضاً " " " " صفحہ ۳تا۳

یہ مضمون "مسلمان اور انگریز" ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں" کے عنوان سے شایع ہوا[1]۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ امداد علی نے بقول سید احمد خاں لکھا کہ چونکہ انھوں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچا مانا ہے اور اسی سچے مذہب نے اُن کو سچ کہنا اور کرنا سکھایا ہے اور وہ شخص نہایت کمینہ ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے لوگوں کے لعن طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ اس لئے وہ کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سوٗر یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو کچھ تامل نہیں کرتے ان کے انگریز دوست اُن کے مہمان ہوتے اور وہ اُن کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ ان کے خیال میں جس چیز میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اُس میں دنیا کے لوگوں کا کیا ڈر ہے[2]

مولوی امداد العلی کو اُن کے اس خیال سے سخت اختلاف ہے۔ اِس رسالے میں انھوں نے سید احمد خاں کے ان تمام دلائل کی تردید کی ہے جن سے اہل کتاب کے ساتھ ربط و ضبط اور معاشرت و مواکلت کا جواز نکلتا ہے۔

مولوی امداد العلی نے سید احمد خاں کے "رسالہ احکام طعام اہل کتاب" کے جواب میں دوسرا رسالہ "مظاہر الحق" کے نام سے رمضان ۱۲۸۵ھ/آخر ۱۸۶۸ء میں لکھا اور اس کی بھی ایک ہزار جلدیں چھپوا کر "انتفاعِ عام" کے لئے "برادرانِ اسلام" میں مفت تقسیم کیں۔

رسالے کے آغاز میں مصنف نے اپنے مقاصد کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کی:

"سید امداد العلی اکبرآبادی کہتا ہے کہ جناب سید احمد خاں صاحب نے احکام طعام میں جو مداہنت کو کام فرمایا تھا اس خیر خواہ انام نے امداد الاحتساب میں بہ شرح و بسط اس مداہنت کو ظاہر کر دیا اور اب یہ رسالہ بہ طرزِ مختصر کہ نام اوس کا تاریخی "مظاہر الحق" ہے معہ مواکلت میں ساتھ اہل کتاب کے عام فہم لکھا ہے اور اس میں بیان کرنا چند اغلاط

---

[1] سید احمد خاں۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۴ ستمبر ۱۸۶۶ء۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ص ۲۹۶۔۲۹۷

[2] سید امداد علی۔ امداد الاحتساب مطبع بہاری لال کانپور ۱۸۶۸ء صفحہ ۲

جناب سیّد احمد خاں صاحب کا اِس " مراد سے ذکر، لوگ علم اور فضل اون کا اور بے احتیاطی اون کی دریافت کر کے دھوکہ نہ کھائیں۔ یہی مدِّ نظر ہے۔" لہ

سیّد احمد خاں نے اپنی تصنیف "تبیین الکلام" کے دیباچہ میں تحریفِ لفظی سے انکار کیا ہے اور تحریفِ معنوی پر اپنی دلیلیں قائم کی ہیں۔ مولوی امداد العلی نے اس رسالے کا آغاز ان دلیلوں کی تردید سے کیا اور اُن پر تحریفِ لفظی کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بحث انھوں نے احکامِ طعام اہلِ کتاب سے متعلق کی ہے اور متعدد احادیث کے ذریعے اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے کو ناپسندیدہ اور ناجائز بتایا اور حکم نفسِ طعام اور حکم طعام مع اہلِ کتاب پر الگ الگ روشنی ڈالی ہے۔

اس رسالے کے آخر میں امداد العلی نے ایک نقشہ اغلاط بھی شایع کیا ہے جن میں سیّد احمد خاں کی تصنیف احکامِ طعام اہلِ کتاب کی دس غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور متوازی کالم میں ان غلطیوں کی تصحیح بھی کر دی ہے۔

" امداد الآفاق برجم اهل النفاق بجواب پرچہ تھذیب الاخلاق: ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں مولوی امداد العلی نے ۸۰ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ مطبع نظامی کانپور سے شایع کیا اور اس میں مزید سیّد احمد خاں کے اُن مذہبی خیالات کی مخالفت کی جو وقتاً فوقتاً تہذیب الاخلاق میں شایع ہوتے رہتے تھے۔ انھوں نے لکھا کہ:

" دنیاوی امور میں اگرچہ انھوں نے ممتنعات کو بصورت ممکنات اور غیر واقعیات کو بصورت واقعیات نمایاں کیا ہو، بحث کرنے سے زبان اور قلم کو ہمیشہ روکتا رہا ہوں ہاں مذہبی مسائل میں جو انھوں نے صریح قرآن اور حدیث اور اجماع اہلِ اسلام سے خلاف کیا ہے اس میں البتہ حق کو ظاہر کرتا رہا ہوں اور مسائل دینی کو جو انھوں نے ملحدانہ طور پر بیان کیا ہے اوسی پر مسلمانوں کو بلکہ غیر مذہب والوں کو بھی آگاہ کرتا رہا ہوں۔" لہ

لہ مولوی امداد العلی، مظاہر الحق، مطبع نور کانپور ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء۔ ص ۲

لہ سیّد امداد العلی اکبرآبادی، امداد الآفاق برجم اہل النفاق بپرچہ تہذیب الاخلاق مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء ص ۲۔

ان نظریاتی اختلافات میں رفتہ رفتہ اتنی شدت پیدا ہوگئی کہ عقائد و خیالات کی تردید و تکذیب کے ساتھ ساتھ ذاتیات بھی زیرِ بحث آگئی۔ وہ سید احمد خاں کے ہم نواؤں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

" جھوٹ بولنا اور فساد کرنا ان کا شیوہ ہے۔" اُن کا مجوزہ مدرسہ اور اس میں تعلیم پانے والے طلبا کا بھی مذاق اڑایا ہے۔ بعدازاں اُن کے مذہبی عقائد سے جدا جدا بحث کی ہے۔ مثلاً مولوی امداد علی نے سید احمد خاں کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ ہر زمانے میں مجتہد ہو سکتے ہیں۔ سود کا مسئلہ تصویر اتروانا، میز کرسی پر کھانا کھانا، چھری کانٹے کا استعمال، مغربی لباس پہننا اور مختلف تقریبوں میں گرمجوشی سے جانے اور تیوہاروں میں شریک ہونے کے سلسلے میں سید احمد خاں نے جن خیالات کا اظہار تہذیب الاخلاق میں کیا تھا انھوں نے ان سب کا مفصل جواب لکھا اور غلط بتایا۔

ایک استفتاء پر انھوں نے خود بھی فتویٰ دیا اور مختلف شہروں مثلاً لکھنؤ، دہلی، کانپور، بھوپال، رام پور اور سہارنپور کے مختلف مکاتب فکر کے علماء سے اجتماعی یا انفرادی فتوے حاصل کئے اور اس کی نقلیں اپنے رسالے میں شایع کیں۔ انھوں نے سید احمد خاں کے خلاف جو فتاوے حاصل کئے اُن میں انھیں کافر، ملحد، مرتد، بے دین کہا گیا تھا اور یہ بھی الزام لگایا کہ وہ ذاتی اور دنیوی مصلحت کی بناء پر دین کی بیخ کنی کرنے پر آمادہ ہیں۔ اُن کا مذہب نیچریہ باطل اور موجب کفر و ضلالت ہے اور ان کا مجوزہ مدرسہ کفر و الحاد کا آلۂ کار ہے کیونکہ جہاں سید احمد خاں کے منشاء اور منصوبے کے تحت ہو اس کو مدرسہ کہنا اور تعلیم و تربیت کا ذریعہ سمجھنا دائرۂ آدمیت سے باہر ہے۔

" رسالہ امداد الآفاق" میں بہت سے ایسے فتوے جمع کر دیئے گئے ہیں جو سید احمد خاں کے خلاف مختلف مواقع پر حاصل کئے گئے تھے۔ غرض مولف رسالہ نے سارا زورِ قلم یہ ثابت کرنے پر صرف کر دیا کہ سید احمد خاں اور ان کی تمام سرگرمیاں مذہب و ملت کے لئے سخت مضر رساں اور اسلام کے منافی ہیں۔

"تنقیح البیان"، مصنفہ سید ناصر الدین ابوالمنصور دو سو انتیس صفحات مطبع نصرت المطابع دہلی سے ۱۲۹۶ھ مطابق آخر ۱۸۷۹ء شایع ہوئی۔

"تنقیح البیان" میں سید احمد خاں کے مذہبی عقائد کی تردید کرتے ہوئے سید ناصر الدین

ابوالمنصور نے انھیں فرقۂ نیچریہ کا بانی قرار دیا اور ان کی تفسیر القرآن (پہلی جلد جو اسی سال میں چھپی تھی) کو تفسیر بالرائے سے موسوم کیا یعنی بموجب ان کی رائے کے ترجمہ و تشریح کی گئی ہے۔
مصنف نے کتاب کا مقصد بیان کیا کہ:

"اصل مطلب اوس تفسیر کا تمام تفاسیر و مفسرین اسلام کے بے اعتباری اور تمام معجزاتِ انبیاء علیہم السلام کی بے اصلی اور علت غائی اسلام عین مطابقت نیچر اور دنیا حاصل کرنے کے لئے ہر عیب کو ہنر سمجھتا ہے چونکہ اُس کی تاثیر خدانخواستہ بہتوں کی گمراہی کا باعث ہوگی اس لئے میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا جواب جس قدر جلد ممکن ہو دیا جائے اور یہ اسی سال ۱۲۹۶ھ میں خدا کے فضل سے شایع ہو جائے۔"[1]

مولف نے ابتداً سید احمد خاں کے طریقۂ کار پر اعتراض کیا پھر آیاتِ قرآنی سے متعلق اُن کی تاویلات و تشریحات کی تردید کی۔ جہاں جہاں انھوں نے اپنی تفسیر میں علمائے جمہور کے برخلاف کوئی تاویل کی یا آیتوں کے معنی اور مفہوم اپنے عقاید و خیالات کے مطابق کئے ہیں تو ان کو معترض نے رد کرتے ہوئے دلیلیں پیش کیں۔ طریقہ وہی ہے جو اس وقت کے مذہبی طبقہ میں رائج تھا اور اعتراضات کا لہجہ تلخ و تند ہے اس کے بعد ان کا ایک اور رسالہ "تریاق" سید احمد خاں کے مذہبی خیالات سے متعلق آیا جس کا لہجہ تلخ تر ہے۔ رسالہ "تریاق در جواب تہذیب الاخلاق" سید ناصر الدین ابوالمنصور نے تئیس صفحوں میں ۱۸۸۰ء میں شایع کیا۔ اس رسالے کے دو حصے ہیں پہلا حصّہ پندرہ صفحوں میں تہذیب الاخلاق ۱۸۷۹ء ص ۵۳ - ۵۹ کے جواب میں اور دوسرا حصّہ سات صفحوں میں تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون "کرامت اور معجزہ" کے جواب میں لکھا ہے۔

رسالہ تریاق کی وجہ تسمیہ مولف نے مندرجہ ذیل جملوں میں بیان کی:

" ان دنوں مجموعہ تہذیب الاخلاق من ابتدائے ماہ جمادی الاول لغایت ماہ رمضان

---

[1] سید ناصر الدین ابوالمنصور۔ رسالہ تنقیح البیان نصرت المطابع، دہلی ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء صفحہ ۳

۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء جس کے بانی آنریبل سید احمد خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی

۔یا" میری نظر سے گزرا۔ پس مناسب معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں اپنی ذرا سی عقل

کو میں بھی آزماؤں اور دیکھوں کہ اہلِ علم و دانش اسے اور اس جواب کو ملاحظہ کر کے

کیا داد دیتے ہیں اور نام اس رسالہ کا "تریاق" رکھا۔ خدا اسے قبول فرمائے۔"[1]

سید احمد خاں نے اپنے مضمون بہ عنوان "مذہب انسان کا امر طبعی ہے" میں جن خیالات کا

اظہار کیا ہے اُن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ 'وحدتِ ادیان' اور 'صلحِ کل' کے قائل ہیں۔ انھوں نے

اپنے معتقدات و تصوّرات کی روشنی میں خالق و مخلوق کے رشتے اور انبیاء اور وحی کی حقیقت کو سمجھانے

کی کوشش کی اور ان کا خیال ہے کہ مذہبی اقدار اساسی طور پر یکساں اور عالم گیر ہیں اور سب میں

ایک قادرِ مطلق کی پرستش کی تلقین کی گئی ہے۔

رسالہ مذکور میں صفحہ گیارہ پر سید احمد خاں کی یہ عبارت دی ہے کہ "بانی اسلام نے بھی جو

درحقیقت سب سے بڑا انسان کر نیچر کا واعظ تھا یہی ہم کو بتایا ہے کہ تمام انسانی گروہوں میں پیشوا

ہوئے ہیں۔ جہاں کہ اس نے فرمایا کہ "وان من الامۃ الا خلا فیھا نذیر" اور دوسری جگہ فرمایا کہ

"لکل قوم ہاد"، اس قول کے جواب میں مولف رسالہ نے لکھا ہے:۔

"بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام تو جانتے بھی نہ تھے کہ نیچر کیا بلا ہے اور نہ یہ لفظ

کبھی اُن کی زبان پر جاری ہوا۔ اور لکل قوم ہاد سے یہ مراد نہیں ہے کہ سب دیوی

دیوتا پیغمبر تھے جنھوں نے قوم کو بت پرستی اور ہر طرح کی بُرائی سکھائی۔ مطلب یہ

ہے کہ جو پیغمبر کتاب آسمانی لے کر ایک ملک میں ظاہر ہوئے وہ تمام ملکوں کے واسطے

تھے۔ مثلاً حضرت پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عرب میں ظاہر ہونے سے کیا

تمام ہندوستان اور چین وغیرہ میں مسلمان نہیں ہیں یہ نئی شریعت خانصاحب بہادر

نے جاری کی کہ ہر ملک میں پیغمبر کا ہونا ضرور ہے۔ اب چند روز میں ہر ملک میں

ایک جداگانہ خدا ہونے کی بھی فرمائش کی جائے گی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کا

ایمان حضرت پیغمبر عربی پر بیکار ہے اور ہندوستان میں کسی پیغمبر کے مبعوث ہونے کا متوقع ہونا چاہیے یعنی

[1] سید ناصر الدین، تریاق، نصرت المطابع دہلی ۱۸۸۰ء۔ صفحہ ۲۔

اس ساری تمہید مقاصد خانصاحب سے صاف ظاہر ہے"۔[1]

اِسی لب ولہجہ میں دوسرے معاملات پر بھی تردید کی گئی ہے اور بسا اوقات تو جارحانہ طرزِ تحریر اختیار کیا گیا ہے۔

"تریاق" کے دوسرے حصے میں سید احمد خاں کے مضمون "کرامت اور معجزہ" سے متعدد مقامات نقل کئے ہیں مثال کے طور پر ایک جگہ سید احمد خاں کا قول ہے کہ:

"ہم اس امر کا ذکر نہیں کرتے جس کا وقوع پذیر اتفاقیہ نیچر کے قواعد کے موافق کسی دوسرے امر کے مقابل ہوا ہوا ور جس کو ہم کرامت اور معجزہ تصور کرتے ہیں بلکہ اوس کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کو لوگ کرامت اور معجزہ کہتے ہیں"۔[2]

مزید ان کی تحریر نقل ہے کہ:۔

"انسان کے دین و دنیا اور تمدن و معاشرت بلکہ زندگی کی حالت کو کرامت اور معجزہ پر یقین یا اعتماد رکھنے سے زیادہ خراب کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے"۔[3]

ناصر الدین ابوالمنصور نے معجزے کو دین کی ترقی و توسیع کا باعث قرار دیا اور اس کی حمایت میں استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ:

"معجزہ یا کرامت سے دین کا خراب ہو جانا بہ عجیب بات ہے حالانکہ محض ترقیِ دین کے واسطے معجزے دکھلائے جاتے ہیں چنانچہ انبیاء علیہم السلام سے سینکڑوں معجزے اِس کام کے واسطے ظاہر ہوئے"۔[3]

اسی طرح سید احمد خاں سے صفحہ ۲۲ پر منسوب ہے کہ انھوں نے جھوٹے اور مکار کراماتی لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ آخر انگلستان میں کراماتی لوگ کیوں نہیں پیدا ہوئے حالانکہ ان کے علمی اور فنی کارناموں پر اب معجزہ اور کرامات بھی متحیر ہیں۔

---

[1] سید ناصر الدین ابوالمنصور، تریاق۔ نصرت المطابع دہلی ۱۸۸۱ء۔ صفحہ ۱۱-۱۲
[2] ایضاً " " " " صفحہ ۱۷
[3] ایضاً " " " " " ۱۷

چنانچہ انھوں نے معجزہ اور کرامات پر یقین رکھنا جہالت کے مترادف قرار دیا۔

مولف رسالہ نے جھوٹے اور سچے کراماتیوں کے ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے صدور معجزہ کا جواز یہ پیش کیا ہے کہ "وحی والہام کی قلت کے سبب انبیاء علیہم السلام کو معجزے دکھانے کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی مگر اب وحی والہام کی کثرت ہو گئی ہے اور معجزے اور کرامت کی اوس قدر ضرورت نہیں رہی۔ لیکن مقاصد وحی کو تقویت دینے کی غرض سے اگر اب بھی کوئی ولی اللہ کرامت دکھائے تو ناجائز نہیں ہے"۔[1] ابوالمنصور نے معجزے اور کرامت سے انکار کی بناء پر سید احمد خاں کے حد سے گزر جانے کی سخت شکایت کی ہے۔

"رسالہ حقیقت مذہب نیچری بیان حال نیچریان"، مصنفہ جمال الدین حسینی ۱۹ ارمحرم ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰ء بزبان فارسی ۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں ۱۲ صفحات کا ایک ضمیمہ فرہنگ نیچریہ کے عنوان سے مندرج ہے۔ اس کے مصنف عام طور پر جمال الدین افغانی کے نام سے متعارف ہیں۔

رسالہ کے پہلے صفحہ پر ناشر کی جانب سے رسالے کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے

"ای دوست عزیز! نیچر عبارتست از طبیعت وہماں طریقہ دہریہ است کہ در قرن رابع و ثالث قبل از میلاد مسیح در یونانستان ظہور نمودہ بود و مقصود اصلی ایں طائفہ نیچریہ رفع ادیان و تاسیس اساس اباحت و اشتراک است در میانہ ہمہ مردم و از برائے اجرای ایں مقصد سعی ہائے بلیغ بکار بردہ اند و بلباسہائے مختلف خود ہا را ظاہر ساختہ اند۔ و در ہر امتے کہ ایں جماعت پیدا شدند اخلاق آں امت را فاسد کردہ سبب زوال آں گردیدند۔ و اگر کسے در مبادے و مقاصد ایں گروہ غور کند بخوبی برو ہویدا خواہد شد کہ بغیر از فساد مدنیت و تباہی ہیئت اجتماعیہ نتیجہ دیگرے بر آراء اینہاں مترتب نخواہد گردید"۔[2]

---

[1] سید ناصر الدین تریاق، نصرت المطابع دہلی ۱۸۸۰ء - صفحہ ۲۲

[2] سید جمال الدین حسینی حقیقت مذہب نیچری و بیان حال نیچریان بہ پیش لفظ محمد واصل حیدرآباد دکن ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء ص الف ب

(ترجمہ۔ اے عزیز دوست! نیچر یہ طریقہ دہریوں کا طریقہ ہے اس کا مقصد دین کی بیخ کنی اور اشتراکی فلسفہ کی اشاعت ہے۔ اسی فلسفہ کے مویدین نے اس کی ترویج اور توسیع میں بڑی مشقت اور کوشش سے کام لیا ہے اگر کوئی شخص مسئلہ مذکور کے مبادیات اور مقاصد پر غور کرے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کے حامیوں کا کام تمدن اور ہیئت اجتماعیہ کو نقصان پہونچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔)

اگرچہ سید جمال الدین حسینی (افغانی) کا روئے سخن براہِ راست سید احمد خاں کی طرف نہیں ہے لیکن یہ صاف عیاں ہے کہ ہدف ملامت کون ہے؟ مزید برآں کتاب کا نام بھی سید احمد خاں کی مخالف تحریروں میں شمار کرنے کا جواز پیش کرتا ہے۔ اس رسالے کے شروع میں محمد واصل مدرس ریاضی مدرسہ حیدر آباد دکن کا مندرجہ ذیل استفسار چھپا ہے۔

"دریں روزہا از تمامی ہندوستان چہ ممالک مغربیہ وشمالیہ وچہ اودھ وچہ پنجاب وچہ بنگالہ وچہ سندھ وچہ حیدر آباد دکن صدائے نیچر نیچر بگوش میرسد و در بلدہ وقصبہ معددی چند ملقب بہ نیچری یافت می شوند وچناں ظاہر می شود کہ ایں فرقہ ہمیشہ درازو یاد وافزونی است خصوصًا در مسلمانان و از اکثرے ازیں گروہ پرسیدم کہ حقیقت نیچر چیست و ایں طریقہ از چہ وقت ظاہر شدہ است۔ وآیا ایں جماعت نیچریہ بدیں مسلک جدید در اصلاح مدنیت میکوشند و باآنکہ ایشاں رامقصد دیگر لیست وآیا ایں طریقہ منافی دین ست و باآنکہ ہیچ وجہ مخالفتے بادین ندارد وچہ نسبت است درمیان آثار ایں طریقہ وآثار مطابق دین مدنیت ہیئتِ اجتماعیہ۔ و ایں طائفہ اگر قدیم بودہ است پس چرا تاکنوں درعالم منتشر نگر دیدہ است و اگر جدید است چہ اثرے بر وجود ایشاں مرتب خواہد شد۔"[1]

اس کا خلاصہ اردو میں یوں ہے کہ "آج کل سارے ہندوستان میں نیچر نیچر کی آواز گونج رہی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مویدین کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر مسلمان مجھ سے

[1] سید جمال الدین حسینی۔ حقیقت مذہب نیچری و بیان حال نیچریان محمد واصل حیدر آباد دکن۔ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء۔ صفحہ ب

پوچھتے ہیں کہ اس فرقے کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا ظہور کس طرح ہوا؟ اور کیا یہ طریقہ دین کے منافی ہے؟ اگر یہ طریقہ قدیم ہے تو اس کا اب اس قدر چرچا کیوں ہے؟ اور اگر جدید ہے تو اس کا ان لوگوں پر کیا اثر پڑے گا جو اس کے مخالف ہیں؟

گویا محمد واصل کے اس سوال پر کہ فرقہ نیچریہ کیا ہے؟ اور اسے قبول یا رد کرنے کے نتائج کیا پیدا ہوں گے؟ سید جمال الدین افغانی نے جواب میں یہ رسالہ لکھا۔ ذیل کے ایک اقتباس سے قارئین کو معلوم ہوگا کہ ان کی اس فرقہ سے متعلق کیا رائے ہے:

"برخود واجب دانستم کہ معنی حقیقی این کلمہ و مراد اصلی او را بیان کنم و حال نیچریاں را ز ابتدائے توضیح نمایم و مضار و مفاسد یکہ ازیں گروہ در عالم مدنیت و ہیئت اجتماعیہ سرزدہ است بر حسب تاریخ مفصلاً شرح و بسط دہم و ببرہان عقلی وا نمایم کہ ایں طائفہ دہر ملتی کہ یافت شود لا محالہ موجب زوال و اضمحلال آں ملت خواہد گردید"[1]

میرے لئے ضروری ہے کہ میں لفظ نیچریہ کے اصل معنی اور منشا کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دوں کہ جب جب یہ فرقۂ نیچریہ ظہور پذیر ہوا اس نے مدنیت اور ہیئت اجتماعیہ کو نقصان پہنچایا اور اس کو قبول کرنے کے بعد زوال اور اضمحلال کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

مصنف نے اپنے ان ہی خیالات کو مختلف طریقوں اور دلائل سے واضح کیا ہے۔

سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی دونوں اگرچہ ہم عصر تھے لیکن وہ سید جمال الدین سے عمر میں بیس برس بڑے تھے۔ دونوں میں کچھ باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ دونوں اسلام کے شیدائی، ملت اسلامیہ کے خیر خواہ اور عصر جدید کے مبصر اور اداشناس تھے لیکن چند چیزوں میں مطابقت کے ساتھ ساتھ دونوں کی افتاد طبع کی وجہ سے فرق تھا۔ سید جمال الدین افغانی میں مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کی کمی تھی۔ وہ کسی قسم کی مخالفت اور مخاصمت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ان کی سیماب صفت فطرت نے ان کو کسی ایک جگہ جم کر کام کرنے کی اجازت نہیں دی اس کے برعکس سید احمد خاں حلیم الطبع اور صابر و ضابط تھے ان کو شدید مخالفتوں اور نامساعد

---

[1] سید جمال الدین حسینی حقیقت مذہب نیچری و بیان حال نیچریان۔
مرتبہ محمد واصل حیدرآباد دکن ۱۲۹۸ھ / مطابق ۱۸۸۱ء ص ۱

حالات میں بھی کام کرنا آتا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنا لیا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے کم و بیش ایک جگہ رہ کر اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں ۔

سید احمد خاں کو جس قوم سے پالا پڑا تھا وہ ہر اعتبار سے مردہ، عقل سے کوری اور عمل سے محروم تھی۔ اِسے اپنی حالات زار کا نہ صحیح اندازہ تھا اور نہ اسے بدلنے کی کوئی تمنا۔ سید جمال الدین افغانی زیادہ خوش قسمت تھے کہ ان کا واسطہ افغانستان، ترکی، ایران اور مصر کے مسلمانوں سے تھا جو بیمار تو تھے لیکن مردہ نہیں۔ پھر ان ممالک میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ایسے ممالک میں مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کا کام کرنا مقابلتًا زیادہ آسان تھا۔

سید احمد خاں کے مذہبی اعتقادات سے جمال الدین افغانی کو کلی اتفاق نہ تھا اس لئے وہ ان کو بر سر غلط اور گم کردہ راہ سمجھتے تھے۔ انھیں اس معاملہ میں زیادہ قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ ہندوستان سے دور دراز ملکوں میں قیام کے باعث وہ ان کے اصلی خیالات سے واقف نہ تھے اس عدم واقفیت کی بناء پر انھوں نے جو رائے قایم کی وہ حقیقت پر مبنی نہیں تھی ۔

بہر نوع یہ تو امر مسلمہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی اور سید احمد خاں دونوں اسلام کو سچا اور فطری مذہب سمجھتے تھے دونوں اُمت مسلمہ کی بہتری کے خواہاں تھے۔ دونوں کا خیال تھا کہ مسلمانانِ عالم کی عملی ترقی مغربی علوم و فنون کے حصول کے بغیر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ مقصد کی مماثلت کے باوجود دونوں کا طریقۂ کار اور طرز عمل (اور کچھ حالات کی وجہ سے بھی) جُدا گانہ تھا ۔

تردید مسودۂ قانون وقف خاندانی: سید احمد خاں کے مجوزہ قانون کو کچھ لوگوں نے پسند کیا اور کچھ نے ناپسند۔ اس کی مخالفت میں مولانا محمد سعید پیش پیش تھے انکے علاوہ کچھ لوگوں نے بھی سید احمد خاں کے مجوزہ مسودہ قانون کی مخالفت میں رسالے چھپوائے اور مسلمانانِ ہند میں مفت تقسیم کئے۔ "تردید مسودۂ قانون وقف خاندانی" کے عنوان سے تین مختصر رسالے سرسید روم، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہیں اور یہ تینوں مختصر رسالے مطبع محمدی پٹنہ سے طبع ہوئے ہیں ۔

مولانا محمد سعید کا رسالہ درحقیقت ایک استفسار کا جواب ہے جس میں علمائے دین

سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ "سید احمد خاں بہادر کی مخالفت ان کی امور دین میں ان کے تہذیب الاخلاق اور تفسیر سے ظاہر و باہر ہے۔ یہ تمہید اٹھا کے ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کی ایک مسودہ قانون کا موسوم بہ وقف خاندان اہل اسلام چھاپ کر مشتہر کیا ہے اور چونکہ ان پر ثابت ہے کہ گورنمنٹ ایسے قانون کو بلحاظ دست اندازی امور مذہبی میں منظور نہیں کرے گی ....

مسلمان رئیسوں اور اہل خاندان کی اوس پر دستخط چاہی ہے ..... بہت سے شرائط اور ضوابط اس وقف کے مندرج کئے ہیں ... اور قاعدے پر ورثہ رشتہ داروں کے بنائے ہیں اور اختراع کئے ہیں کہ اوس میں حق تلفی ورثہ کی سوا جانشینی کے صریح ہے کیونکہ جو ماہیہ یا سالانہ ان کا مقرر کیا ہے وہ آمدنی کثیر میں اقل قلیل ہے اور بھی ایک زمان معین تک تفصیل اس کی موجب تطویل ہے اس واسطے ہم علماء سے پوچھتے ہیں کہ ایسا قانون بنانا موافق شرع کے ہے یا مخالف اور مسلمانوں کو اوس قانون کے اجراء میں کوشش کرنی موجب اثم عدوان کا ہے یا نہیں اور وقف علی نفسہ وعلی اولادہ واقاربہ میں ائمہ مجتہدین کے کیا مذہب ہیں اور جو کوئی کل مال یا اکثر مال اپنے نفس پر اور اولاد واقارب پر بطور اس قانون کے وقف کرے اس نیت سے کہ میراث میرے مال میں جاری نہ ہو۔ عنداللہ مستحق ثواب ہے یا عتاب۔" [1]

محمد سعید کے خیال میں ایسے قانون کا بنانا شریعت کے خلاف، بدعت و ضلالت کا باعث ہے کیونکہ سید احمد خاں کے مجوزہ قانون کی بناء اس نیت پر ہے کہ صاحب دولت مسلمان کے مال پر میراث جاری نہ ہو۔" پس مومنوں کو لازم ہے کہ کسی قانون جدید پر گو بنانے والا اوس کا مدعی بڑی دانش مندی کا ہو اور اظہار کیسی ہی خیر خواہی کا مسلمانوں کے حق میں کرے، سر نہ جھکائیں

---

[1] مولانا محمد سعید۔ تردید مسودۂ قانون وقف خاندانی۔ مطبع محمدی ٹپنہ ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء صفحہ ۲۱۔

اور اوس میں ضرر اپنا اور ضرر مسلمین کا سمجھیں۔" [1]

مولف رسالہ نے مزید بیان کیا کہ:

"جن مضرتوں کا خیال کرتے ہوئے سید احمد خاں نے اپنی تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے پیش کی ہے اس سے بھی وہ نقایص باقی رہتے ہیں جو قانون میراث کی بناء پر تقسیم جائیداد سے متصور ہے ..... اس میں کلام نہیں کہ امام ابوحنیفہ کے قول سے وقف علی نفسہٖ علیٰ اولادہ واقاربہ کا جواز نکلتا ہے لیکن وقف کا جو قاعدہ کلیہ سید احمد خاں نے مرتب کیا ہے امام ابوحنیفہ کے قول سے ثابت نہیں۔" [2]

سید آحمد خاں نے اپنے مسودہ قانون وراثت کے تحت املاک کی تقسیم اور وارثوں میں جائیداد ملنے کی امید پر محنت اور تعلیم و تربیت سے گریز کرنے اور بے جا شان و شوکت سے زندگی بسر کرنے کی خرابیوں کا ذکر کیا اور وراثت کے سبب پیدا ہونے والی جہالت کو بے عملی اور نام و نمود کی آفت سے تعبیر کیا ہے۔

مولانا محمد سعید کے رسالہ کے علاوہ "تردید مسودہ قانونی وقف خاندانی اہل اسلام" کے نام سے دو کتابچے اور بھی شایع ہوئے جن کے مولف صمصام الحق وکیل ساکن فرنگی محل لکھنؤ نے بارہ صفحات میں اور گلزار علی نے سولہ صفحوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا یہ دونوں رسالے مطبع محمدی پٹنہ سے باہتمام سید فضل کریم طبع ہوئے جن میں پہلے رسالے کی طرح سید احمد خاں کے مجوزہ قانون کو جارحانہ اور خلاف شریعت بتایا گیا ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے۔

"برکات الدعا" تحریر کردہ مرزا غلام احمد قادیانی بتیس ۳۲ صفحوں پر مشتمل بہ غرض انتفاع ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں شیخ نور احمد کے زیر اہتمام مطبع ریاض ہند قادیان ضلع گورداس پور سے شایع ہوا۔ انھوں نے اس رسالہ کو سید آحمد خاں کے "رسالہ الدعا الاستجابہ" اور "رسالہ تحریر فی اصول التفسیر" کے جواب میں لکھا۔ رسالے کے ابتدائی صفحات میں انھوں نے دعا

---

[1] مولانا محمد سعید۔ تردید مسودہ قانون وقف خاندانی مطبع محمدی پٹنہ ۱۸۷۱ء صفحہ ۲
[2] ایضاً " " " " " " صفحہ ۱۲ - ۱۳

اور اس کی قبولیت سے متعلق سید احمد خاں کے معتقدات کو باطل قرار دیا اور ضمناً ان کے دیگر مذہبی عقاید سے بھی بحث کی ہے۔ نصف سے زیادہ اوراق میں انھوں نے اپنے ذاتی اوصاف، کمالات اور فضائل کا ذکر کیا ہے پھر سید احمد خاں کے اس قول کی تردید کی کہ

" سید صاحب کا یہ مذہب ہے کہ دعا ذریعہ حصول مقصد نہیں ہو سکتی اور نہ تحصیل مقاصد کے لیے اس کا کچھ اثر ہے کیونکہ جس امر کا ہونا مقصود ہے اس کے لئے دعا کی حاجت نہیں اور جس کا ہونا مقدر نہیں اس کے لئے تفرع و ابتھال بے فایدہ ہے . . . .

اگر سید صاحب قرآن کریم کے سمجھنے کا فہم رسا نہیں رکھتے تھے تو کیا وہ قانون قدرت بھی جس کی پیروی کا وہ دم مارتے ہیں اور جس کو وہ خدا تعالیٰ کے فعلی ہدایت اور قرآن کریم کے اسرار غامضہ کا مفسر قرار دیتے ہیں۔ اس مضمون کے لکھتے وقت ان کی نظر سے غایب تھا،" [1]

اگلی سطور میں مصنف اس نتیجے پر پہنچے کہ:

" سید صاحب دعاؤں کی حقیقی فلاسفہ سے بے خبر ہیں اور ان کی اعلیٰ تاثیروں پر ذاتی تجربہ نہیں رکھتے اور ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی ایک پُرانی اور سال خوردہ اور مسلوب القوی دوا کو استعمال کرے اور پھر اس کو بے اثر پاکر اس دعا پر عام حکم لگا دے کہ اس میں کچھ تاثیر نہیں۔" [2]

وہ ذاتی تجربے کی مدد سے فلسفۂ دعا کے اُصولوں کی توثیق کرتے ہیں چنانچہ دعا کی حقیقت کو یوں بیان کیا:

" میں اپنے ذاتی تجربے سے بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعاؤں کی تاثیر آب و آتش کی تاثیر سے بڑھ کر ہے بلکہ اسباب طبیعہ کے سلسلے میں کوئی چیز ایسی عظیم التاثیر نہیں جیسی کہ دعا ہے۔" [3]

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی۔ برکات الدعا۔ مطبع ریاض ہند، قادیان۔ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء، صفحہ ۳

[2] ایضاً " " " " " " صفحہ ۳

[3] ایضاً " " " " " " صفحہ ۴

پھر اثر پذیری کے متعلق لکھا کہ:

"کامل کی دعاؤں میں ایک قوت تکوین پیدا ہو جاتی ہے یعنی باذنہ تعالیٰ وہ عالم سفلی اور علوی میں تصرف کرتی ہے اور عناصر اور اجرام فلکی اور انسانوں کے دلوں کو اس طرف لے آتی ہے جو طرف موید مطلوب ہے"[۱] پھر مشورہ دیا کہ:

"میرے نزدیک بہتر ہے کہ سید صاحب اپنے آخری دنوں کو یاد کرکے اس عاجز کی صحبت میں رہیں اور چونکہ میں "مامور" ہوں اور "مبشر" ہوں اس لئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ سید صاحب کے اطمینان کے لئے توجہ کروں گا"[۲]

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے رسالہ "برکات الدعا" میں سید احمد خاں کے "رسالہ تحریر فی اصول التفسیر" سے بھی تفصیلی بحث کی ہے ان کا اعتراض ہے کہ وہ استجاب دعا کے رسالے میں تو تقدیر کو مقدم سمجھتے ہیں اور اسباب عادیہ کو ہیچ خیال کرتے ہیں لیکن اصول التفسیر کے رسالے میں سرسید اس موقف کے برعکس تقدیر کو مطلقاً نظر انداز کر دیتے ہیں اور تمام اشیاء کا الگ وجود قرار دیتے ہیں (جن پر خدا تعالیٰ کا قبضہ و تصرف نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکتا ہے) سید احمد خاں نے "تحریر فی اصول التفسیر" کے سلسلے میں اپنے دوست محسن الملک کو لکھا تھا کہ وہ اس رسالے کے مندرجات سے اختلاف رکھتے ہیں تو وہ خود کچھ معیار متعین کریں۔ اس اشارہ پر اُن کے بجائے غلام احمد قادیانی نے عمل کیا اور اپنے رسالہ میں اُن کی رہبری کے لئے مندرجہ ذیل معیارِ تفسیر بیان کئے:

پہلا معیار یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کرتے وقت خود کلامِ ربّانی سے شواہد لئے جائیں۔ اس کی کوئی صداقت ایسی نہیں کہ جس کے کم از کم دس یا بیس شواہد خود اس میں نہ مل جائیں۔

دوسرا معیار خود رسول اللہ کی تفسیر ہے۔ اگر ہمیں ان کی کوئی تفسیر میسر آ جائے تو اُسے

---

[۱] مرزا غلام احمد قادیانی۔ برکات الدعا۔ مطبع ریاض ہند۔ قادیان ۱۰ ۱۳ھ/۱۸۹۳ء۔ صفحہ ۷

[۲] ایضاً " " " " " صفحہ ۲۵-۲۶

بلا کسی تامل کے قبول کر لینا چاہیے۔

تیسرا معیار صحابۂ کرام کی تفاسیر کا ہے اس لیے کہ وہ صاحبان قال ہی نہیں بلکہ صاحبانِ حال بھی تھے چوتھا معیار انسان کا اپنا نفس مطہر بھی صاحب برکات الدعا کے نزدیک ایک معیار ہے کیونکہ نفسِ مطہرہ کو قرآنِ کریم سے ایک خاص مناسبت ہے اور بقول ان کے " اس کے حقایق صرف اُن پر کھلتے ہیں جو پاک دل ہوں"۔

لغاتِ عربی کو بھی وہ ایک معیار سمجھتے ہیں "لیکن قرآنِ حکیم نے اپنے وسائل اس قدر فراہم کر دیے ہیں کہ چنداں لغتِ عربی کی تفتیش کی حاجت نہیں رہتی"۔[1]

مندرجہ بالا معیارات کے علاوہ انھوں نے دو اور معیار کی نشان دہی کی جن کا تعلق خود ان کی ذات اور ان کی رسالت سے ہے۔

رسالے کے آخر میں انھوں نے سید احمد خاں کو دعوت دی کہ وہ قرآن مجید کے اسرار اور حقایق کو سمجھنے کے لئے چند روز ان کے پاس ضرور آ کر رہیں اور "قوی امید ہے کہ خداوند کوئی ایسا نشان دکھا دے گا جو اُن کے مجوزہ قانونِ قدرت کو ایک دم خاک میں ملا دے گا"۔[2]

وہ دُعاؤں کے اثر و تاثیر کے قایل ہیں اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس باب میں وہ سید احمد خاں سے مختلف الرائے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال اصول التفسیر کے معاملہ میں بھی رہی ہے۔

"تصفیۃ العقاید" مراسلت مولانا محمد قاسم اور سید احمد خاں جو مطبع ہاشمی میرٹھ نہم شعبان ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں چھتیس ۳۶ صفحات میں طبع ہوئی۔ منشی محمد حیات مہتمم نے شروع میں اس مراسلت کی طباعت سے اُمید ظاہر کی ہے کہ قارئین کو اسلامی عقاید کے سمجھنے میں تصفیہ حاصل ہو سکے گا۔

اس مجموعۂ مکاتیب میں پہلا خط سید احمد خاں کا ہے جس میں وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جن کو وہ اپنے اسلامی تصوّرات کی اساس سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مولانا قاسم نانوتوی سے جو علوم اسلامی و عقلی میں مجتہدانہ مقام رکھتے تھے اپنی غلطیوں کی نشاندہی چاہی ہے۔ اور جن کے بغیر ان کے مذہبی معتقدات کو نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے ان کو مندرج کیا جاتا ہے۔

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی۔ برکات الدعا۔ مطبع ریاض ہند قادیان ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء صفحہ ۱۵-۱۷

[2] " " " " " " صفحہ ۲۶

اول۔ خدائے واحد ذوالجلال ازلی و ابدی، خالق و صانع تمام کائنات کا ہے

دوم۔ اس کا کلام اور جس کو اوسنے رسالت پر مبعوث کیا، اوس کا کلام ہرگز خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ نہیں ہوسکتا۔

سوم۔ قرآن مجید بلاشبہ کلام الٰہی ہے کوئی حرف اوسکا نہ خلافِ حقیقت ہے اور نہ خلافِ واقعہ

چہارم۔ قرآن مجید کی جس قدر آیات کہ ہم کو بظاہر خلاف حقیقت یا خلاف واقعہ معلوم ہوتی ہیں دو۲ حال سے خالی نہیں یا تو اون آیات کا مطلب سمجھنے میں ہم سے غلطی ہوئی ہے یا جس کو ہم نے حقیقت و اقعہ سمجھا ہے اوس میں غلطی کی ہے۔ اس کے برخلاف کسی محدث یا مفسر کا قول قابلِ تسلیم نہیں ہے۔

پنجم۔ جس قدر کلام الٰہی جناب پیغمبر خدا صلعم پر نازل ہوا وہ سب بین الدفتین موجود ہے۔ ایک حرف بھی اس سے خارج نہیں ہے۔

ششم۔ کوئی انسان سوائے رسولِ خدا صلعم کے ایسا نہیں ہے جس کا قول و فعل بلا سند قول و فعل رسول کے دینیات میں قابلِ تسلیم ہو یا جس کے عدم تسلیم سے کفر لازم آتا ہو۔

ہفتم۔ دینیات میں سنت نبوی کی اطاعت پر ہم مجبور ہیں اور دنیاوی امور میں مجاز۔ اس مقام پر سنت کے لفظ سے میری مُراد احکام دین ہیں فقط۔

ہشتم۔ احکام منصوصہ احکام دین بالیقین ہیں اور باقی مسائل اجتہادی اور قیاسی، سب ظنی ہیں۔

نہم۔ انسان خارج از طاقت انسانی مکلف نہیں ہوسکتا۔

دہم۔ افعال مامورہ فی نفسہٖ حسن ہیں اور افعال ممنوعہ فی نفسہٖ قبیح ہیں۔

یازدہم۔ تمام احکام مذہب اسلام کی فطرت کے مطابق ہیں۔

دوازدہم۔ وہ قویٰ جو خدائے تعالیٰ نے انسان میں پیدا کئے ہیں اون میں وہ قویٰ بھی ہیں جو انسان کے کسی فعل کے محرک ہوتے ہیں اور وہ قوت بھی جو اس فعل کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ ان تمام قویٰ کے استعمال پر انسان مختار ہے۔

سیزدہم۔ دین احکام اون مجموعِ احکام کا نام ہے جو یقینی من اللہ ہیں۔

چہاردہم۔ احکام دین اسلام دو قسم کے ہیں ایک وہ جو اصلی احکام دین کے ہیں اور وہ بالکل فطرت

کے مطابق ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اون اصلی احکام کی حفاظت مقصود ہے مگر اطاعت اور عمل دونوں میں اونکا رتبہ برابر ہے۔

پانزدہم۔ تمام افعال اور اقوال رسول خدا صلعم کے سچائی پر تھے۔ مصلحت وقت کی نسبت رسول کی طرف کرنی سخت بے ادبی ہے جس میں خوف کفر ہے۔

آخر میں سید احمد خاں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ انھوں نے اب تک جو کچھ تحریر کیا ہے ان ہی کی روشنی میں لکھا ہے پس اگر بزرگان سہارنپور ان اصول کی غلطی سے مجھے مطلع فرمائیں گے میں دل وجان سے شکریہ ادا کرونگا۔[1] اور انھوں نے اس کی بھی کوشش کی کہ دیوبند سے کسی اچھے عالم دین کو علی گڑھ کالج کے شعبۂ دینیات کی سربراہی کیلئے بلایا جائے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تصفیۃ العقاید میں سید احمد خاں کے متذکرہ بالا اصولوں کا مفصل جواب دیا ہے۔ انھوں نے وہ ساری باتیں بلا تکلف تسلیم کرلی ہیں جو عامۃ المسلمین کا عقیدہ اور مسلک ہیں لیکن جا بجا یہ بھی کہا ہے کہ عقاید اسلام یا احکام دین کے سمجھنے اور ان کی تعبیر اور تشریح میں عقل کو اتنا دخل نہ ہونا چاہیے جتنا خود رسالت مآب کے ارشادات اور حضور کے صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے آثار و اخبار کو۔ اس معاملے میں ذرا سی بد احتیاطی اور غفلت سے بڑی خرابی پیدا ہوسکتی ہے اور اس کا مرتکب گنہگار ٹھہرسکتا ہے۔ اس مراسلت میں مہذب طرز کلام، باہمی عقیدت وقدر دانی کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

سید احمد خاں کے ناقدین میں ان کے مویدین بھی شامل ہیں۔ مثلاً سید احمد خاں کی عنایت رسول چریا کوٹی (۱۸۲۸ء – ۱۹۰۲ء) سے غازی پور میں ایسی واقفیت اور موانست پیدا ہوئی جو آخر دم تک قائم رہی۔ انھوں نے اپنے علم وفضل سے توریت، انجیل اور زبور کی تفسیر لکھنے میں سرسید کی مدد کی اور سید سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق حمایت میں بعض بعض مسائل علمیہ پر انھوں نے رسالے بھی لکھے۔ محسن الملک بھی تازندگی ان کے علمی معاون رہے۔ مولوی چراغ علی بھی بڑے مددگار تھے۔ انھوں نے تحریر وتقریر کے ذریعے سرسید کی ہمیشہ معاونت کی اور شبلی جان نے بھی سید احمد خاں کے علم الکلام، اجتہاد اور مذہبی خیالات کی بڑی مثبت توجیہ کی۔ ان کے علاوہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ممتاز طالب علم خواجہ غلام الثقلین اور اردو ادیب عبدالحلیم شرر بھی قابل ذکر ہیں۔ جن اخبارات اور رسالوں نے ان کی حمایت میں مضامین شایع کیے ان میں پنجابی اخبار لاہور، کوہ نور، پیسہ اخبار، گجرات، اردو گائیڈ کلکتہ، اودھ اخبار، مرقع تہذیب لکھنؤ ہیں۔

[1] تصفیۃ العقاید، باہتمام محمد ہاشم علی، مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔ صفحہ ۵

"ابطال غلامی" پر ایک طویل تنقیدی مقالہ خواجہ غلام الثقلین نے "رسالہ حسن" کی اشاعت مورخہ دسمبر ۱۸۹۳ء کی جلد ۶ شمارہ نمبر ۱۲ میں شایع کیا پھر متذکرہ مضمون کو مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۴ء میں طبع کیا جو سید احمد خاں کے رسالہ کی تائید میں لکھا گیا تھا اور جس میں غلامی کی مذمت کی گئی تھی۔

مقالہ نگار نے قرآن حکیم کی آیات اور مستند احادیث سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام غلامی کے کلیتاً خلاف ہے اور جو لوگ غلامی کے حق میں ہیں ان کو ایسا کرنے کا کوئی جواز حاصل نہیں ہے۔ خواجہ غلام الثقلین نے بہت سے ایسے ممتاز مشرقی اور مغربی مفکرین اور علماء کا بھی ذکر کیا جو رسوم غلامی کے مخالف تھے۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں اس رسم بد کی ابتداء اور مروج ہونے کا حال بھی بیان کیا ہے۔ ان کی زبان و بیان سادہ اور رواں ہے۔

اس مقالے میں غلامی سے متعلق بہت سی مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے جو دلایل دیے ہیں وہ موثر اور وقیع ہیں اور قاری کے عقل و وجدان کو اپیل کرتے ہیں۔

"سرسید کی دینی برکتیں": مصنفہ عبدالحلیم شرر لکھنوی، بتیس صفحات پر مشتمل ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء میں مطبع کریمی، قمرالدین اینڈ سنز تاجران کتب لاہور سے شائع ہوا۔ مصنف نے یہ فاضلانہ لیکچر حیدر آباد دکن کے ایک عظیم الشان جلسہ میں دیا تھا۔ اس رسالہ کا مقدمہ میر ولایت حسین نے لکھا جس میں انھوں نے سید احمد خاں کی دینی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

عبدالحلیم شرر سید احمد خاں کی مذہبی اصلاحات کو دینی برکتوں کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابتداء میں انھوں نے یہ سوال اٹھایا کہ:

> "سید صاحب کے ظہور اور ان کی مجتہدانہ کوششوں سے مذہب پر کیا اثر پڑا؟ ان کی ذات سے مذہب کو بھی فایدہ پہنچا یا نہیں؟ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ان کی زندگی پر اس حیثیت سے بحث کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے سید صاحب اس بارے میں جو کچھ کر رہے تھے اس کا تعلق موجودہ دور مذاق، موجودہ تعلیم، موجودہ انقلابات اور موجودہ رفتار کے آخری نتایج سے تھا اور وہ نتایج گو ہر جگہ ظاہر ہونے لگے ہیں مگر ان

کا ابھی بہت کچھ اظہار باقی ہے۔"[1]

شرر بھی سید احمد خاں کی طرح اجتہاد کے قایل تھے اور عصری تقاضوں کے پیش نظر اُن کی مجتہدانہ کاوشوں کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ شرر اُن کے ہم خیال تھے کہ بہت سی غلط اور بے بنیاد باتیں رسم ورواج کی راہ سے یا مفسرین کی سہل انگاریوں سے اسلام میں در آئی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ انھیں شریعتِ اسلامی کے طور پر قبول کر لیا گیا۔

نظریات کی سطح پر سید احمد خاں کا جھکاؤ ان علمار کی طرف رہا جنھوں نے تقلید کو چھوڑ کر اجتہاد کا راستہ اختیار کیا چنانچہ ان کی شخصیت اور فکر پر علمائے قدیم میں امام غزالی، اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں وہ ولی اللہی تحریک سے سید احمد خاں کی وابستگی کا ذکر کرتے ہیں کہ :

"ابتدائی زمانہ میں وہ ایک پیرو حدیث مسلمان تھے اور اس مذہبی ریفارم سے متاثر تھے جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ سے شروع ہو کر شاہ اسماعیل کے زبردست ہاتھوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔"[2]

آیندہ سطور میں انھوں نے اعتراف کیا کہ سید احمد خاں نے ہم پر اجتہاد کا دروازہ کھولدیا اور ان کی تحریروں میں واضح طور پر اصول وروایت (قیاس اور عقل) سے کام لیا گیا ہے۔

"شاہ ولی اللہ اور امام غزالی کے خیالات سے بھی ہم اس جانب متوجہ ہوئے تھے۔ ابن خلدون نے بھی اپنے مقدمے میں اس اصول پر زور دیا تھا مگر سچ یہ ہے کہ اس اصول سے اگر کام لیا تو صرف سرسید نے۔"[3]

شرر نے انیسویں صدی کے تمدنی انقلابات کا عمرانیاتی جائزہ لینے کے بعد سید احمد خاں کو اس صدی کا سب سے بڑا "محافظ اسلام" قرار دیا ہے۔

"چند ہی روز میں فلسفہ وسائنس کی ترقی نے مذاہب کی دنیا میں ایک ایسی ہلچل

---

[1] عبدالحلیم شرر۔ سرسید کی دینی برکتیں۔ مطبع کریمی۔ لاہور ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء صفحہ
[2] ایضاً " " " " " صفحہ ۱۳
[3] ایضاً " " " " " ص ۲۹

ڈالی کہ تمام مذاہب میں یک گونہ فساد شروع ہوگیا.....اب عام طور پر معیار صداقت
یہ قرار پا گیا کہ جو مذہب حقایق موجودات اور اصولِ تمدن کے خلاف ہو وہ مذہب سچا
نہیں ہو سکتا دوسری طرف غور سے دیکھئے تو مذہب کی حالت یہ ہے کہ ابتدا تو نہایت
ہی مضبوط و موجہ اصول عقلی سے ہوا کرتی ہے مگر بعد والے خلاف فطرت واقعات کو
دلایل حقیقت قرار دے کر مذہب میں شامل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اخیر میں مذہب
صرف کرشمہ پرستی کا نام رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے مذاہب جنھوں نے قدامت کے رنگ
میں رنگ کر ایسی صورت اختیار کر لی ہو، زمانہ کا کیونکر مقابلہ کر سکتے تھے۔"[1]

اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ سید احمد خاں نے نا مساعد حالات میں اسلام کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ قرآن و حدیث کی جدید تفسیر سے مذہب اور سائنس کے مابین مطابقت کی راہیں ہموار کیں اور مسلمانوں کو عقلیت و تشکیک کے اس طوفان سے بچا لیا جس کی وجہ سے یورپ میں عیسائیت کو نا قابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

"میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و
حدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے
تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جاوے گا اسی خیر خواہی نے مجھ کو بر انگیختہ
کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں۔"[2]

ان کے پیش نظر اسلام کو جن دو بڑے خطرات کا سامنا تھا ان میں ایک تو وہ رسم و رواج تھے جنھوں نے مذہبی حیثیت اختیار کر لی تھی اور دوسرا خطرہ عیسائی مشنریوں اور مورخوں کی طرف سے تھا جن کا جواب دینے سے مسلمان اپنی لاعلمی کی وجہ سے قاصر تھے۔

سید احمد خاں کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے معترضین کے تسلی بخش جوابات دیے اور نوجوانوں میں خود اعتمادی پیدا کی نیز یہ کہ ان کو اپنے مذہب اور کلچر سے واقفیت کرائی اور ان کا احترام کرنا سکھایا:

"سید صاحب کے دل میں جم گئی تھی کہ زمانے کا ایسا رنگ ہے کہ اگر مذہبی اصلاح نہ کی گئی

---

[1] عبدالحلیم شرر۔ سرسید کی دینی برکتیں، مطبع کریمی لاہور ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء صفحہ ۱۲
[2] سرسید کے خطوط مرتبہ وحید الدین سلیم ایڈیٹر معارف، حالی پریس پانی پت ص ۴۴

تو انگریزی اسکول کے تعلیم پائے ہوئے بچے سب عیسائی یا لا مذہب اور ملحد ہو جائینگے اور یقیناً ہو جاتے کیونکہ سید صاحب کے پاس کچھ ایسے خطوط آئے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ نے ہماری رہبری نہ کی ہوتی تو ہم مذہب اسلام کے چھوڑنے کو تیار رہتے۔ یہ خطوط سید صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ ان کو احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔ وہ ان کو اپنی ہمدردی اسلام اور اپنی کوشش خیر کی سند اور انھیں کو اپنی نجات کا ذریعہ خیال کرتے تھے"۔[1]

موجودہ دور کے مستشرق ڈبلیو۔ سی اسمتھ کا خیال ہے کہ سید احمد خاں نے مذہب کے میدان میں عیسائیت اور اسلام کے مابین بنیادی اشتراک تلاش کیا اور ان کے پیرؤوں کو قریب لانے کی کوشش کی اور ان کے میل جول کو مذہبی نقطۂ نظر سے صحیح ثابت کیا۔[2]

بشیر احمد ڈار نے "سید احمد خاں کا مذہبی رجحان" (لاہور ۱۹۵۹ء) اور کرسچین ٹرال نے اپنے تحقیقی مقالے "سید احمد خاں اور اسلامیات کی تعبیر نو" (دہلی ۱۹۷۸ء) میں اعتراف کیا ہے کہ نئی نسل کی رہبری اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں ان کی تحریریں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

---

[1] عبدالحلیم شرر۔ سرسید کی دینی برکتیں۔ مطبع کریمی۔ لاہور ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء صفحہ ۱۸

[2] ڈبلیو سی اسمتھ۔ ہندوستان میں موڈرن اسلام۔ سیکنڈ ایڈیشن ۱۹۴۶ء ص ۱۰

باب دوم

تاریخ

- تاریخی نقطۂ نظر
- جامِ جم
- آثار الصنادید
- سلسلۃ الملوک
- تصحیح آئینِ اکبری
- تصحیح تاریخ فیروز شاہی
- تصحیح توزکِ جہانگیری

تاریخی نقطۂ نظر

سید احمد خاں نے اپنی علمی اور تصنیفی زندگی کا آغاز تاریخ نویسی سے کیا۔ ان کی تحریریں تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر تاریخی شعور کا پتہ دیتی ہیں ایک تقریر میں انھوں نے کہا۔

"کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔"[1]

وہ جب ۱۸۳۹ء میں دیوانی عدالت آگرہ میں منشی تھے تو بائیس سال کی عمر میں انھوں نے محنت سے عدالت دیوانی کے قوانین کا خلاصہ "انتخاب الاخوین" تیار کیا جس کو دیکھنے کے بعد خوش ہو کر آگرہ کے کمشنر رابرٹ ہملٹن نے سید احمد خاں کو منصف مقرر کئے جانے کی سفارش کی۔[2] انتخاب الاخوین (قوانین دیوانی) جو نایاب کتاب ہے۔ اس پر انھوں نے بحیثیت مرتب اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کا نام بھی شامل کیا۔ حالی نے اس کے متعلق لکھا کہ:

"یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لئے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبہ میں شایع ہوگیا۔ لوگوں کو اس سے بہت فایدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اسکی بدولت منصف ہوگئے"[3]

اس کے علاوہ انھوں نے ۱۸۱۶ء تا ۱۸۶۲ء کے تمام مقدمات کے فیصلے تین جلدوں میں شائع کئے اور اہم قوانین مثلاً دس، چودہ اور سولہ کے ترجمے بھی کئے۔

---

[1] سر سید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری مرتبہ منشی محمد سراج الدین، بازار کشمیری لاہور ۱۸۹۰ء صفحہ ۱۴۴

[2] اس سفارش کو حکومت نے منظور کر لیا تھا لیکن اسی دوران میں مقابلہ کے امتحان کا قانون پاس ہو گیا اور سید احمد خاں ۱۸۴۱ء میں منصفی کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور دسمبر ۱۸۴۱ء میں اس عہدے پر ان کا تقرر پہلی بار ضلع "مین پوری" میں ہوا۔

[3] الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۵

انھوں نے اسی سال ۲۵ رمئی کو رسالہ جامِ جم آگرہ میں ہی لکھا مگر اس کی طباعت میں سال بھر لگ گیا۔[۱] اس کے دیباچہ میں انھوں نے خاندان گورگانیہ اور دارالخلافہ دہلی کے بارے میں تمہیدی کلمات کے بعد اس کی افادیت پر روشنی ڈالی:

"سید احمد خاں و عام راز بانزا داست برایں معنی قرار یافت کہ مجملے از حال شاہانِ سلف و سلاطین خلف بطورِ جدولے در قیدِ نظم آرد کہ طالبانِ حال را استقبال از ورق گردانی مطولات تواریخ استراحت یابند و مقاصدِ ضروریہ را باآسانی دریابند"[۲]

(مطلب: سید احمد خاں نے شاہانِ سلف (قدیم) اور ان کی اولاد کے حالات بطور جدول لکھے ہیں تاکہ موجودہ اور آیندہ نسل اس کے مطالعہ کے بعد اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہو اور آسانی سے ضروری مقصد تک پہنچ سکے۔)

پھر اسی صفحہ پر آگے چل کر انھوں نے لکھا کہ ان مراتب کی تحقیق میں جس قدر جگر کاوی اور جانفشانی کی گئی ہے اس کو میرا دل ہی جانتا ہے "حال مولف ایں رسالہ" کے عنوان سے سید احمد خاں نے اپنے آباء و اجداد کا حال بھی لکھا ہے۔

جامِ جم

اس میں امیر تیمور بانیٔ خاندان سے لے کر آخری بادشاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تک تنیتالیس فرماں رواؤں کے حالات جدول کی شکل میں تاریخی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ درج کیے ہیں۔ یہ جدول سترہ خانوں میں مشتمل ہے[۳] اس کی ابتدا ۸۰۰ھ مطابق ۱۳۹۸ء

---

[۱] سید احمد خاں۔ جامِ جم چھاپہ سنگ لیتھو گرافک اکبرآباد، مئی ۱۸۴۰ء کل صفحات ۲۸

[۲] سید احمد خاں، جامِ جم چھاپہ سنگ لیتھو گرافک اکبرآباد مئی ۱۸۴۰ء صفحہ ۵

[۳] جدول کا نقشہ حسبِ ذیل ہے۔

نمبر ۱۔ نام فرماں روا ۲۔ نام پدر ۳۔ نام مادر ۴۔ قوم ۵۔ سالِ ولادت ۶۔ محلِ جلوس ۷۔ عمرِ جلوس ۸۔ سالِ جلوس ۹۔ تاریخِ جلوس ۱۰۔ مدتِ سلطنت ۱۱۔ سکّہ ۱۲۔ مدتِ عمر ۱۳۔ سالِ وفات ۱۴۔ تاریخِ وفات ۱۵۔ لقب بعدِ وفات ۱۶۔ مدفن ۱۷۔ کیفیت

سے ہوتی ہے جو دہلی میں تیمور کا سالِ جلوس تھا اور اختتام بہادر شاہ ظفر کے سالِ جلوس ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء پر ہے۔ کتاب کے خاتمے میں مصنف نے امید ظاہر کی ہے کہ تلاش و سعی کے بعد فراہم کردہ مواد سے لوگوں کو خاطر خواہ استفادہ ہوسکے گا۔ پھر حوالے کی کتابوں کے نام ہیں جن سے جامِ جم کی تیاری میں مدد لی گئی[1] اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ معتبر اشخاص سے معلومات حاصل کی گئیں تاکہ حالات مستند ہوں آخر میں مرزا حاتم علی مہر کا قطعہ ہے جس سے کتاب کے سنہ تصنیف ۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۵ھ کی توثیق ہو جاتی ہے۔

"ترتیب یافت ہر گہ ایں نسخہ جامِ جم نام + خامہ بعزم سالش بگرفت مہر مضطر
ہم مہر و ہم قلم را تاریخ دلکش آمد + آئینۂ سکندر جامِ جم است بنگر
۱۲۵۵ھ

جامِ جم پیش رو ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد اسی نہج پر بہت سی جدولیں تیار کی گئیں جیسے مرقعِ سلاطین (حصہ اول) آثار المتاخرین مرتبہ محمد عبد الغفور ۱۸۷۵ء وغیرہ۔

آثار الصنادید

سید احمد خاں نے مطالعہ آثار قدیمہ کے ذریعے سلطنتوں کے عروج و زوال کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ایسے رسائل لکھوائے اور خود بھی لکھے جن سے تاریخ کے مخفی پہلو منکشف ہوئے آگرہ اور دہلی کے کھنڈروں نے ان کے ذوقِ تاریخ کو نمایاں کیا جس کے متعلق مولانا شبلی نے لکھا کہ

"چوں کہ حقایق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا اس لئے دلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت اور کوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط

---

[1] سید احمد خاں جامِ جم چھاپہ سنگ لیتھوگرافک اکبر آبادمئی ۱۸۴۰ء صفحہ ۲۷-۲۷۶ تفصیلِ کتب:
تاریخ فرشتہ۔ تاریخ فیروز شاہی تصنیف مولانا عزیز الدین تاریخ آفاغنہ بر حال سلطان بہلول و شیر شاہ تصنیف حسین خاں افغان۔ تاریخ مظفری۔ تاریخ عالمگیری۔ تیمور نامہ۔ تاریخ باری اکبر نامہ۔ تاریخ اکبری طبقات اکبری تاریخ اکبر شاہی اقبال نامہ جہانگیری تاریخ محمد مہدی تصنیف شیخ عبدالحق محدث دہلوی، جنگ نامہ۔ تاریخ سکندری۔ خلاصۃ التواریخ۔ تاریخ علی محمد بدایونی مسودہ تاریخ بعض مصنفہ خلیل اللہ خاں اور شجرہ مولفہ عبید اللہ خاں۔

کتاب لکھی جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے"۔[1]

"آثار الصنادید[2] اردو میں باستان شناسی کی پہلی کتاب ہے جس میں اس دور کے مشہور مصوّروں کی بنائی ہوئی آثار قدیمہ کی ایک سو تیس رنگین تصاویر بھی شامل ہیں جن میں نوے نقشے فیض علی خاں کے تیار کردہ اور بقیہ چالیس مرزا شاہرخ بیگ کا عمل ہیں۔

سید احمد خاں نے ان دونوں کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کہ

"فیض علی خاں، مانی ان کا قلم بید وصدت دار اور بہزاد ان کی طرح کا چربہ نگار شمع ان کی تصویر کے بزم افروز اور آتش ان کے نقش کی عالم سوز از بسکہ مزاج صلاح و تقویٰ کی طرف بہت مائل ہے جاندار کی تصویر سے تائب ہو کر فقط نقشہ مکانات پر قناعت کی سبحان اللہ اس کام کو اس طرح سرانجام دیا اور اس امر کو ایسا بانصرام پہونچایا کہ بیان اوسکا احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مرزا شاہ رخ بیگ فن تصویر میں نہایت کامل اور اقران و امثال سے اس کام میں گوی سبقت لے گئے۔۔۔ کل نقشے اس کتاب کے فیض علی خاں موصوف اور ان کی استعانت سے مرتب ہوئے ہیں کام ان نقشوں کا نمونہ ان کی صنعت کا ہے"۔[3]

کتاب کے شروع میں نواب ضیاء الدین خاں لوہارو کی فارسی منظوم تقریظ ہے جس میں سید احمد خاں کے علمی تجسّس اور تحقیقی کاوش کا ذکر ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے سر ٹامس مٹکاف ریزیڈنٹ

---

[1] شبلی نعمانی۔ مقالات شبلی۔ مطبع معارف۔ اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء صفحہ ۵۸

[2] آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن مطبع سید الاخبار باہتمام عبدالغفور دہلی ۱۸۴۷ء کل چار سو صفحات۔

دوسرا اڈیشن مطبع سلطانی قلعہ معلی دہلی ۱۸۵۴ء

تیسرا " مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء

چوتھا اڈیشن مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۴ء

پانچواں " مرتبہ خالد نصیر ہاشمی سنٹرل بک ڈپو اردو بازار دہلی ۱۹۶۵ء

ایک اور اڈیشن مرتبہ موتی کریمی یونیورسل پبلشرز علی گڑھ ۱۹۵۹ء

ان کے علاوہ اور بھی اڈیشن چھپے ہیں مگر طوالت کی وجہ سے یہاں صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے۔

[3] سید احمد خاں، آثار الصنادید مطبع سید الاخبار باہتمام سید عبدالغفور دہلی ۱۸۴۷ء ص ۲۵

دہلی کے نام اٹھتّر اشعار کی مثنوی میں ان کی علم پروری اور قدر دانی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ تقریظ اور دیباچہ دونوں مطلّی ہیں یہ تصنیف چار ابواب اور ۵۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں ۔ ۲۳۸ صفحات

قلعہ معلیٰ کی عمارت کے حال میں ۔ ۴۴ صفحات

خاص شہر شاہجہاں آباد کی عمارتوں کے حال میں۔ ۷۱ صفحات

دلی اور دلّی کے لوگوں کے بیان میں ۔ ۲۳۰ صفحات

ابتدائی تین ابواب میں دہلی اور نواحِ دہلی کی مختلف عمارتوں کی تفصیل ہے چوتھے باب میں پہلے تو دلّی کے متفرق ناموں، اس کی آب و ہوا اور یہاں کی زبانِ اردو کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ پھر یہاں کے باشندوں کی بابت لکھا:

"اگرچہ لوگ یہ خیال ظاہر کریں گے کہ میں نے جو اس شہر کے لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطن ہوگا لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط اور تفریط سے خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید اور کسی اقلیم کے نہ ہوں گے۔ ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن رات لکھنے پڑھنے ہی سے ذوق ہے"۔[1]

اس کے بعد ایک سو سترہ معاصر مشاہیر کا بیان ہے جن کے متعلق مصنف نے اعتراف کیا کہ:

"اب میں تھوڑا سا بزرگاں معاصرین علیہ الرحمہ کا جن کی فیضِ خدمت میں مشرف ہوا ہوں یا اس زمانے میں اُن کے وجود با جود سے عالم کو رونق تھی حال لکھتا ہوں"۔[2]

---

[1] سید احمد خاں۔ آثار الصنادید مطبع سید الاخبار با اہتمام سید عبدالغفور دہلی ۱۸۴۷ء صفحہ ۴۱۔

[2] ایضاً صفحہ ۱۵

اس باب میں پیرانِ طریقت، مدبرانِ وقت اور حکمار کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں میں بالخصوص ذوق، غالب، مومن، شیفتہ اور شاہ نصیر کی شخصیت اور فنِ شعر سے تفصیلی بحث کی ہے جس سے اردو میں جدید تنقید نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔

مثلاً وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"مرزا اسداللہ غالب ــــ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں۔۔۔۔ آپ کا جواہر خانہ نفایس سخن حدِ شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے بیروں ہے ایک دیوان قصاید و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فواید جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائج فکر پہ مبنی ہے۔"
ص ۱۳۸-۱۳۹

"مومن خاں مومن ـ معنیِ تازہ سے قالب الفاظ میں جان ڈالتے اور انفاس عیسوی سے شعر مردہ کو تازہ تر از گل اور سیراب تر از مل کرنا ایک شیوہ ہے۔ دیوان ریختہ کا مشتمل ہے۔ اصنافِ سخن اور شعبہ فن پر غزلیات سے لے کر تا مخمسات و مسدسات اور فرد سے لے کر تا رباعیات و قطعات ہیں۔۔۔۔ چھ مثنوی اور قصائد متعدد اور انشائے نثر باعبارات متین و مضامین رنگین ہے۔" ص ۱۹۱ - ۱۹۲

"شیخ ابراہیم ذوق کے یہاں اس قدر جامعیت کہ فصاحت عبارت اور متانت تراکیب اور وحدت معنی اور غرابت تشبیہ اور حسنِ استعارہ اور خوش اسلوبی کنایہ اور لطفِ تلمیح اور پاکی الفاظ اور بست قافیہ اور نشستِ ردیف، نظم و نسق کلام اور حسن آغاز و انجام ایک جا (ے) یں جمع ہے۔ اگرچہ اصناف سخن خصوصاً غزلیات اور قصائد سے دفتر د فتر ہے، ص ۲۱۵

سید احمد خاں کو تاریخ اور ثقافت سے ایسا لگاؤ تھا کہ خطرات مول لے کر خود اونچی اونچی عمارات پر لکھے ہوئے دیوناگری اور قدیم رسم الخط کے کتبے پڑھے اور بڑی مشکل سے ان کے چربے آتارے

پھر یہ تحقیق بھی کی کہ کونسی عمارت کس بادشاہ نے کب بنوائی تھی ؟ چنانچہ ساتھ ساتھ تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے جاتے اور معتبر اشخاص سے مدد بھی لیتے تھے ۔ اس انہماک کی روداد "حیاتِ جاوید" میں ملتی ہے :

"قطب صاحب کی لاٹ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر چھینکے میں بیٹھ کر ہر ایک کتبہ کا چربہ اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"[1]

جب "آثار الصنادید" چھپ کر آئی تو اسی سال ۱۸۴۷ء میں دلی کے کلکٹر آرتھر آسٹین رابرٹس انگلستان جا رہے تھے اس کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لے گئے اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں پیش کیا اس کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کی فرمائش پر انھوں نے اس کا انگریزی ترجمہ شروع کیا مگر انتظامی مصروفیات کی بناء پر پورا نہ کر سکے ۔

سید احمد خاں کی طبیعت میں خوب سے خوب تر کی خواہش رہی اتنی محنت کے باوجود انھیں احساس ہوا کہ کتاب میں مزید اضافوں کی گنجائش ہے اور اس کی زبان بھی دقیق و مرصع ہے ۔ دہلی کے سیشن جج ایڈورڈ طامس جو آثارِ قدیمہ کی تحقیق میں دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے بھی اس طرف توجہ دلائی اور دوسرا ایڈیشن نکالنے پر آمادہ کیا چنانچہ چھ برس کی چھان بین کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں سلیس اور رواں زبان میں نکلا جس میں عمارتوں کے کتبے بجنسہٖ نقل ہیں :

ان کے تقابلی مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

دوسرے ایڈیشن کے اول باب میں ہندوستان کی آبادی اور پرانی عملداریوں

---

[1] الطاف حسین حالی " حیاتِ جاوید" ناشر محمد رحمت اللہ رعد ۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء صفحہ ۵۵

کا ذکر ہے جو پہلے اڈیشن میں نہیں۔

- دوسرے اڈیشن کے بابِ دوم میں دہلی کے تمام قلعوں کا مکمل بیان ابتدا سے آخر تک دیا ہے۔ پہلے میں صرف شاہجہاں آباد کے قلعہ کا حال ہے۔
- دوسرے اڈیشن میں ان پرانے مکانات کی تفصیلات ملتی ہیں جن کی بابت پہلے معلومات نہ ہو سکی تھیں اور اگر بیان میں کوئی غلطی رہ گئی تھی تو اس کی بھی تصحیح کر دی گئی۔
- دوسرے میں عمارات کا حال زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے جب کہ پہلے میں غیر منظم اور متفرق انداز میں ہے۔
- دوسرے اڈیشن میں تاریخی شواہد اور اسناد کے ساتھ ساتھ حواشی اور حوالوں کی کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔
- سید احمد خاں نے اگرچہ تاریخی عمارتوں کے کتبے پڑھنے کے بعد ان کے چربے اتارے تھے لیکن شاید پورے طور پر تیار نہ ہو سکنے کی وجہ سے پہلے اڈیشن میں نہ چھپ سکے۔ دوسری اشاعت میں سب شامل کر دیے گئے ہیں۔
- دوسرے اڈیشن کا اختتامیہ "اردو زبان کے بیان میں" ہے جب کہ پہلے اڈیشن کے چوتھے باب میں اہل دلّی کا مفصل حال درج تھا۔ اس زمانے میں وہابی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور وہابیوں پر سیاسی الزامات عاید تھے اور وہ مورد عتاب تھے چنانچہ اس کی زد میں دلّی کے بہت سے علماء اور مشاہیر آ گئے تھے اس لئے سید احمد خاں نے مصلحتاً ۱۸۵۴ء کے دوسرے اڈیشن میں اس باب کو نکال دیا اور اختتام اردو زبان کی ابتداء اور اس کی بتدریج ترقی پر کیا۔ چنانچہ یہ حصہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر غور و فکر کا رجحان اس کی اشاعت کے بعد ہی پیدا ہوا۔

سید احمد خاں کے انتقال کے بعد "آثار الصنادید" مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد (۱۹۰۴ء) شائع ہوئی۔ اس میں مرتب نے طبع اول (۱۸۴۷ء) سے ایک سو تیس عمارتوں کے نقشے بنوائے اور دوسری طباعت سے کتبوں کے چربے اور صحیح حالات تاریخی حوالوں کے ساتھ نقل کروا کے یکجا کر دیے ہیں۔

لیکن "اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ پہلی اشاعت کا چوتھا باب متعلقہ "دلّی اور دلّی کے لوگوں کے بیان میں"، شامل نہیں کیا گیا۔ جگہ جگہ صفحات خالی چھوڑ دیے ہیں جس کی وجہ سے تسلسل برقرار نہیں رہا اور ترتیب میں بھی ہم آہنگی نہیں اس کے علاوہ فہرست مضامین بھی درج نہیں۔

"آثار الصنادید" کے آخر میں تین تقاریظ اسداللہ خاں غالب، امام بخش صہبائی اور مولانا صدرالدین آزردہ کی شامل ہیں غالب نے اپنی تقریظ میں سید احمد خاں کی ذہانت، محنت اور علمی ذوق کی تعریف کی ہے مگر اس پر حیرت ظاہر کی کہ وہ نئے زمانے کے بجائے پرانے وقتوں کے حالات و واقعات کی چھان بین پر کیوں اپنا وقت ضایع کر رہے ہیں؟ اور وہ عصر جدید کی ترقی و ایجادات سے بے خبر اور ماضی پرست ہیں۔

امام بخش صہبائی نے ان کی علمی لگن اور دقتِ نظر کی تعریف کی اور اپنی تقریظ میں آزردہ نے "آثار الصنادید" جیسی تاریخی تحقیق کی معنویت پر زور دیا اور سید احمد خاں کو قبولِ عام سے سرفراز ہونے کی دعا دی:

دمیدہ بہ نقشِ عمارات جاں ز اعجاز او شہر دہلی رواں
خدایا تو ایں شمع پایندہ دار جہاں را چو پروانہ گرویدہ دار

فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی نے اس کا فرانسیسی ترجمہ ایک سو چورانوے بڑے صفحات میں لیتھو شاہی پریس پیرس سے ۱۸۶۰ء میں شایع کیا۔ اس نے قارئین کی دلچسپی کے مدِ نظر صرف وہی حصے ترجمہ کیے جو آثار قدیمہ سے متعلق تھے۔ اپنے سالانہ خطبہ میں اس نے کہا کہ:

"ہمارے پیش نظر وہ نسخہ ہے جو کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے اس میں سابقہ ایڈیشن کی مکمل نظر ثانی کی گئی ہے۔"[1]

پھر اس نے یہ بھی ذکر کیا کہ ترجمہ کا ایک نسخہ ہندوستان کو روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس فرانسیسی ترجمہ کو پڑھنے کے بعد سید احمد خاں کی علمی خدمت کے اعتراف پر انھیں رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، کا اعزازی رکن مقرر کیا گیا۔ "آثار الصنادید"، کا انگریزی ترجمہ ۱۹۷۹ء میں آرنا تھ نے کیا[2]

---

[1] ثریا حسین۔ گارسیں دتاسی، اردو خدمات علمی کارنامے، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۵۷

[2] آرنا تھ دہلی کے آثار قدیمہ (مونیومینٹس آف دہلی)، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی ۱۹۷۹ء

سیداحمد خاں کے نظریۂ تاریخ پر "آثار الصنادید" سے پوری روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے مشاہیر علماء و صوفیا کے ساتھ ساتھ کاریگروں اور مخصوص پیشہ وروں کا بھی حال لکھا یعنی وہ تاریخ کو صرف بادشاہوں کے حال تک محدود کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہر طبقہ کی نمائندگی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے اس وسیع تصور میں عوام و خواص دونوں شامل تھے۔

سلسلۃ الملوک:

حوالوں کے لئے مصنف کو بار بار تاریخی کتابوں سے رجوع کرنا پڑتا تھا اس لئے سیداحمد خاں نے شاہانِ سلف کے حالات کی ایک تاریخ وار فہرست "سلسلۃ الملوک" کے نام سے ۹۵ صفحوں میں مرتب کی اور اس میں "جامِ جم" کا مواد بھی شامل کر لیا اس کا سبب تالیف انھوں نے یوں بیان کیا:

"مسٹر آرتھر آسٹین رابرٹس صاحب بہادر نے کتاب آثار الصنادید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا اور اس کی نہایت صحت کی تاکید فرمائی تو بہ سبب اختلاف کتب تواریخ اور غلطی کاتبوں کے ہر امر کی صحت میں کمال دقت اور نہایت کلفت ہوئی تھی اور بہ سبب نہ مرتب ہونے سلسلۂ حکومت بادشاہوں اور راجوں کے اوس کتاب کی صحت نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اوس کتاب میں اگلے بادشاہوں، راجاؤں اور امیروں کی بنائی عمارتوں کا حال ہے اور پھر جب تک اون کا حال بصحت معلوم نہ ہو اس وقت تک اوس کتاب کی صحت کیوں کر ہو، اس واسطے میں نے دہلی کے راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست بنائی جس میں پانچ ہزار برس کے راجاؤں اور بادشاہوں کا حال تھا۔ اتفاق سے وہ فہرست صاحب ممدوح کے ملاحظہ سے گذری اور پسند طبع عالی ہوئی اس سبب سے میں نے خیال کیا کہ وہ فہرست بطریقِ اسلوب مرتب ہو جاوے اور ایک کتاب بن جاوے تو نہایت مفید ہو گی۔"[1]

---

[1] سیداحمد خاں سلسلۃ الملوک، اشرف المطابع دہلی ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء صفحہ ۲-۳

اس کتاب میں چودہ خانوں[1] میں دلّی کے دو سو بادشاہوں کا سلسلہ راجہ یدہشٹر سے شروع ہو کر ۱۸۵۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ۱۸۰۳ء سے مغلوں کا حال ضمنی طور پر بیان ہوا ہے اصل حکمراں شاہ برطانیہ جارج سوم اور ان کے جانشینوں کو قرار دیا ہے اور ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی جگہ ملکۂ وکٹوریہ کا نام درج کر کے انھوں نے " خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔

تصحیحِ آئینِ اکبری:

سید احمد خاں کو چونکہ تاریخ کی تحقیق کے ساتھ مہم جوئی کا بھی شوق تھا اس لئے دہلی کے دورانِ قیام جب وہاں کے تاجران حاجی قطب الدین اور محمد اسمٰعیل نے "آئینِ اکبری" کی تصحیح کی فرمائش کی تو انھوں نے اس پیش کش کو قبول کرلیا مگر اس کام میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا۔ اول تو نسخوں کی فراہمی دوسرے ابو الفضل کی مشکل استعارات سے بوجھل عبارت علاوہ ازیں اس کا انداز گو مگو۔ سید احمد خاں کے لئے بہت صبر آزما تھا لیکن انھوں نے اپنی تلاش، محنت اور تجسس علمی سے ان سب مشکلات پر قابو پالیا اور بڑی جستجو کے بعد جو نسخے "آئینِ اکبری" کے مل سکے وہ زیادہ تر کاتبوں کی لاپرواہی کی وجہ سے غیر معتبر اور ناقص تھے۔ بہرحال دستیاب شدہ کتابوں کے تقابل سے انھوں نے ایک صحیح تر نسخہ تیار کیا[2] جس کے بارے میں حالی نے لکھا:

> "انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی جو اصطلاحیں اکبر کے زمانہ میں مشہور تھیں ان کی جابجا تشریح کی اُس زمانے کے اوزان و نقود کی اِس زمانے کے اوزان و نقود سے مطابقت کی۔ جن

---

[1] سلسلۃ الملوک میں فہرست چودہ خانوں میں ہے۔

۱۔ نمبر ۲۔ نام فرمانروا ۳۔ نام پدر ۴۔ قوم ۵۔ سالِ ولادت ۶۔ سالِ جلوس ۷۔ محلِ جلوس ۸۔ دار السلطنت ۹۔ امتدادِ زمانہ ۱۰۔ مدت سلطنت ۱۱۔ سالِ وفات ۱۲۔ مدت عمر ۱۳۔ مدفن ۱۴۔ حالات

[2] سید احمد خاں۔ آئینِ اکبری۔ پہلی جلد بہ اہتمام احمد الحق۔ مطبع اسماعیلی دہلی ۱۸۵۵ء دوسری جلد کی تصحیح سید احمد خاں نے بعد میں کی جس کا قلمی نسخہ دورانِ غدر تلف ہو گیا اور طبع نہ ہو سکا۔

جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیئے ہیں اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ ۔ ۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے اس لئے اضافہ کیا کہ اس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص بہ آسانی سمجھ پائے۔ جہاں آئین میں سکوں کا بیان ہے وہاں چند اوراق اپنی طرف سے بڑھائے اور اکبر کے جس قدر سکے ابوالفضل نے بیان کئے تھے ان میں سے ہر ایک سکہ کی دو۲ تصویریں دے کر دونوں طرف جو عبارت یا الفاظ کندہ تھے اُن کو دکھایا اور اکبر ہی کے زمانے کے آٹھ سکے سونے اور چاندی کے، اس کے علاوہ اور نشان دیے اور اس کے سوا بہت سی مفید باتیں اضافہ کیں"۔[1]

پھر ان اضافوں کی صراحت کی کہ:

"اصل آئینِ اکبری" میں تصویریں خال خال تھیں سید احمد خاں نے بہت سی تصویریں کھنچوا کر کتاب میں شامل کیں۔ مثال کے طور پر ٹکسال کے متعلق پچاس پچپن بڑے بڑے مرقعے ہیں جن میں مختلف کاریگر اپنے اپنے آلات ظروف اور اوزار لئے جدا جدا کام کر رہے ہیں[2]

اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سید احمد خاں دربار مغلیہ سے قریب ہونے کے باعث مغل تہذیب اور تمدن سے گہری آگاہی رکھتے تھے وہاں کی رسوم، آداب اور زبان ہر چیز سے واقف تھے۔ وہ اپنی معلومات کی بنیاد پر کتاب کو باتصویر بنا سکتے تھے۔ چنانچہ آئینِ اکبری میں زیورات، ظروف، آلات اور خیموں کی دی ہوئی نضاویر حقیقت پر مبنی اور مغلیہ کلچرل زندگی کی عکاس ہیں۔

پرنسپل کلکتہ کا لج ایچ بلاک نے جب ۱۸۷۳ء میں سرسید کی تصحیح شدہ کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا تو "آئینِ اکبری میں ان کی بنوائی ہوئی تصویروں کو بھی شامل کر لیا۔

---

[1] الطاف حسین حالی۔ حیاتِ جاوید مرتبہ مولوی رحمت اللہ رعد۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء ص ص ۶۳ - ۶۴

[2] الطاف حسین حالی۔ حیاتِ جاوید، مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء ص ۶۴

"آئینِ اکبری" پر کئی اہلِ قلم نے تقاریظ لکھیں۔ مگر انھوں نے صرف امام بخش صہبائی کی تقریظ ہی اس کتاب میں شامل کی۔ غالب کی فارسی مثنوی بعنوان "تقریظ آئینِ اکبری مصححہ سید احمد خاں صدر الصدور مراد آباد" میں ان کی بالغ نظری اور تن دہی کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب ۔۔۔ یافت از اقبالِ سید فتح یاب

دیدہ بینا آمد و بازو قوی ۔۔۔ کہنگی پوشید تشریف نوی

مگر پھر اسی میں آگے چل کر اس کتاب کو غالب نے "تقویم پارینہ" اور "مردہ پروری" سے تعبیر کیا اور سید احمد خاں کو ماضی کے طلسم سے آزاد ہو کر حال کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان پر نظر رکھنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہ برطانوی آئین اور طریق چونکہ عقل و انصاف پر مبنی ہیں اس لئے جدید ملکی قوانین اور تجارت کے مقابلے میں آئینِ اکبری کی تصحیح کا کام محض تضیعِ اوقات ہے۔ بھلا کون اس کا خریدار ہوگا؟ اور اس سے مصحح کو کیا حاصل ہوگا؟ اسے سید احمد خاں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں؛ اس فقرے سے کچھ معترضین نے یہ مطلب نکالا کہ وہ رجعت پسندی میں گرفتار تھے اور بدلے ہوئے نظام کا ادراک انھیں بعد میں ہوا لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ انگریزی تمدن سے متاثر ہونے کے باوجود ہندوستان کے تہذیبی سرمایہ کے قدر شناس تھے اور مغلیہ دور کے تہذیبی اداروں کی مذمت پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ انھوں نے فارسی ماخذ تاریخ کو ایڈٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی فرمائش بنگال رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری نے ۱۸۶۱ء میں سید احمد خاں سے کی انھوں نے اس کتاب کی فراہمی میں بڑی جد و جہد کی[1] اور مختلف نسخوں

---

[1] سید احمد خاں نے چار نسخے مختلف مقامات سے حاصل کیے۔

ایک نسخہ تاریخ فیروز شاہی کا ان کو شاہ دہلی کے کتب خانے سے ملا جو ناقص تھا۔

دوسرا نسخہ ایلیٹ سے فراہم ہوا جس کو ہسٹری آف انڈیا لکھتے وقت حاصل کیا گیا تھا۔

تیسرا نسخہ ایڈورڈ ٹامس سے بہم پہنچا۔ چوتھا نسخہ کتب خانہ بنارس سے دستیاب ہوا۔

سے مقابلہ کرنے کے بعد ایک مستند نسخہ بڑے سائز کے باسٹھ صفحوں میں شائع کیا[1]
سید احمد خاں نے اس کا مفصل دیباچہ بھی لکھا جو کتاب میں شامل نہیں کیا گیا البتہ
آخر میں بزبانِ انگریزی اس کے علیحدہ سے طبع کیے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ پھر اردو انگریزی
دونوں زبانوں میں یہ دیباچہ اخبار سائن ٹیفک سوسائٹی کے شمارہ اگست ۱۸۶۶ء میں شائع
ہوا جس میں سید احمد خاں نے ہندوستان کے فاتحین کی تاریخ نویسی کی روایت اور مسلمان
مورخین کی خدمات کا عمومی اور تنقیدی جائزہ لیا اس کے بعد انھوں نے ضیاء الدین برنی (۱۲۸۴ء-۱۳۵۷ء)
کی "تاریخ فیروز شاہی" کا دوسری تواریخ سے موازنہ کیا۔

"جو کتب تاریخ کی سیر کرتے ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ ممالک ایشیا کی تواریخ میں بڑا عیب
یہ ہے کہ بادشاہوں کی بے جا تعریف اور خوشامد سے پُر ہیں مگر اس تاریخ کی بڑی عمدگی یہ
ہے کہ اس کے مصنف نے جس بادشاہ کا حال لکھا اور جہاں اس کی خوبیاں اور
بھلائیاں مذکور کی ہیں وہیں خامیاں بھی بیان کی ہیں۔ اکثر جگہ تدبیر ملک داری
جو ان بادشاہوں کے مدنظر تھیں وہ بھی مذکور ہیں اور اس باب میں کوئی تاریخ
ان ملکوں کی ہمسری نہیں کرسکتی۔"[2]

"دورِ سلطنت" کی تاریخ کے لئے ضیاء الدین برنی سب سے مستند اور معتبر ذریعہ معلومات
ہے وہ سترہ (۱۷) سال تک محمد بن تغلق کا ندیم رہا تھا اور ایک ایسے خاندان سے متعلق تھا جس
نے علاء الدین خلجی کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاسی زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ فیروز شاہ
کے زمانے میں وہ مخالف امراء کی سازش کا نشانہ بنا اور اپنی زندگی کے آخری سال اس نے انتہائی نکبت
و افلاس میں بسر کیے فیروز شاہ کو خوش کرنے کے لئے برنی نے اپنی تاریخ کو اسی سلطان سے منسوب کیا۔

---

[1] سید احمد خاں۔ تصحیح تاریخ فیروز شاہی زیر اہتمام کیپٹن ڈبلیو ناسیو لینز اور مولوی کبیر الدین
رائل ایشیاٹک سوسائٹی پریس کلکتہ۔ ۱۸۶۲ء

[2] سید احمد خاں۔ تصحیح تاریخ فیروز شاہی ۔۔ دیباچہ۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ا شمارہ ۱۲، ۲۴ راگست ۱۸۶۶ء ص ۲۴۵

سلطنت کی تواریخ میں برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سید احمد خاں نے اس کی ترتیب و تدوین میں نہایت محنت کی اور ایک ایسا اڈیشن مہیا کر دیا جو سو سو سال سے زیادہ ہو گئے مگر آج تک مستند مانا جاتا ہے۔

تصحیح توزک جہانگیری

توزک جہانگیری مصحح سید احمد خاں کی پہلی اشاعت غازی پور سے وقوع پذیر ہوئی[1]۔ جہانگیر نے کتاب کا آغاز اپنی تخت نشینی سے کیا اور اول سال جلوس سے سترھویں سال کے وسط تک کے احوال خود تحریر کئے بعد کو اس میں اضافے بھی کئے گئے۔ سید احمد خاں کو اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ انھوں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کے بعد تصحیح کی اور مرزا ہادی کا دس صفحوں کا دیباچہ بھی شامل کیا[2]۔

سید احمد خاں کی ان کتابوں کے اڈیشن سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ماخذات کو وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی ترتیب و تہذیب میں انھوں نے شدید شغف اور دلچسپی سے کام لیا چنانچہ جب خواجہ حسن نظامی نے "غدر کا روزنامچہ" کے عنوان سے اخباروں کے تراشے جمع کئے تو اس میں "احسن الاخبار" کے ذیل میں درج ہے کہ بہادر شاہ نے سید احمد خاں کو قلعہ کے نقشے بنانے کا کام سپرد کیا ہے کہ وہ ماہر علم ہیں۔

سید احمد خاں کے تاریخ سے ذوق و شوق کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ گبن کی مشہور کتاب کا ترجمہ آٹھ سو روپے معاوضہ خود اپنے پاس سے دے کر کروایا۔ ان کے زیر اثر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سید احمد حسین بلگرامی کی "تاریخ تمدن اسلام" تھی اور بلگرامی

---

[1] سید احمد خاں۔ تصحیح توزک جہانگیری، پرائیوٹ پریس غازیپور ۱۸۶۳ء دوسری اشاعت پرائیوٹ پریس علی گڑھ ۱۸۶۴ء

[2] مرزا ہادی عہد جہانگیر کے علم تھے ان کا مبسوط دیباچہ توزک کو بڑی حد تک پورا کر دیتا ہے کیونکہ اس میں بادشاہ کے آبا و اجداد کا حال، اکبر کی لاولدی، سلیم چشتی کے مزار پر حاضری، پیدائش شاہ، جنگوں کا حال، درباریوں کی سازشیں، نور جہاں سے شادی، اس کے نام پر سکہ جاری ہونا، اور لا دمتو سلین دربار کے افکار و احوال اور تخت نشینی سے پہلے کے واقعات بیان کئے ہیں۔

نے ہی تاریخ اسپین کا ترجمہ بھی اردو میں کروایا تھا۔ جی ایس مینوئیل نے اپنی کتاب "رہنمائے دہلی"[1] میں دھلی کی مختصر تاریخ ۱۸۷۴ء تک لکھنے کے بعد اس کی قدیم اور جدید عمارتوں، بازاروں اور اس کے باشندوں کا ذکر کیا ہے اور ایک باب میں علمداریوں اور قدیم کتبوں کی فہرست بھی دی ہے۔ یہ پوری کتاب "آثار الصنادید" کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سید محمد خاں کے افکار اور صحبت کے زیرِ اثر ذکاء اللہ اور مولانا شبلی کے دل میں تاریخ نگاری کا ذوق بیدار ہوا۔ ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان" کی پہلی جلد ۱۸۷۳ء میں شایع ہوئی اور نظرِ ثانی کے بعد مختلف ادوار پر دس جلدیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ انھوں نے دیباچہ میں لکھا:

"تالیفِ اول کے وقت میں میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں پروفیسر ورنی کیولر سائنس اینڈ لٹریچر تھا۔ دو کام مجھے کرنے پڑتے تھے ایک تعلیم کا دوسرا تالیف و تصنیف کا اس لئے دوسرے کام کے لئے فرصت ایسی نصیب نہ تھی جیسی کہ اب ہے کہ پنشن خوار ہوں ..... اور سفید کاغذ کے روسیاہ کرنے کی فکر میں رہتا ہوں جس کی وجہ سے یہ تاریخ طول طویل معرضِ تحریر میں آئی کہ وہ معتمد و مستند تواریخ سلاطینِ ہند کے مضامینِ تاریخی پر حاوی ہے۔"[2]

پھر اسی سلسلے میں انھوں نے مورخ کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا:

"اول: مورخ کو سالم العقیدہ اور پاک مذہب ہونا چاہیے۔

دوم: مورخ صاف گو اور وسیع النظر ہو۔ جو واقعہ بیان کرے حقیقت پر مبنی ہو۔ فضول باتوں میں وقت ضایع نہ کرے۔

سوم: خوشامدی نہ ہو۔ مورخ جتنی سچائی سے کام لے گا اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

چہارم: اس کی تحریریں تکلفات سے پُر نہ ہوں تاکہ ہر کس و ناکس لطف اندوز ہو سکے۔

---

[1] جی۔ ایس مینوئیل۔ رہنمائے دہلی مطبع نیکس۔ کشمیری گیٹ دہلی ۱۸۷۴ء
[2] ذکاء اللہ۔ تاریخ ہندوستان حصہ دوم۔ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۱۵ء صفحہ ۲

پنجم: دیانت دار اور صدق گفتار ہو جس سے اُس پر اعتماد کیا جا سکے۔ اُس کی بات حرف آخر بن جائے"۔[1]

"تاریخ ہندوستان" میں ایلیٹ کی تاریخ ہند، تاریخ فرشتہ و سیر المتاخرین، تاریخ خافی خان" اور "تاریخ فیروز شاہی" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

سید احمد خاں نے "تاریخ ہند" کی تیاری میں بسلسلۂ فراہمیٔ مواد ایلیٹ کی مدد کی تھی اور انھوں نے ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان" کو مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شایع کیا۔

"حیات شبلی" میں سید سلیمان ندوی نے واضح کیا ہے کہ شبلی کو تاریخ کا شوق سرسید کی وجہ سے ہوا۔ جب وہ مدرس ہو کر علی گڑھ آئے تو گھنٹوں سرسید کے کتب خانے میں کھڑے رہتے تھے اور محو مطالعہ ہوتے تھے اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد شبلی کی ساری ذہنی تربیت سرسید کے زیر اثر ہوئی۔ انھوں نے پیغمبر اسلام پر شبلی سے ایک رسالہ عربی میں لکھوایا جو طبع نہ ہو سکا۔ مگر آخر کو "سیرۃ النبی" کا محرک بنا۔

سید احمد خاں نے المامون کے دیباچہ میں لکھا:

"وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے ان کاموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلا دے یا ان سے بے خبر رہے ہماری تاریخیں اس زمانے کی لکھی ہوئی ہیں جب تاریخ نویسی کے فن کو پوری طرح ترقی نہیں ملی تھی اس لیے ہمارے بزرگوں کے کاموں کے گوہر آبدار کہیں بکھرے پڑے ہوئے ہیں اور کہیں کوڑے کرکٹ میں رلے ملے ہیں۔۔۔۔

ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست اور مدرستہ العلوم کے پروفیسر مولانا شبلی نعمانی کی کتاب المامون میں مامون الرشید بن ہارون الرشید کے تمام کارنامے

---

[1] ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان حصہ دوم مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۸۷۵ء صفحہ ۲

اچھے یا بُرے نہایت خوبی اور بے انتہا خوش اسلوبی سے لکھے ہیں انھوں نے دلچسپ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ مامون کی پرائیویٹ زندگی اور معاشرت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ انھوں نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر ماخذ سے نہ دیا ہو۔۔۔۔۔

اس کتاب کا حقِ تصنیف مصنف نے اپنی فیاضی اور قومی ہمدردی سے مدرستہ العلوم علی گڑھ کو عطا کیا ہے۔"[1]

سید احمد خاں تاریخ کے تہذیبی تسلسل کے قایل تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے قدیم ہندوستان اور قرونِ وسطیٰ کے تہذیبی اور آثاری سرمائے میں یکساں طور پر دلچسپی لی اور بالخصوص دہلی کے آثار کے تحفظ کی عملی کوششیں کیں۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو متاثر کیا اور اب بھی تحقیق کرنے والوں کے لیے ان کی کاوشیں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں انھوں نے اردو میں سنجیدہ علمی تحریر لکھنے کا ڈول ڈالا اور بعد کی نسلوں کے لئے دانش وری کا نمونہ مہیا کر دیا۔

---

[1] شبلی نعمانی۔ "المامون" دیباچہ از سر سید احمد خاں سکریٹری کمیٹی مدرستہ العلوم علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۲ر اکتوبر ۱۸۸۹ء صفحہ ۴

نیا ایڈیشن مکتبہ جدید ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور ۱۹۶۰ء دیباچہ صفحہ ۸ - ۱۱

باب سوم

زبان و ادب

- اُردو صحافت
- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ
- تہذیب الاخلاق
- اُردو کی مقبولیت،
- خطوط
- تقاریر
- سفرنامے، سفرنامہ مسافرانِ لندن، سفرنامۂ پنجاب
- اُردو نثر کا ارتقا اور علی گڑھ تحریک

اردو صحافت

اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" زیر ادارت منشی سدا سکھ مرزا پوری، ولیم ہوپ کنس پیرز کے مشن پریس کلکتہ سے بہ اہتمام ہری دت ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو جاری ہوا۔ اس وقت نہ تو ہندوستانی صحافیوں کا ملی شعور بیدار تھا اور نہ ہی ان کی نظر رفتار زمانہ پہ تھی اور دنیا کی خبروں کا علم غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اخبار کو خرید کر پڑھنا تضیع اوقات تھا۔ ایسی صورت میں پریس کا عوام سے رابطہ پیدا کرنا مشکل ہو گیا تھا اور کسی اخبار کا حکومت کی مدد کے بغیر شایع ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس صورتِ حال کا جائزہ انڈو ایرانیکا میں لیا گیا۔

> "یہ اخبار چند انگریزوں کی سرپرستی کی وجہ سے چل رہا تھا اور پبلک نے اس کو چندہ دینا بند کر دیا تھا وہ اخبارات پر خرچ کرنے کو فضول خرچی سمجھتے تھے جس کی وجہ سے جام جہاں نما کی کوئی مانگ نہیں اور اخبار بکتا نہیں اس لئے اس کے اڈیٹر کو اخبار جاری رکھنے کے لئے دوسرے ذرایع کھوجنے پڑتے ہیں۔ جام جہاں نما ہندوستانی اخباروں میں بہترین ہے لیکن اس کی بھی یہ حالت ہے کہ اس میں طبع زاد مضامین نہیں ہوتے۔"[1]

"جام جہاں نما" کے بعد متعدد اخبار اور رسالے نکلے جن میں "آئینہ سکندری"، بمبئی مع اردو ضمیمہ (۱۸۴۳ء) "دہلی اخبار" مدیر محمد اکبر جد امجد محمد حسین آزاد (۱۸۳۷ء) "خیر خواہ ہند" مرزا پور زیر ادارت پادری آر۔ سی۔ ماتھر (۱۸۳۷ء) "سید الاخبار دہلی" (۱۸۴۱ء) "جامع الاخبار" مدیر سید رحمت اللہ مدراس (۱۸۴۲ء) "قران السعادین" دہلی (۱۸۴۵ء) فواید الناظرین مہتمم ماسٹر رام چندر دہلی (۱۸۴۵ء) "محب ہند" ماہنامہ مدیر رام چندر دہلی (۱۸۴۷ء) "سید الاخبار" آگرہ (۱۸۴۷ء) اعظم الاخبار مدراس (۱۸۴۸ء) "کوہ نور" مدیر سکھ رائے لاہور (۱۸۵۰ء) اور

---

[1] انڈو ایرانیکا۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء ص ۲۰

کشف الاخبار کاشف الاسرار' مدیر منشی امان علی بمبئی ۱۸۵۵ء اہم تھے[1]

سید احمد خاں نے بحیثیت صحافی "سید الاخبار" میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا اجرا ان کے بڑے بھائی سید محمد کی زیر ادارت لیتھوگرافک پریس دہلی سے ہوا۔ انھوں نے یہ مطبع اسی سال (۱۸۴۱ء) میں قائم کیا اور طباعت سید عبدالغفور کے ذمے تھی بڑے بھائی کے مرنے کے بعد سید احمد خاں نے ۱۸۴۶ء میں اس کا نام "مطبع سید الاخبار" رکھدیا اور وہ اس میں برابر مضامین لکھتے رہے مگر پھر ۱۸۴۹ء میں اسے مالی دشواریوں کی وجہ سے بند کرنا پڑا اور پریس بھی بک گیا۔ اس دوران انھیں طباعت و اشاعت کے کاموں سے بھی سابقہ پڑا تھا۔

اُردو صحافت ۱۸۵۷ء کے بعد بھی حقیقت نگاری اور بے خوف انداز تحریر سے پہلو تہی کرتی رہی اور اس سے پہلے تو یہ حالت تھی کہ

> " اس کی گہرائی میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف نفرت و عداوت کے بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آئیں گے اس کا نقطۂ عروج ۱۸۵۷ء کے اوایل کا زمانہ تھا جبکہ خبریں شایع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی اخباروں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف بغاوت کے جذبات عام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی"۔[2]

اس کی تصویر محمد حسین آزاد نے اپنی نظم "تاریخ انقلاب افزا" میں "دہلی اخبار" ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء میں یوں کھینچی:

کیا کہیئے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے	حیران ہیں سب آئینہ صفت پشت بدیوار
حکم نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش	مٹ جائے نشان خلق میں اسی طرح سے یکبار

رفتہ رفتہ صحافیوں میں حق گوئی اور اخلاقی جرات پیدا ہونے لگی۔ اخباروں کا معیار بہتر ہوا۔ نیز اخبارات کی پالیسی بھی واضح ہونے لگی اور تبصرے بھی ہونے لگے منشی نولکشور نے "اودھ اخبار" لکھنؤ سے ۱۸۵۹ء میں نکالا۔ جس کے ادبی حصہ میں فسانۂ آزاد ۱۸۷۸ء تا ۱۸۷۹ء شایع ہوا۔

---

[1] نادر علی خاں۔ اردو صحافت کی تاریخ' ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۷ء ص ۴۷

[2] محمد عتیق صدیقی۔ اٹھارہ سو ستاون کے اخبار اور دستاویزیں مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۱۹۶۶ء ص ۴۱

"یہ اخبار اپنے عہد کی ادبی، تمدنی، سیاسی، معاشی حالات کی مستند تاریخ اور معقول دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس میں اس عہد کے ایسے نادر واقعات ملتے ہیں جن سے موجودہ تاریخیں خالی ہیں۔"[1]

سید احمد خاں کے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۶ء سے اردو صحافت میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس میں خبریں انگریزی اخباروں جیسے لندن ٹیوز، اوورلینڈ میل، انگلش میل، کوارٹرلی ریویو وغیرہ سے ترجمہ کرکے چھاپی جاتی تھیں اور "تار برقی کی خبریں" کے زیر عنوان باہر کے مالک کی اطلاعات درج کی جاتی تھیں اور حالاتِ حاضرہ پر بے باک تبصرہ کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون "اخبار کیسے ہونے چاہیئں" میں لکھا کہ:

"کہتے ہیں کہ اخبار ایک نہایت عمدہ ذریعہ قومی ترقی، ملکی بھلائی، عوام کی رہنمائی، خواص کی دلچسپی، حکام کی ہدایت اور رعایا کی اطاعت کا ہے مگر اس کے دوسرے پہلو پر نظر کمتر کی جاتی ہے۔ اخبار جیسا ذریعہ ان بھلائیوں کا ہے ویسا ہی ذریعہ بہت سی برائیوں کا بھی ہے بلکہ افسوس ہے کہ ہمارا ملک ابھی پہلی قسم کے اخباروں کا نہایت محتاج ہے۔ ایسے اخباروں کی کمی سے اور زیادہ تر اخباروں کے پڑھنے لکھنے والوں کے نہ ہونے سے ملک میں جہالت اور ناخواندگی اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ کسی شہر وقصبہ میں فیصد پانچ آدمی بھی اخبار پڑھنے کے لائق نہ نکلیں گے اور جو نکلیں گے وہ اخبارات پڑھنے کو تضیع اوقات اور بے سود سمجھیں گے۔"[2]

ایک اور مضمون "اخبار نویسوں کی آزادی کیا چیز ہے؟" سے ان کا صحافتی شعور ظاہر ہو جاتا ہے۔

"آزادی ہمارے نزدیک اس بات کا نام ہے کہ کسی اخبار نویس کی طبیعت صاف گوئی اور راست بازی میں کسی کی غلام اور نابعدار نہ ہو۔"[3]

---

[1] امداد صابری، روح صحافت مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۱۹۶۸ء ص ۴۰

[2] اخبار رفیق ہند، جلد نمبر ۱، لاہور ۵ جنوری ۱۸۸۴ء ص ۱ - ۲

[3] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۸ شمارہ ۳۲ - ۸ اگست ۱۸۷۳ء ص ۷

انھوں نے آزادئ خیال اور آزادی اظہار کو ضروری قرار دیا جس کا اندازہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے سرورق (ماٹو) سے ہو جاتا ہے کہ

"جائز رکھنا چھاپہ کی آزادی کا کام ہے ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا کام ہے ایک آزاد رعیت کا۔" [1]

ان کے تبصروں میں انگریزی انداز صحافت کے اثرات نمایاں تھے۔ ان کے خیال میں صحافی کے فرائض تین قسم کے تھے کہ وہ صلاح دینے والا، تربیت کرنے والا اور معاشرت کی اصلاح کرنے والا ہوتا ہے۔ ایک ہوشمند اور باخبر صحافی کی طرح انھوں نے انگریزی اخبارات کا مقابلہ مقامی زبانوں کے اخباروں سے کیا اور اخبار نویسوں کو جھوٹ اور تہمت کے خلاف احتجاج پر آمادہ کیا۔

"اخبار پانیر" نے جن دیسی اخباروں کی بعض رایوں کا خلاصہ اپنے پرچہ میں درج فرمایا ہے ہم بھی ان کو ذیل میں نقل کرتے ہیں اور تمام ہمعصروں کو اس بات کی جانب مایل کرتے ہیں کہ دیکھو ہماری ہمدردیوں کو انگریزی خلاصہ نویس کیسا خاک میں ملاتے ہیں اور ہم کو کیسا بناتے ہیں اور جب وہ ان رایوں کو ایسی خراب حالت میں پیش کریں گے تو گورنمنٹ کیا خاک ہمارے خیالات کی قدر کرے گی۔ اگر ہم ہندوستانیوں نے اس موقع اور وقت کو ہاتھ سے کھو دیا اور کوئی مناسب تدبیر نہ کی تو آیندہ نہایت افسوس ہوگا ہم یقین کرتے ہیں کہ دیسی اخبار نویس جو اس الزام میں پھنسائے گئے تھے نہایت توجہ سے اس مضمون کو پڑھیں گے اور ہرگز اپنی رسوائی گوارا نہ کریں گے۔" [2]

سید احمد خاں صحافت کے اصول و قوانین سے آگاہ ایک پختہ کار صحافی کی طرح آزادی رائے کا احترام کرتے تھے۔ وہ غور و خوض کے بعد ہر چیز کے بارے میں خود رائے قایم کرتے اور اس کا اظہار بھی بے خوف و خطر کر دیتے تھے جس کا ثبوت گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے اداریوں اور متفرق مضامین سے مل جاتا ہے۔

[1] سرورق انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲ شمارہ ۲ ۱۱ جنوری ۱۸۶۷ء سید احمد پرایویٹ پریس۔ مینجر منشی محمد یار خاں
TO PERMIT THE LIBERTY OF THE PRESS IS THE PART OF A WISE GOVERNMENT: TO PRESERVE IT IS THE PART OF A FREE PEOPLE.

[2] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۸۔ شمارہ ۱۸۔ ۲ مئی ۱۸۷۳ء ص ۲۸۱

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

سید احمد خاں کے علی گڑھ تبادلہ ہونے پر سائنٹیفک سوسائٹی کا دفتر بھی یہیں منتقل ہو گیا اور علی گڑھ سے ہی اس کے اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا اجراء ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو ہوا جس کے سرورق پر نیم دائرے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ انگریزی میں اور اس کے نیچے "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" اردو میں لکھا تھا اور اس کا مقصد اولین شمارے میں مدیر سید احمد خاں نے بیان کیا:

"ارادہ ہے کہ اخبار میں نہایت عمدہ عمدہ مضامین جن کو بڑے بڑے قابل ہندوستان کے خیرخواہ انگریز اور قابل اور لائق ہندوستانی شرفا لکھیں گے چھاپے ہوں گے تاکہ عموماً ہندوستانیوں کو تعلیم بھی ہو اور لطف بھی حاصل ہو اور انگریزی زبان سے ترجمہ ہو کر نفیس اور عمدہ جو مضمون اب لکھے جاویں گے اور اخباروں سے ایسے مضمونوں کے ترجمے چھاپے جاویں گے جو ہندوستانیوں بلکہ کل انسانوں کے لئے مفید اور بکار آمد ہوں گے اور جن سے ہندوستان کے لوگ اور کسی طرح واقف نہیں ہو سکتے"۔[1]

ابتداء میں یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کا ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم ہوتا تھا۔ ایک کالم پر اردو اور اس کے متوازی دوسرے پر انگریزی ترجمہ چھپتا تھا اس کام کے لئے سوسائٹی سے باصلاحیت مترجمین کو منتخب کیا گیا اور کتابوں کے ترجمے کا ایک طویل پروگرام بھی مرتب ہوا۔ جس سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی روایت مقبول ہوئی۔

۸ ستمبر ۱۸۷۶ء میں ایک خاص تبدیلی یہ ہوئی کہ جگت سنگھ رئیس تاجپور ضلع بجنور نے اپنا پریس مع اخبار پر وگریس، سائنٹیفک سوسائٹی کو مرحمت کر دیا۔ چنانچہ اب گزٹ کے سرنامہ

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ جلد ۱، شمارہ ۱، ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء، سید احمد پرائیویٹ پریس مینیجر منشی محمد یار خاں علی گڑھ ص ۲۔

پر لکھا جانے لگا کہ

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جس میں اخبار پروگریس بھی ضم ہو گیا ہے"۔

اور اندر اطلاع دی گئی:

"ہم اپنے ناظرین اخبار اور ارباب مطابع اور دوستوں کو بخوشی مطلع کرتے ہیں کہ ہمارے دوست راجہ جگت سنگھ بہادر رئیس تاچپور نے مہربانی سے اپنا اخبار پروگریس نامی معہ آلات و سامان مطبع اپنی ملکیت سے ہم کو دے دیا ہے اور ہم راجہ صاحب موصوف کی اس عنایت کے تہہ دل سے نہایت شکر گزار ہیں اور شک نہیں کہ ناظرین اخبار بھی ان کی شکر گزاری میں دل سے شریک ہوں گے اخبار پروگریس پہلے تو مراد آباد سے چھپکر شایع ہوا کرتا تھا پھر تاچپور میں چھپتا تھا اور اس کے اخبار سین ٹیفک سوسائٹی میں شامل ہو جانے سے قطع نظر ہمارے فایدے کے وہ مراد بھی ہماری حاصل ہو گی جو ہمیشہ ہمارے مد نظر ہے اور آیندہ سے ہمارے اخبار کا نام اس طور سے لکھا جایا کرے گا:

اخبار سین ٹیفک سوسیٹی علی گڑھ جس میں پروگریس مل گیا ہے مگر شرح قیمت اخبار اور چندہ سب بدستور ویسا ہی رہے گا جیسا کہ اب تک تھا"[1]

پھر مدیر نے مزید اطلاع دی:

" واضح ہو کہ ماہ آیندہ سے ہمارا اخبار ہفتہ میں دو دفعہ جاری ہو گا یکشنبہ کو اور سہ شنبہ کو۔ صورت اخبار کی جو ہے وہ بھی تبدیل ہو جاوے گی۔ گل پھول اور محراب اور ٹیڑھے سیدھے اب اس زمانہ سادگی اور صفائی میں پسند نہیں۔ پس پیشانی اخبار کی نورانی ہو گی اور اس پر انگریزی و فارسی میں صرف علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ لکھا ہو گا۔ کاغذ بھی تبدیل ہو جاوے گا اور ٹیپ (ٹائپ) بھی بدل جاوے گا۔ سمال پیکا نہایت باریک ٹیپ (ٹائپ) حرفوں کا جو استعمال میں آیا تھا نہ آوے گا بلکہ پیکا

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد ۱۱، شمارہ ۴۴، ۸ ستمبر ۱۸۷۶ء ص ۵۰۰

استعمال میں آدے گا جس کے حروف موٹے اور روشن ہوتے ہیں۔

ہم کو امید ہے کہ ہمارے ناظرین اخبار ان سب تبدیلیوں کو پسند فرمائیں گے اور اخبار کے مضامین کو بھی بہ نسبت سابق زیادہ مفید اور دلچسپ پاویں گے"۔[۱]

اخبار یہ جون ۱۸۶۶ء سے صرف علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ لکھا جانے لگا اور مشہور بھی اسی نام سے ہوا۔ اس کا ماٹو (MOTTO) حسب ذیل ہے۔

"آزادی چھاپے کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی اور جبلی حق رعیت کا"۔[۲]

جو دسمبر ۱۸۶۶ء تک رہا اور جنوری ۱۸۶۷ء سے اس کے الفاظ میں قدرے تبدیلی ہوئی مگر معنی اور اسپرٹ وہی برقرار رہے اس ماٹو کے ذریعے حکومت اور عوام کے مابین رشتے اور عصری صحافت کے حقوق و فرائض کی ساری تفصیل کو اجمالاً بیان کر دیا ہے اور اس سے صحافت کے متعلق سید احمد خاں کے ذاتی نظریہ کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ قارئین کو اخبار کی وقتاً فوقتاً تبدیلیوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ

"ہم اپنے اخبار کے خریداروں کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے جو سر رشتہ تعلیم کی خبروں کا چھاپنا شروع کیا ہے کچھ شبہ نہیں کہ وہ مفید کام ہے اگر اس کے چھاپنے کا قصد مستقل ہو جاوے گا تو ہم سہ شنبہ کے اخبار کو بھی جو چھ ورق کا ہے آٹھ ورق کا کر دیں گے تاکہ تمام خبروں کے چھاپنے میں کوئی کمی نہ ہو"۔[۳]

۱۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد ۱۲، شمارہ ۲۱، ۲۵ رمئی ۱۸۷۷ء ص ۲۳۶

۲۔ سرورق انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۱، شمارہ ۱، ۳۰ رمارچ بروز جمعہ ۱۸۶۶ء انگریزی میں درج ہے کہ

LIBERTY OF PRESS IS A PROMINENT DUTY OF THE GOVERNMENT AND A NATURAL RIGHT OF THE SUBJECT.

سید احمد خاں پرائیویٹ پریس۔ علی گڑھ۔ باہتمام منشی محمد یار خاں

۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲، شمارہ ۲۹، اگست ۱۸۸۵ء ص ۹۴۸

اس کے بعد سررشتہ تعلیم کی خبروں کی اشاعت باقاعدہ ہونے لگی اور پھر اس کے مستقل طور پر چھپنے کی خبر دی گئی کہ

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ایک بائی ویکلی یعنی ہفتہ میں دو مرتبہ چھپنے والا اخبار ہے اور اس میں عام علمی مضامین انگریزی اور اردو میں چھپتے ہیں ......
اب یہ تجویز کی گئی ہے کہ سہ شنبہ کے اخبار میں کچھ تو خبریں عام اور کچھ سررشتہ تعلیم کی اضلاع شمال و مغرب و اودھ کے واسطے چھاپی جایا کریں اور یہ خبریں صاحب ڈائریکٹر کے حکم سے چھاپی جایا کریں گی۔ مدت سے اس قسم کے اخبار کی ضرورت معلوم ہوتی تھی جس میں ہر قسم کی تعلیمی خبریں ہوا کریں اور اسی ضرورت کو رفع کرنے کے واسطے یہ تجویز کی گئی ہے جسے صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے منظور کر لیا ہے چنانچہ ۵ ستمبر سے سہ شنبہ کا اخبار اسی تجویز کے مطابق جاری ہوا کرے گا۔"[1]

اس طرح سررشتہ تعلیم کا ایک نیا کالم گزٹ میں شروع ہوا جو کم و بیش آجکل کے ایمپلائمنٹ نیوز، کی طرز کا تھا اور اس کی وہی اہمیت تھی جو خدمت اب یہ انجام دیتا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت کا مسئلہ قدرے مبہم اور پیچیدہ ہے۔ اس کے پہلے پرچہ مطبوعہ مارچ ۱۸۶۶ء پر مہتمم منشی احمد یار خاں کا نام ملتا ہے مگر مدیر کا پتہ نہیں چلتا۔ اخبار کے آخری صفحہ پر حسب ذیل پرنٹ لاین چھپی کہ

"بمقام علی گڑھ سید احمد پرائیویٹ پریس میں چھپ کر باہتمام منشی محمد یار خاں کے مشتہر ہوا" غالباً مدیر سید احمد خاں ہی ہوں گے اور اس وقت تک رہے ہونگے جب تک کہ ان کا تبادلہ وسط اگست ۱۸۶۷ء میں بنارس ہوا۔

یکم نومبر ۱۸۶۷ء سے گزٹ کے مہتمم حافظ عبدالنذاق ہو گئے اور اسی وقت سے مولوی محمد اسماعیل (جو ادپر کوٹ علی گڑھ کے رہنے والے تھے) مدیر ہوئے اور دس سال تک رہے۔ سید احمد خاں نے جب ۱۸۷۶ء میں مستقل طور پر علی گڑھ میں

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲، شمارہ ۳۱، ۵ ستمبر ۱۸۸۵ء ص ۹۷۶

سکونت اختیار کی تو ادارت کی ذمہ داری ان پر عاید ہوئی:

"مولوی محمد اسماعیل نے اس اخبار کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا ہے اور وہ استعفیٰ منظور ہو گیا ہے۔ بالفعل بہ نظرِ وجوہ کے ایڈیٹری اس اخبار کی سید احمد خاں بہادر سی آئی ایس، لیبف آنریری سکریٹری اس سوسائٹی کے سپرد کی گئی جس کو وہ بہ نظرِ ترقی اخبار اور ترقی کاروبار سین ٹیفک سوسائٹی بلا کسی معاوضہ کے انجام دیں گے۔"[1]

لیکن اب بھی سر ورق یا آخری صفحہ پر ان کا نام بحیثیت مدیر نہیں چھپتا تھا البتہ جب کوئی خاص اطلاع دینی ہوتی تو نیچے سید احمد مدیر اعزازی لکھا ہوتا ہے جیسے

"بخدمت ممبران و خریداران اخبار

ہم پھر یاد دلاتے ہیں کہ جن ممبروں یا خریدارانِ اخبار کے پاس سے مبلغ پندرہ روپے قیمت اخبار نہ آجاویں گے ماہ جون سے ان کے نام نامی روانگی اخبار کی بند ہو جاوے گی۔"

راقم سید احمد سکریٹری سین ٹیفک سوسائٹی

و آنریری ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"[2]

وہ اخبار کی نگرانی تن دہی سے کرتے بیشتر مضامین اور اداریے بھی خود لکھتے تھے۔ کچھ مضامین کے لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس کے تحریر کردہ ہیں؟ لیکن طرز تحریر، زبان اور موضوع کے اعتبار سے سید احمد خاں کے معلوم ہوتے ہیں۔ گزٹ کی ایک پالیسی یہ بھی تھی کہ مضمون نگاروں کی رائے سے مدیر رسالہ کا متفق ہونا ضروری نہیں تھا۔ اختلافی مضامین اور مراسلت پر عام طور سے ادارتی نوٹ ہوتا جس سے مدیر کی رائے اور پرچہ کی پالیسی کا علم ہو جاتا تھا۔ پہلی بار ۲ر جنوری ۱۸۹۶ء سے باقاعدہ سر ورق پر مدیر کا نام چھپنے لگا اور وہ جب تک زندہ رہے ادارت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ البتہ مہتمم بدلتے رہے ان کے نام اور مدت ملازمت

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۱۲، شمارہ ۱۸، ۴ر مئی ۱۸۷۷ء ص ۲۷۴

[2] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ " " " ۲۱، ۲۵ر مئی ۱۸۷۷ء۔ پرنٹ لائین۔

حسب ذیل ہیں۔

منشی محمد یار خاں	۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء تا ۳۰ر اکتوبر ۱۸۶۷ء
حافظ عبدالرزاق	یکم نومبر ۱۸۶۷ء تا ۱۵ر اکتوبر ۱۸۷۸ء
حافظ عبدالرحمٰن	۱۹ر اکتوبر ۱۸۷۸ء تا ۱۲ر نومبر ۱۸۷۸ء
شیخ علیم اللہ	۱۶ر نومبر ۱۸۷۸ء تا ۱۳ر ستمبر ۱۸۷۹ء
گلاب رائے	۱۶ر ستمبر ۱۸۷۹ء تا ۳ر اپریل ۱۸۸۹ء
شیخ علیم اللہ	۲۴ر اپریل ۱۸۸۹ء تا ۷ر فروری ۱۸۹۳ء
محمد ممتاز الدین	۱۰ر فروری ۱۸۹۳ء تا ۹ر جولائی ۱۹۱۳ء

گزٹ میں تعلیم، تاریخ، سیاست، مذہب، ادب، سائنس اور دیگر موضوعات پر طبع زاد مضامین اور ترجمے شایع ہوتے تھے اس کے علاوہ تعلیمی مہم کو تیز کرنے کے لئے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی رپورٹیں طبع ہوتی تھیں تاکہ عوام اس کی کارگزاری سے واقف ہوسکیں۔

سید احمد خاں مسلمانوں کو تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر بنانے کے لئے مختلف ترکیبوں سے کام لے رہے تھے وہ مغربی اقوام کی ترقی کا مقابلہ ہندوستانیوں کی عمومی پس ماندگی سے کرتے رہے مثلاً "ہندوستان اور انگلستان کی تعلیم" مصنفہ رابرٹ ہنری ایلیٹ کے مضمون کا اردو ترجمہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اکمل الاخبار دہلی سے نقل کیا گیا جس پر مدیر نے نوٹ میں اشارہ کیا:

"جب تک گروہ کثیر مسلمانوں کا ایک جگہ نہ رکھا جائے ایک جگہ تعلیم نہ دی جاوے، خراب سوسائٹی سے ان کو نہ بچایا جاوے ان کے بہلانے اور خوش رکھنے کیلئے کوئی عمدہ سوسائٹی نہ بنائی جاوے ان کو تعلیم اور علم میں مشغول رکھنے کے لئے کوئی طریقہ اسکالرشپ یا فیلوشپ نہ مقرر کیا جاوے اور اس سوسائٹی کے ذی علم لوگ ایک جگہ نہ جمع کیے جاویں ترقی ناممکن ہے۔" [۱]

سید احمد خاں کی کوششوں کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ نے زیر عنوان "مدرستہ العلوم

---

[۱] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ جلد ۲۸ شمارہ ۹۰، ۱۰ر نومبر ۱۸۹۳ء ص ۲۶

اور مسلمانانِ علی گڑھ" میں لکھا۔

"اس کالج کے بانی عالی دماغ کو اس کالج کا ایک خواب دکھائی دیا تھا جس میں ان کو دو چیزیں دکھائی دیتی تھیں جو کسی اور کو نہیں دکھائی دیتی تھیں اب وہ ساری باتیں سچی ہوئیں اور سب کو دکھائی دینے لگیں۔

اس کالج کی خوش انتظامی دیکھیں تو تعجب ہوتا ہے کہ ۲۳۰ لڑکوں کی برات کو وقت معینہ پر جس میں ایک منٹ کی بھی دیر سویر نہیں ہوتی ہر موسم میں کھانا ملتا ہے غرض یہ کام پرنسپل صاحب کا جس میں اتوار کو بھی تعطیل نہیں لکچر دینے سے زیادہ مشکل ہے"[1]

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی ترقی، طلبار کی امتحانات میں کامیابی" ان کی اقامتی زندگی، اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانا اور عطیات دہندگان کی تفصیل گزٹ میں شایع ہوتی۔ مثلاً

محمد رفیق طالب علم مدرستہ العلوم کیمبرج یونیورسٹی میں۔

بورڈنگ ہاؤس مدرستہ العلوم۔

رپورٹ سالانہ کارروائی۔

بجٹ یعنی تخمینہ آمد و خرچ مدرستہ العلوم بابت ۱۸۸۱ء۔

سالانہ اجلاس مدرستہ العلوم۔

مدرستہ العلوم میں عربی زبان کی تدریس۔

انتظام جسمانی ورزشیں بورڈران مدرستہ العلوم۔

مدرستہ العلوم کا کلکتہ سے افیلیٹیڈ ہونا۔

مدرستہ العلوم علی گڑھ آیندہ سے انٹرنس اور ایف اے کا سینٹر ہوگا۔

شفاخانہ مدرستہ العلوم۔

انھوں نے اپنی ترجیح کی وضاحت بھی کی کہ لڑکیوں کی تعلیم سے پہلے لڑکوں کی

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲۸، شمارہ ۳۸، ۱۲ر مئی ۱۸۹۳ء ص ۷۰۰

ضروری ہے تاکہ بہتر معاشرے کی تشکیل ہو سکے کیونکہ غیر مہذب اور ان پڑھ مردوں کے ساتھ حساس اور تعلیم یافتہ عورتوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی مگر پھر بھی ان کے ساتھیوں نے تعلیم نسواں جیسے متنازعہ مسئلہ پر اظہار خیال کیا مثال کے طور پر اسی عنوان سے حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاؤلی نے لکھا:

"عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ہندوستان کی بہت سی اقوام میں طے ہو چکا ہے مگر مسلمان جس طرح ہر ایک تعلیمی امر کے تمام پہلوؤں پر بہت کچھ غور کیا کرتے ہیں اسی طرح یہ مسئلہ اب تک ان کے زیر تجویز ہے"[1]

پھر انھوں نے معاشی صورت کی طرف توجہ دلائی کہ

"اوسط درجے کے لوگوں کو معزز طریقوں میں روپیہ پیدا کرنے کے واسطے لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے"[2]

اور ۱۸۹۹ء کے پرچہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد چھپی تو اس میں یہ قرارداد شامل تھی کہ ہر صوبہ کے صدر مقام اور علمی مراکز میں احکامِ اسلام اور شریف خاندانوں کے رسم و رواج کے مطابق زنانہ مدرسے کھولے جائیں۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں دینی مسائل کی تشریح و تصریح کے مقصد سے مضامین نہیں لکھے گئے لیکن تعلیمی اور معاشرتی موضوعات پر لکھتے وقت مذہبی نقطۂ نظر کی وضاحت ضروری تھی۔ تنگ نظری کی بیخ کنی اور مختلف فرقوں کے مابین رواداری کی فضا ہموار کی گئی۔ مثلاً ایک مضمون پر سید احمد خاں نے بطور تمہید لکھا،

"ہمارے کالج میں شیعہ سنّی دونوں بورڈر ہیں اور ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ دونوں میں اتفاق زیادہ ہو۔ اس کا ذکر ہم نے ایک شیعہ دوست سے کیا انھوں نے کہا ایک تحریر "باب اتحاد جماعت" ہمارے پاس بھی

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۳۰، ۱۳ مارچ ۱۸۹۳ء ص ۲۶۴

[2] ایضاً

جس کو ہم چھاپتے ہیں"۔[1] اسی مضمون میں یہ تجویز بھی ملتی ہے کہ

"ہر ایک مذہب والے کا دوسرے مذہب والے کے پیچھے نماز پڑھنا، ہر ایک مسجد میں بغیر اس کے کہ وہ کس مذہب (فرقہ) والے کی بنوائی ہوئی ہو، نماز پڑھنا شروع کرو تو بہت کچھ تنازعات اور تعصبات باہمی کم ہو جاویں"۔[2]

ایک مضمون میں "عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی مروّت و اتحاد" میں دونوں مذاہب کے درمیان اسلامی تاریخ کے تناظر میں مشترک عناصر اور رواداری کو نمایاں کیا گیا مولوی ذکاء اللہ نے "بغیر دل آزاری کے محققانہ مذہبی لکچر کی مشکلات" میں تحقیق و تفتیش کو اہم کہا؛

"اکثر لوگ مذہب کی تحقیق سے ناراض ہو جاتے ہیں جب کہ ایسا کرنا غلط ہے کیونکہ اس سے مذہب کی تحقیر نہیں ہوتی بلکہ اس کی سچائی اور اس کی عظمت لوگوں پر عیاں ہوتی ہے"۔[3]

ایک اور مضمون "ہندوستانیوں کو باہم محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہیے" میں سید احمد خاں نے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق سے رہنے کو تہذیب کی علامت بتایا۔

"شائستگی اور اخلاق اس اتفاق اور حسن سلوک اور حبّ وطنی کا نام ہے جن پر ملک کی رونق یقیناً مترتب ہوتی ہے ... مگر ان دونوں میں اس قسم کے بے جا تعصبات پھیلے ہوئے ہیں کہ ہرگز ایک دوسرے کی فلاح کے خواہاں نہیں .... اگر تمام ہندوستان کے باشندے اس مذہبی مخالفت کو چھوڑ کر ملکی فلاح میں ایک دل ہو جائیں تو ہندوستان بھی ایک بڑا نامور ملک ہو جاوے اور اتفاق و محبت کے طفیل سے اوس کے باشندوں کے کمال تمام روئے زمین پر اثر پہنچاویں"۔[4]

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲۸، شمارہ ۳۰ جنوری ۱۸۹۳ء ص ۳۲

[2] ایضاً ص ۳۵

[3] " " شمارہ ۳۰، ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء ص ۳۵

[4] " " ۴، شمارہ ۴۴، ۲۹ اکتوبر ۱۸۶۹ء ص ۶۹۶-۶۹۷

سید احمد خاں نے معاشرتی اصلاح انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر کی یعنی افراد کی کمزوریاں اور قوم کی خامیوں کی نشاندہی کے بعد ان پر خود لکھا اور اپنے ساتھیوں سے لکھوایا۔ چند عنوانات اس سلسلے میں درج ذیل ہیں۔

تعصب

مروت

حسد کی برائی

کفایت شعاری

شرافت

تہذیب نفس

انسانی ہمدردی

شائستگی کیا چیز ہے؟

انھوں نے اجتماعی سطح پر حقوقِ نسواں کو معاشرہ کی اصلاح میں اہمیت دی اور "بیوہ عورتوں کے نکاح نہ کرنے کا نتیجہ" اور "بیوہ عورتوں کے نکاح نہ کرنے سے کیا فساد ہے؟" جیسے مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تعدد ازدواج کو بھی اخلاقی نقطۂ نظر سے غلط قرار دیا۔ چھوٹے غریب بچے بھی ان کی توجہ کے مرکز بنے۔ ان کی نظر میں بچوں کی پرداخت اور تحفظ قوم کی تعمیر میں اہمیت رکھتے ہیں، اپنے مضمون "ایک تدبیر یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش" میں کہا کہ ہم پر ان کی مدد لازم آتی ہے اور یہی انسانی ہمدردی کا بھی تقاضا ہے کہ

" ہندوستان میں قحط کی بلا اکثر آتی ہے اور خصوصاً اس بلا میں اور نیز دیگر واقعات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے صغیر سن بچے یتیم اور لاوارث رہ جاتے ہیں .....

پادری صاحبان جو ہماری ملک میں ہر جگہ موجود ہیں ان کو ایسے یتیم اور لاوارث بچوں کو عیسائی بنانے کا خوب موقع ملتا ہے اور وہ ان کی تعلیم اور پرورش کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔"[1]

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۱۲، شمارہ ۷۷، ۲۷ را پریل ۱۸۷۷ء ص ۲۸۱ تا ۲۸۲

دختر کشی کی قبیح رسم کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے "دختر کشی کے انسداد کے قاعدے" پر مضمون لکھا جو ۱۸۷۱ء کے گزٹ میں شایع ہوا۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں علمی و ادبی مضامین کے تحت بیشتر مدرسہ کی علمی سرگرمیوں کی خبریں اور منصوبے طبع ہوتے تھے۔ مثلاً اخوان الصفا کے جلسے میں پڑھا گیا مضمون "ہندوستان کی خاص زبان" ۲۷ نومبر ۱۸۹۳ء کے پرچے میں چھپا کہ اردو زبان کی ابتدا میں سنسکرت، بھاشاؤں اور فارسی کے اثرات گہرے تھے اور اس کا خمیر مختلف زبانوں اور بولیوں سے اٹھا ہے۔ ایک دوسری نشست کی رپورٹ میں علم و ادب کی اہمیت اور بالخصوص اردو شاعری سے بحث تھی اور عشقیہ جذبات کی شدت آمیز عکاسی کی وجہ سے اسے لائق مذمت قرار دیا گیا۔ ایک اور نشست کی تفصیلی خبر ہے کہ سید کرامت حسین نے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب کے ایک باب کا ترجمہ پڑھا۔ سید احمد خاں نے ایک مضمون میں ترجمے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اردو زبان کی مفلسی کا ذمہ دار نوجوانوں کو ٹھہرایا۔

> "اردو زبان کی بے بضاعتی اور مفلسی کے ذمہ دار بھی انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔۔۔
> انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں نے اپنی زبان کو یورپ کی زبانوں کے ذخیرے سے مالا مال کر دیا۔ پروفیسر شبلی نے اس خیال کے مطابق ایک دردناک واقعی امر اردو زبان بولنے والے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی بے توجہی کا بیان کیا اور خواہش ظاہر کی کہ یوروپین مصنفوں کے اعلیٰ مقالات کا لفظی ترجمہ کر دیا جاوے جن میں ان کی مخصوص خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انگریزی جاننے والے اور ان خوبیوں سے بہرہ اندوز ہونے اور ان سے اپنی اردو زبان کو بھر دینے کا موقع ملے گا۔"[1]

طلبا کی نگارشات پر تبصرے چھپتے تھے مثلاً ایک طالب علم داؤد بھائی کی عربی نظم پر ریویو تھا کہ

> "یہ نظم ہمارے کالج کے ایک لایق طالب علم نے کالج کے بارے میں لکھی جس سے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ کالج کا یہی مقصد نہیں کہ طلبا میں صرف انگریزی

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲۸، شمارہ ۵۳، ۴ جولائی ۱۸۹۲ء ص ۶۵۴

کی لیاقت پیدا ہو بلکہ عربی و فارسی کا علم بھی ہمارے لئے ایسا ہی ضروری ہے"۔[1]

ایک اور نظم پر تبصرہ میں شکایت کی گئی کہ

"ہمارے نوجوان انگریزی پڑھنے والے اردو شاعری میں بھی وہی رنگ ڈھونڈتے ہیں چونکہ پچھلے زمانے کا مذاق ہی اور تھا اس لئے انھیں اردو شاعری سے نفرت ہو جاتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اس ذخیرے جس میں خزف ریزے اور جواہرات ملے جلے ہیں ڈھونڈھ کے موتی رول لیں وہ اُسے بالکل چھوڑ دیتے ہیں"۔[2]

گزٹ کے لکھنے والوں میں سید احمد خاں کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک مولوی نذیر احمد، حالی، شبلی اور وحید الدین سلیم کے نام بار بار نظر آتے ہیں، ان کی علمی، اصلاحی فکری اور ادبی کاوشیں اگر اخبار کے منتشر اوراق سے جمع کی جائیں تو تاریخی اعتبار سے دلچسپ دستاویز ہو گی۔ اس کے زیر اثر اخبار انسٹی ٹیوٹ پٹنہ، اخبار الاخیار مظفرپور، مفید عام آگرہ، اخبار سوشل راجپوتانہ، اخبار انجمن شاہجہانپور وغیرہ نکلے۔

سید احمد خاں کے انتقال کے بعد گزٹ کی انفرادی حیثیت ختم ہو گئی اور اپریل ۱۸۹۶ء میں وہ کالج میگزین میں ضم ہو گیا ہے اور ایک خاص ضمیمہ (اسپیشل سپلیمنٹ) کے ذریعہ ذیل کی اطلاع دی گئی کہ

"THE ALIGARH INSTITUTE GAZETTE WITH THE PROGRESS HAS BEEN INCORPORATED WITH THE MAGAZINE. SO IT IS ONLY A RECORD OF THE EDUCATIONAL MOVEMENT OF THE LEADING MUSALMANS OF INDIA AND EXPECTS GREATER PATRONAGE FROM THE MEMBERS OF THE SAME NATION"

THEODORE BECK

NIAZ AHMAD KHAN (MANAGER)

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ جلد ۲۸، شمارہ ۲۷، ۴/ اپریل ۱۸۹۳ء ص ۳۴۴

[2] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ " " " ۹۱ ۴/ اگست ۱۸۹۳ء ص ۹۴۷

اب پرچہ کا پورا نام "ایم اے او کالج میگزین اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ معہ پروگریس" ہوا اور یہی صورتِ حال جنوری ۱۸۹۹ء تک رہی۔ البتہ فروری کے شمارہ میں گزٹ شامل نہیں تھا پھر مئی سے فروری ۱۹۰۱ء تک میگزین کے ساتھ ہی گزٹ نکلا۔ اسی سال ۱۲ فروری سے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ معہ تہذیب الاخلاق" دسمبر ۱۹۰۷ء تک محسن الملک کی ادارت میں چھپتا رہا۔ ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء سے مدیر وحیدالدین سلیم ہو گئے اور ۱۴ جنوری ۱۹۰۹ء سے تہذیب الاخلاق خارج کر کے صرف انسٹی ٹیوٹ گزٹ وحیدالدین سلیم کی ادارت میں شایع ہوتا رہا۔ ۱۹۱۱ء میں گزٹ سے مدیر کا نام غائب ہو گیا مگر ممتازالدین مہتمم کی حیثیت سے باقی رہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو جب گزٹ کے مدیر نواب محمد اسحاق خاں (سکریٹری کالج) ہو گئے تو انھوں نے چھ افراد پر مشتمل ایک مجلس منتظمہ (ڈاکٹر ضیاءالدین، میر ولایت حسین، مولوی ابوالحسن، مولوی ادریس، حسن محمد حیات اور مقتدیٰ خاں شیروانی) بنائی اور اشاعت کی ذمہ داری اس کے معتمد مقتدیٰ خاں شیروانی کے سپرد ہوئی اور ۱۲ اپریل ۱۹۱۳ء سے دسمبر ۱۹۲۰ء تک وہ مدیر رہے۔ اسی سال ۲۲ دسمبر کے پرچے میں قارئین کو ایک اعلان کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ

"بفضلِ خدا کالج ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچ گیا ہے اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مسلم یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچانے کی تجویز ہے"۔

چنانچہ ۵ جنوری ۱۹۲۱ء کے شمارہ سے اس کا نام "مسلم یونیورسٹی گزٹ" ہو گیا۔ جسے حسبِ دستور مقتدیٰ خاں شیروانی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے آخر ۱۹۲۴ء تک طبع کرتے رہے اور آج بھی ۱۹۹۲ء میں یونیورسٹی کا یہ خبرنامہ اسی نام سے شایع ہو رہا ہے۔ جس کے موجودہ مدیر نسیم احمد فردوسی اور معاون مدیر عبدالجلیل خاں ہیں۔

تہذیب الاخلاق

لندن کے دورانِ قیام سید احمد خاں کو ایک ایسا رسالہ جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کے ذریعے قوم کی ذہنی تربیت کی جا سکے۔ اس کے بارے میں انھوں نے محسن الملک کو یکم شوال ۱۲۸۶ھ/۱۸۷۰ء میں لکھا:

"ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرنا تجویز کر لیا ہے اور تہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں محمڈن سوشل رفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا منظر نامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے۔"[1]

پھر ایک خط مورخہ ۲۷ مئی ۱۸۶۹ء میں وہیں سے انھیں مشورہ دیا کہ

"ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کر کر دیں گے اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور بقیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔ اس میں میں اور آپ دونوں آرٹیکل لکھنے والے ہوں گے اور اگر صلاح ہو گی تو منشی زکاءاللہ صاحب کو اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شریک کریں گے۔"[2]

وطن واپس آکر انھوں نے تہذیب الاخلاق کا اجرا ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو کیا اور تحریر کیا کہ

"اس پرچے میں صرف مضامین مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپہ ہوتے ہیں اور اس سبب سے اخبار مصارو دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ مقصود اس

---

[1] سید احمد خاں۔ سفرنامہ مسافرانِ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور ۱۹۶۱ء ص ۲۶۲

[2] سرسید کے خطوط مرتبہ وحید الدین سلیم اڈیٹر معارف۔ حالی پریس پانی پت۔ ص ۶۸

پرچہ کے اجراء سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور
جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے
برخلاف ہیں وہ بھی مٹائے جاویں"[1]

اسی شمارے میں آگے چل کر انھوں نے مزید وضاحت کی:

"تہذیب الاخلاق کے جاری کرنے سے ہماری قوم کی حالت، معاشرت کی اصلاح مقصود و
مطلوب ہے اور اسی واسطے سوشل رفارمر یعنی تہذیب الاخلاق اس کا نام رکھا"[2]

ابتداً یہ پرچہ پندرہ روزہ تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک ماہانہ رسالہ کی شکل اختیار کر لی۔
اپنے بانی کے علاوہ اس کے دوسرے لکھنے والوں میں محسن الملک، ذکاء اللہ، محمد احسان اللہ
عباسی، الطاف حسین حالی اور وقار الملک کے نام قابل ذکر ہیں۔ سید احمد خاں کی زندگی میں یہ تین
بار نکلا اور بند ہوا، اس کی مدت عمر دس سے آگے نہ بڑھ سکی پہلی بار چھ سال کے بعد ۱۸۷۶ء میں
بند ہوا اور قارئین کے اصرار پر سال بھر کے لئے ۱۸۷۹ء میں دوبارہ شایع ہوا۔ پھر ۱۸۸۱ء میں
اس کا سلسلۂ اشاعت منقطع ہوا اور تیسری بار اس کا اجراء ۱۸۹۴ء میں ہوا اور ۱۸۹۷ء تک چھپتا
رہا۔ سید احمد خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ محسن الملک کی ادارت
میں دسمبر ۱۹۰۰ء تک شایع ہوا پھر وحید الدین سلیم اس کے مدیر ۱۴ جنوری ۱۹۰۹ء تک رہے اور
تقریباً پچھتر سال بعد موجودہ دور میں وائس چانسلر سید حامد نے اس کا اجراء فروری ۱۹۸۲ء
میں کیا جو تا حال جاری ہے وہ خود اس کے مدیر تھے اور قاضی معز الدین احمد مدیر مسئول۔ سید حامد
نے اداریہ میں کہا:

"تہذیب الاخلاق نام رکھنے کی جسارت تسلسل کی خاطر کی جا رہی ہے اور توانائی
اور روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی۔ تاریخ کا یہ بڑا طنز ہے کہ چند صدیاں گزرنے
کے بعد وہی لوگ، جو مشاہدہ، تجربہ اور غور و فکر کے علمبردار اور علم و اخلاق کے کاروان سالار

---

[1] رسالہ تہذیب الاخلاق جلد اول شمارہ ۱، ۱۸۷۰ء مطبع انسٹی ٹیوٹ بمقام علی گڑھ باہتمام محمد مشتاق حسین ص ۲
[2] ایضاً ص ۸

تھے۔ جہالت جمود اور اندھی تقلید کے حصار میں آبیٹھے۔۔۔۔۔ حالات اور ان سے زیادہ ہماری بے حسی میں تہذیب الاخلاق دراڑ ڈال سکے گا یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس رسالہ کا اجرا اور احیا اسی امید کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔"[1]

سید احمد خاں کو اقوام عالم کی تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے جب انگلستان کے تاریخی اور معاشرتی حالات کا مطالعہ کیا تو وہ اٹھارہویں صدی کے مشہور انگریزی رسائے "ٹیٹلر" اور "اسپیکٹیٹر" (۱۸۱۱ء - ۱۸۱۴ء) کی معنویت کے قایل ہوئے اور ان ہی کی طرز پر اپنا رسالہ نکالا:

"جب ہم کچھ اوپر ڈیڑھ سو برس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ لندن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں ہے اور وہاں بھی اس زمانے میں اسی قسم کے پرچے جاری ہوئے تھے جن کے سبب تمام چیزوں میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی تھی۔"[2]

انھوں نے "مقاصد تہذیب الاخلاق" کے زیر عنوان اپنی کوشش پر خوشی کا اظہار کیا کہ

"غرضیکہ جو کچھ اس زمانے میں فرنگستان میں تھا وہی کچھ بلکہ اس سے بھی زیادہ اب ہندوستان میں موجود ہے اور بلاشبہ ایک ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کی یہاں ضرورت تھی سو خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ انھیں کے قائم مقام مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں جاری ہوا۔"[3]

اور اس کے پہلے شمارہ کی تمہید میں کہا کہ

"اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلاویں۔"

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد چہارم شمارہ ۱۔ فروری ۱۹۸۲ء پبلشر قاضی معز الدین، لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ص ۵ - ۱۰

[2] رسالہ تہذیب الاخلاق جلد سوم شمارہ ۱ ۱۸۷۲ء مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ص ۲

[3] ایضاً " " " " " ص ۵

سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اور اس سے مراد انسان کے تمام افعالِ ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن بصرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون اور ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی تک پہنچانا اور ان سے نہایت خوبی اور خوش اخلاقی اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے"۔ لہ

اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے متعدد مضامین لکھے اور تہذیب پر دیگر اہلِ قلم کی تحریریں بھی چھاپی گئیں۔ دو مغربی دانشوروں" ہنری طامس بکل اور الیف گیزٹ کے فرانسیسی مضامین ترجمۂ ولیم ہیبز کیٹ بزبانِ انگریزی اردو میں منتقل کئے گئے اور الیف گیزٹ کے ان سات لیکچروں کا سلسلہ بعنوان "تہذیب" شائع ہوا اسی موضوع پر بکل کی ہسٹری آف سویلزیشن ان انگلینڈ سے بھی اخذ کر کے چند مضامین قسط وار چھپے۔

سید احمد خاں نے بعنوان "تہذیب اور قانون طبعی کا اثر جو سوسیٹی یعنی مجمع انسانی کی بناوٹ پر اور ہر شخص کے چال چلن پر ہوتا ہے" میں عناصر ترکیبی بیان کئے کہ

"اگر ہم ان طبعی اسباب کی تحقیقات کریں جن کا اثر انسان پر نہایت قوی ہوتا ہے تو ہم ان کو چار قسموں میں منقسم پاویں گے یعنی آب و ہوا، خوراک، زمین اور نیچر۔ نیچر کی عام صورت سے میری مراد ان چیزوں سے ہے جو خصوصاً نظر کے آگے آتی ہیں اور جو بذریعہ قوتِ باصرہ یا دیگر حواس کے خیالات کو بیدار کرتی ہیں اور اسی سبب سے مختلف ملکوں میں قومی خیال کی مختلف عادتیں پیدا ہوتی ہیں بیرونی باتیں جن کا اثر انسان پر مستحکم ہوتا ہے ان کا موجب انھیں چار قسموں میں سے ایک قسم ہوتی ہے آخر قسم جس کو میں نیچر کی عام صورت کہتا ہوں اس کا خاص نتیجہ یہ ہے کہ وہ وہم کو ابھارتی ہے اور بے شمار تعصب کے خیالات پیدا کرتی ہے جو علم کی ترقی کے مانع ہوتے ہیں ... باقی تین اسباب یعنی آب و ہوا خوراک زمین، سوسیٹی کے بننے میں ان تینوں کا بھی بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور انھیں کے اثر سے قوموں کے درمیان

لہ تہذیب الاخلاق جلد اول نمبر ا یکم شوال ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ باہتمام منشی محمد مشتاق علی

فرق پیدا ہوتا ہے۔"[1]

پھر انھوں نے مختلف ممالک کی آب و ہوا، غذا، زمین اور نیچر کی مماثل خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے تہذیبی اشتراک کو پیش کیا:

" مصر کی تہذیب ہندوستان کی مانند زمین کی زرخیزی سے ہوتی ہے اور چونکہ آب و ہوا بھی وہاں کی نہایت گرم ہے اس لئے ان دونوں ملکوں میں قوم کی خوراک سستی اور بکثرت ہے اسی سبب سے محنت کا بازار پُر رہتا ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت کی تقسیم میں کمی بیشی پیدا ہوئی اور اس سے وہ سب نتیجے پیدا ہوئے جو اس قسم کی کمی بیشی سے پیدا ہوتے ہیں۔"[2]

ایک اور مضمون "عزت" کی اصل پر زور دیتے ہوئے لکھا:

" دولت، حکومت، حشمت ان کو معزز بنا دیتا ہے مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا جیسے کہ ایک تانبہ کی مورت پر سونے کا ملمع کر دیا گیا ہو جب تک کہ وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو اس وقت تک۔ درحقیقت کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے۔ یہی حال انسان کا ہے جب تک کہ اس کی اندرونی حالت بھی عزت کے قابل نہ ہو وہ معزز نہیں ہو سکتا۔"[3]

پھر وہ ایک اور مضمون "طریقہ زندگی" میں ہندوستانی اقوام کا ذکر کرتے ہیں کہ

" ہندو، مسلمان، انگریز ان تینوں قوموں کا جو طریق لباس اور طریق زندگی اور کھانے پینے کی رسم اور اٹھنے بیٹھنے کی عادت ہے اس سے تمام لوگ ہندوستان کے واقف ہیں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ان تینوں قوموں میں سے جس قوم کا طریقہ اعلیٰ ہے وہ قوم باقی دو کو ایسا ہی ذلیل، ناتربیت یافتہ اور ناقابل تعریف سمجھتی

---

[1] تہذیب الاخلاق۔ جلد ششم شمارہ ۲۔ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء ص ۲۶

[2] " جلد اول شمارہ ۵ ۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء ص ۵

[3] تہذیب الاخلاق۔ جلد دوم شمارہ ۵۵ دورِ سوم یکم صفر ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۶ء ص ۳۴

ہے جیسے کہ ہم اپنے سے ادنیٰ قوموں کو سمجھتے ہیں۔"[1]

تہذیب و تمدن کے حصول و ترقی کے مشورہ کے ساتھ سید احمد قوم کے افراد کے روزمرّہ مسائل پر مضامین لکھتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ انفرادی کوشش سے پوری قوم مائل بہ ترقی ہوتی ہے۔

"انسان ترقی کی منزل پر پہنچنے کے لئے خود کوشش کرے وہ دوسروں کا محتاج اور دستِ نگر نہ ہو۔ اگر ہر فرد اس اصول پر کاربند ہو تو پوری قوم ترقی کر سکتی ہے۔"[2]

اصلاحِ رسوم اور عزتِ نفس کی اہمیت پر مضامین لکھے۔ ایک مضمون میں انھوں نے تعصب کے بارے میں لکھا اور یہ بتایا کہ

"تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال ان میں نہیں آتا، تربیت و شائستگی، تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا جبکہ وہ مذہبی غلط نما نیکی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سم قاتل ہو جاتا ہے کیونکہ مذہب اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب و برباد کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا داؤ تعصب کو مذہبی رنگ سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتے کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھلانا ہے۔"[3]

انھوں نے رسم و رواج، ہمدردی، آزادیٔ رائے، تربیت اطفال، غلامی، عورتوں کے حقوق، علومِ جدیدہ، کاہلی، تعلیم و تربیت، طریق تناول طعام، اخلاق، ریاکاری، خوشامد اور مہذب قوموں کی پیروی جیسے مضامین لکھ کر قوم کو نسبتاً بہتر زندگی کا تصور دیا۔ اور دوسرے حضرات سے بھی معاشرہ کی درستی اور صحت بخش موضوعات پر لکھنے کی فرمائش کی تعلیم پر کچھ عنوانات حسب ذیل ہیں جنھیں سید احمد خاں کی تعلیمی سرگرمیوں کی روداد بھی کہا جا سکتا ہے۔

مذہب اور تعلیم

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد دوم۔ شمارہ ۵۵ دورِ سوم ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ ۱۸۷۱ء ص ۵

[2] " " اول " اول یکم شعبان ۱۲۸۶ھ ۱۸۷۰ء علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ص ۷

[3] تہذیب الاخلاق جلد اول شمارہ اول یکم شوال ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۷۰ء، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ص ۸

مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے گورنمنٹ کی تدبیریں

مسلمان اور تعلیم زبان انگریزی

ہندوستانیوں کی تعلیم ولایت میں

طریقہ تعلیم مسلمانان

سید احمد خاں کے مضامین میں مذہب کو جدید زندگی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش ملتی ہے ان میں ایسے مذہبی مسایل زیر بحث آئے جن کا تعلق عام زندگی سے براہِ راست ہوتا ہے اس کے متعلق انھوں نے لکھا کہ مذہبی معاملات سے پہلو بچانا ہندوستانیوں کے لئے ممکن نہیں:

"اصل مقصد تو ہمارے اس پرچے کا تہذیب قومی ہے۔ مسائلِ مذہبی کی بحث بہ مجبوری آجاتی ہے۔"[1]

پھر آیندہ سطور میں اپنی مجبوری کی وضاحت ان الفاظ میں کی کہ

"اسٹیل اور اڈیسن کو ایک بات کی بھی بہت آسانی تھی کہ ان کی تحریریں اور ان کے خیالات جہاں تک تھے تہذیب و شائستگی و حسن معاشرت پر محدود تھے۔ مذہبی مسائل کی چھیڑ چھاڑ انھیں کچھ نہیں تھی۔ ہم بھی مذہبی خیالات سے بچنا چاہتے ہیں مگر ہمارے یہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر مذہبی بحث کے ایک قدم بھی تہذیب و شائستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے۔ جس بات کو کہو کہ فوراً جواب ملے گا مذہباً ثواب ہے اور جس بات کو کہو سیکھو اس وقت کوئی بولے گا کہ مذہباً منع ہے۔ پس ہم مجبور ہیں کہ تہذیب و شائستگی اور حسنِ معاشرت سکھلانے میں ہم کو مذہبی بحث کرنی پڑتی ہے۔"[2]

وہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام دینِ فطرت ہے انھوں نے اسلام کے بنیادی عقاید کے متعلق سائنٹیفک انداز میں بحث کی۔ ایک مضمون بعنوان

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۵۔ شمارہ ۱۵ یکم محرم الحرام ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء ص ۳

[2] ایضاً " " " " " ص ۵

عقاید مذہب اسلام میں انھوں نے اسباب وعلل کی روشنی میں اپنے عقیدے کی تصریح کی:

"مذہب اسلام کا سب سے پہلا عقیدہ یہ ہے کہ تمام کائنات کا کوئی خالق ہے یہ سب کچھ جو موجود ہے اور جس کو ہم کسی طرح جان سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں یا خیال کر سکتے ہیں ایک ایسے سلسلے سے مربوط ہے کہ ایک وجود دوسرے پر اور دوسرے کا تیسرے پر منحصر ہے پس ضرور ہے کہ یہ سلسلہ کسی آخر وجود یا علت یا سبب پر منتہی ہو اور جس پر یہ منتہی ہو وہی خالق اور خدا اور رب العالمین ہے۔" [1]

سید احمد خاں نے احادیث، کتب احادیث، اقسام احادیث اور قصص احادیث وتفاسیر جیسے عنوانات پر مضامین لکھے جن میں کچھ مسائل اٹھائے۔ انھوں نے اپنے مضمون "احادیث" میں یہ سوال کیا کہ حدیث بلفظ روایت کرنی لازم ہے یا بالمعنی؟ کچھ محدثین کے خیال میں روایت بالمعنی صحیح اور کچھ بلفظ روایت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ بعد تحقیق سید احمد اس نتیجے پر پہنچے کہ ابتدا ہی سے روایت بالمعنی بیان کرنے کا دستور رہا ہے اور یہی صحیح ہے، البتہ یہ خدشہ باقی رہتا ہے کہ کسی راوی نے کسی مخصوص حدیث کا مفہوم غلط سمجھا ہو۔ اس صورت میں پرکھ ان اصولوں کی روشنی میں کی جائے جو حدیث کی صحت وعدم صحت کے لئے وضع کئے گئے ہیں اس سلسلے میں انھوں نے امام سخاوی کی کتاب "فتح المغیث" سے استفادہ کرنا ضروری بتایا اور ضعیف حدیث کے اخراج کو بہتر کہا۔ ان کے خیال میں موجودہ دور میں بھی احادیث کی چھان بین کی ضرورت باقی ہے۔

اور احادیث کی طرح قرآن کریم کے متعلق بھی انھوں نے انقلابی خیالات کا اظہار کیا

"جس طرح انسانوں کی زبانوں میں استعارہ اور کنایہ اور مجاز اور حقیقت پایا جاتا ہے اسی طرح کلام اللہ میں بھی موجود ہے۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں غیر قوموں کے جو الفاظ شامل ہو گئے تھے وہ بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔ زمانہ نبوت میں جو طرز کلام عرب میں تھا اور جس طرح کہ وہ بات چیت کرتے تھے یا اپنے کلام کے استحکام

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۵ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء ص ۱۰۴

اور سچ ہونے پر زور دیتے تھے اور جس قدر الفاظ غیر قوموں کے ان کی زبان میں مل گئے تھے اسی طرز کلام پر قرآن مجید نازل ہوا۔"[1]

انھوں نے اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں قرآنی آیات کی تفسیر پیش کی۔ فرشتوں، جنات، جنت، دوزخ کو استعارہ و تمثیل قرار دیا۔ فرشتے اور شیاطین خیر و شر کی دو قوتیں جو انسان میں پوشیدہ ہیں "آدم کی سرگذشت" میں لکھا:

"تم نے قرآن شریف پڑھا ہے اس میں تو صاف لکھا ہے کہ خدا نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورتیں بنائیں ..... قرآن میں تو عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں جو اُس زمانے کے لوگوں کے خیال میں بھی نہ تھیں اب جس قدر حقایق موجودات کھلتے جاتے ہیں قرآن مجید کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے بے شک یہ خدا کا کلام ہے۔"[2]

ان کے خیال میں موجودہ زمانہ اندھی تقلید کا نہیں بلکہ

" ایک زمانہ یقین کا زمانہ کہلاتا ہے جو بات کہی جاتی ہے گو وہ کیسی ہی عجیب ہو اس پر سب کا یقین ہوتا ہے مگر حال کا زمانہ وہ زمانہ نہیں ہے بلکہ شک کا زمانہ ہے۔ کوئی بات ہو جب تک اس کے سچ ہونے کا یقین نہ آوے سچ نہیں مانی جاتی اور یہ ہی سبب ہے کہ انسانوں کے مذہب پر یا یوں کہو ان کے اعتقادات پر زمانے نے سب سے بُرا اثر ڈالا ہے۔"[3]

انھوں نے تفسیری مضامین مثلاً سورۂ فیل، سورۂ جن اور السموات کی تفاسیر لکھیں تفسیر السموات میں اسلام کی رو سے آسمان کی حقیقت بیان کی اور اس کے بارے میں یونانی فلسفے کے اثر سے مسلمانوں میں جو غلط فہمیاں رائج ہو گئی تھیں ان کا ازالہ کیا:

"سموات" جمع ہے سماء کی جس کے معنی اونچے کے ہیں۔ یہ لفظ عربی اور عبرانی زبان میں اس وقت سے رائج ہے جبکہ یونانی علم ہیئت کا وجود نہ تھا، قرآن مجید میں بھی اس لفظ کا اطلاق اسی محاورہ میں ہوا جو اس زمانے میں تھا۔ قرآن مجید کے نزول

---

[1] آخری مضامین۔ مرتبین امام الدین گجراتی اور مولوی احمد بابا مخدومی منزل نقشبندیہ منصور پریس بازار کشمیری لاہور ۱۹۲۲ء ص ۸

[2] تہذیب الاخلاق یکم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ بمقام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ ص ۴

[3] ؍؍ جلد ا نمبر ا۔ یکم شوال ۱۳۱۱ھ / ۷ اپریل ۱۸۹۴ء علی گڑھ مطبع انسٹی ٹیوٹ ص ۱۰۴

کے وقت یونانی مسئلے عربوں میں بہت مقبول تھے اور سچے تسلیم کئے جاتے تھے یہاں تک کہ قرآن کے بیانات کو بھی ان کے مطابق کیا جاتا تھا۔ آسمانوں کا مسئلہ بھی ایسا ہی تھا جس میں علمائے اسلام نے کچھ تھوڑی ترمیم کی تھی اس لئے تفسیروں اور مذہبی کتابوں میں آسمانوں کے وہی معنی قریب قریب مروج ہو گئے جو یونانی حکیموں نے بیان کئے تھے یعنی لفظ تو لیا قرآن کا اور اس کے معنی لئے یونانی حکیموں کے اور وہ معنی رفتہ رفتہ ذہن میں ایسے راسخ ہو گئے کہ ان کا انکار کرنا گویا قرآن کا انکار کرنا ہو گیا مگر ایسا سمجھنا بناء فاسد علی الفاسد ہے۔

اس لئے میں ان معنوں سے جو اکثر مفسرین سمجھتے ہیں انکار کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ جن جن چیزوں سے قرآن مجید میں سما یا سمٰوٰت کا اطلاق آیا ہے وہی معنی سمٰوٰت کے ہم قرار دیں گے نہ وہ معنی جو علماء اسلام نے یونانی حکیموں کی پیروی سے قرار دیئے ہیں۔"[1]

انھوں نے دیگر علمائے اسلام مثلاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے مضامین کے تراجم بھی تہذیب الاخلاق میں شایع کئے۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین فکر انگیز، زبان سادہ، سلیس، شستہ اور بیان مؤثر ہے اور سید احمد خاں بحیثیت ایک صحافی مشعل بردار رہنما ثابت ہوئے۔

---

[1] سید احمد خاں۔ مقالات سرسید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ص ۲۱۱-۲۱۲ سنہ ۱۹۶۳ء

اردو کی مقبولیت

سید احمد خاں دلّی والے تھے جہاں غالب، مومن، شاہ نصیر، ذوق اور آزردہ نے اردو کو نیا روپ اور آہنگ بخشا تھا اور یہ زبان دہلی کی تہذیبی زندگی کا اہم جز تھی انھوں نے اس کے متعلق لکھا کہ

"اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی اور عربی اور سنسکرت کے الفاظ مستعمل ہیں اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر و تبدیل کرلی ہے لیکن اس زمانے میں شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کی لغت بہت ملا دیتے ہیں اور یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اچھی نہیں ان سے اردو پن نہیں رہتا"۔[1]

ان کے انگلستان جانے سے پہلے جب اردو کو دفاتر سے بے دخل کر دینے اور ہندی کو عدالتی زبان قرار دینے کی مہم شروع ہوئی تو وہ اپنے ان ہی خیالات کا اظہار ایک خط مورخہ نومبر ۱۸۶۸ء بنام بابو سرودا پرشاد سنڈل الہ آباد میں کرتے ہیں:

"میرے نزدیک اضلاع شمال و مغرب اور صوبہ بہار کی عدالتوں میں وہی زبان ہونی چاہیئے جس کو آپ ہندی یعنی موجودہ مخلوط زبان کہتے ہیں لیکن میں اس کو اردو کہنا پسند کرتا ہوں آپ کا یہ فرمانا کہ اردو زبان میں فارسی کے بہت لفظ مخلوط ہیں بجا نہیں ہے۔ اس واسطے کہ فارسی کے لفظ اردو میں وہی لوگ ملا دیتے ہیں جو فارسی زیادہ جانتے ہیں اور جو لوگ فارسی نہیں جانتے وہ نہایت رواجی اور عام استعمال کے لفظوں میں بولتے ہیں"۔[2]

---

[1] سید احمد خاں۔ آثار الصنادید۔ چوتھا باب زبان کا بیان، مطبع سید الاخبار باہتمام سید عبدالغفور، دہلی ۱۸۴۷ء ص ۱۲

[2] سرسید کے خطوط مرتبہ وحید الدین سلیم۔ حالی پریس پانی پت۔ ص ۳۰-۳۲

دوران سفر انھیں جب لابطہ کی زبان اور اردو کی مقبولیت کا تجربہ ہوا تو اپنے تاثرات کو قلمبند کیا۔

"بندہ نے الہ آباد سے بمبئی تک کیا گاؤں میں اور کیا چوکیات میں اور کیا ریل پر اور کیا گورنمنٹ کے اہل کاروں اور ہر ایک محکمے کے چپراسیوں اور ہر جگہ کے قلیوں سے اردو میں گفتگو کی، سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے اور اردو میں ہی جواب دیتے ہیں۔"[1]

وہ کسی لسانی تعصب کے قایل نہ تھے۔ انھوں نے ایشیا کی مختلف زبانوں کی اعلیٰ کتابوں کو چھاپنے کا منصوبہ بنایا تھا جیسا کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے قوانین سے ظاہر ہوتا ہے اور مغربی علوم کی کتابوں کے اُردو ترجمے کی عملی کوشش کی۔

ان کی وسیع النظری کا یہ حال تھا کہ ایم۔ اے۔ او کالج میں ابتداء سے سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام تھا اور پہلا تقرر سنسکرت کے اُستاد کا کیا گیا۔

زبان کے معاملے میں سیدّ احمد خاں کے نظریات کو اکثر غلط سمجھا گیا اور اسی روشنی میں پیش کیا گیا۔ اردو کے خلاف جب تحریک اٹھی تو ان کا ردعمل کسی فرقہ وارانہ جذبہ یا کسی لسانی عصبیت کی بناء پر نہیں تھا بلکہ صحیح پس منظر میں مطالعہ کیا جائے تو وہ قومی اتحاد کے اعلیٰ مقاصد کے لئے اس زبان کا قیام ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے لکھا:

"ایک اور خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا کہ زبانِ اردو و خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سُنا ہے کہ اُنھوں نے سین ٹیفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو، ہندی ہو۔ ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ مسلمان علیحدہ ہو جائینگے۔"[2]

---

[1] سفرنامہ مسافرانِ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور ۱۹۶۱ء ص ۳۸

[2] خط سید احمد خاں بنام محسن الملک از لندن مورخہ ۲۹ اپریل ۱۸۷۰ء خطوط سرسید احمد مرتبہ سر راس مسعود نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء ص ۸۶

اس صورت حال کو انھوں نے خطرناک بتایا اور اس کے مضر اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

" خاص اپنی طبیعت کے سبب سے کہ میں کل ہند (کیا ہندو، کیا مسلمان) کی بھلائی چاہتا ہوں" [1]

ان کے خیال میں اردو صدیوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ دونوں نے مل کر اس کو موجودہ شکل تک پہنچایا ہے اگر اس کو ختم کیا گیا تو یہ تاریخ کو پیچھے کی طرف لوٹانے کے مترادف ہوگا اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک بڑا مظہر برباد ہو جائے گا اس بیش قیمت ورثہ کو محفوظ رکھنے ہی میں ہندوستان کی سالمیت ہے۔

خطوط

اردو خطوط نگاری کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ ابتدا میں فارسی مکتوبات کی طرح اس میں بھی حرف مطلب کے بجائے زبان اور انداز بیان کو اہمیت حاصل تھی۔ لمبے چوڑے القاب و آداب اور تکلفاتِ ادا ہی کو کمال سمجھا جاتا تھا۔ اردو مکاتیب کے اولین مجموعے "انشائے خرد افروز"، "مکتوباتِ احمدی و محمدی" اور "رقعات عنایت علی" ہیں۔

مرزا غالب نے ۱۸۵۰ء کے قریب فارسی کے پُر تکلف القاب و آداب ترک کر کے بے تکلف اور غیر رسمی اندازِ تحریر اپنایا اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ عرصۂ دراز تک غالب کی خطوط نویسی کی تقلید ہوتی رہی اور مکتوب نگاروں کی بڑی تعداد اُن کے طرز نگارش کی پیروی کرتی تھی۔

اردو مکتوب نگاری میں علی گڑھ تحریک سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اس نے اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح خط نویسی کا رنگ بھی بدل دیا اور تاریخ، سوانح، تحقیق زبان، تنقید و تبصرہ، ناول و افسانہ، طنز و مزاح اور صحافت نے بھی مراسلے کو فروغ دیا۔

اسلوبیاتی اعتبار سے اس دور کے مکتوبات کی نثر میں عبارت آرائی کے بجائے سادگی مقصدیت اور واقعیت ملتی ہے۔ سید احمد خاں نے خط مقصد اور ضرورت کے تحت لکھے

---

[1] خط سید احمد خاں بنام محسن الملک از لندن مورخہ ۲۹ اپریل ۱۸۷۰ء خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء ص ۸۹

اور اپنے مشن سے شدید ذہنی اور قلبی وابستگی نے ان کے خطوط کو دوسرے لکھنے والوں کے مقابلہ میں منفرد بنا دیا۔ ان کے خطوط کے مندرجہ ذیل مجموعے منظرِ عام پر آئے:

- رسالہ تحریر فی اصول التفسیر مطبع مفید عام آگرہ با ہتمام محمد قادر علی خاں صوفی ۱۸۹۲ء ابتداء میں سید احمد خاں نے رسالہ مذکور کا تعارف دیا ہے پھر محسن الملک کے تفسیر سے متعلق دو خط مورخہ ۹ر اگست اور ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۲ء شامل ہیں جن کے جواب میں سید احمد خاں نے اپنے اصولِ تفسیر بیان کئے ہیں آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے اور آپ سے مکاتبات ہوں صرف متعلق تفسیر اور وہ بطور رسالے کے جمع کئے جاویں اور اس کا نام "مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن رکھا جاوے۔"

مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن" مرتبہ محمد عثمان مقبول مطبع محمدی علی گڑھ یکم فروری ۱۹۱۵ء

اس میں سرسید اور محسن الملک کے اصول التفسیر اور علوم القرآن سے متعلق گیارہ خطوط شامل ہیں۔[1]

"سرسید کے خطوط" مرتبہ وحید الدین سلیم[2] پچپن خطوط کا مجموعہ، صفحات ۱۰۴، حالی پریس پانی پت سے شایع ہوا۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔ زمانی اعتبار سے یہ خطوط ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۱ء کو محیط ہیں۔ رسالہ معارف کے شماروں میں اپریل، مئی، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۱۰ء میں چھپے اور محسن الملک، زین العابدین، منشی نیاز محمد خاں، میر واحد علی، شیخ محمد عمر، نواب انتصار جنگ، سردار محمد حیات خاں۔ الطاف حسین حالی اور منشی سراج الدین کے نام ہیں۔

"خطوط سرسید" مرتبہ سرراس مسعود[3] یہ ۲۴۳ خطوط نظامی پریس بدایوں سے طبع ہوئے

---

[1] اس میں "اصول التفسیر" اور "الدعاء والاستجابہ" دونوں رسایل شامل ہیں

[2] وحید الدین سلیم (۱۸۵۹ء - ۱۹۲۸ء) سرسید کے ادبی معاون (لٹریری اسسٹنٹ) تھے

[3] سرراس مسعود (۱۸۸۹ء - ۱۹۳۷ء) سرسید کے پوتے اور جسٹس سید محمود کے اکلوتے فرزند تھے۔

اور اس کے دو۲ ایڈیشن منظر عام پر آئے۔

نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۴ء صفحات ۲۴۳

" " " ۱۹۳۱ء صفحات ۲۶۲

ان مجموعوں کے شروع میں سرسید کی تصویر ہے اور دیباچہ عبداللہ خاں وکیل کا تحریر کردہ ہے۔ مرتب نے مکتوب الیہم کا مختصر تعارف بھی دیا ہے۔

۔" انتخاب مکاتیب" مرتبہ شیخ عطاء اللہ[1] ناشر نصیر الدین ہمایوں، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۵۸ء میں چھپا۔ اس میں سرسید کے چالیس خطوں کو مختلف عنوانات کے تحت منقسم کر کے تفصیلی تعارف اور تبصرہ کیا گیا ہے مگر دو چار خطوں کے علاوہ کسی سے تاریخ تحریر اور مخاطب کا پتہ نہیں چلتا۔

مکتوبات سرسید" مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب، زرین آرٹ پریس ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۵۹ء میں طبع ہوئے یہ ۲۴۳ خطوط ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۸ء کے درمیان لکھے گئے جن میں چند فارسی میں بھی ہیں۔ مرتب نے ابتدا میں مختصر طور پر مکتوب الیہم کے ساتھ سرسید کے تعلقات، ان کی سوانح اور اہم اوصاف کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں "مکتوبات سرسید کے ماخذ" کے تحت ماخذات بھی درج کر دیئے ہیں۔

" مکاتیب سرسید احمد خاں مرتبہ مشتاق حسین[2] یونین پرنٹنگ پریس دہلی، اکتوبر ۱۹۶۰ء۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہیں۔ حصہ اول کے ۲۴۳ صفحات میں ایک سو اکتالیس مکاتیب اٹھارہ مکتوب الیہم کے نام ہیں جو سوائے اس مجموعے کے اور کہیں نہیں ملتے دوسرے حصے میں ۱۳۷ صفحات میں چونتیس ۳۴ خطوط بیس مکتوب الیہم کو لکھے گئے، جو مختلف اخبارات، رسائل اور کمیاب کتابوں سے جمع کئے گئے سوائے ایک غیر مطبوعہ خط

---

[1] شیخ عطاء اللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد تھے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے" اور اسلامیہ کالج جہلم میں پرنسپل ہو گئے انکے فرزند مختار مسعود مصنف" آواز دوست" ہیں۔

[2] مشتاق حسین علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین اور مشرقی سیکشن کے مہتم تھے۔

کے جو عبداللہ مہر علی کے نام ہے۔ مکتوب الیھم کا تعارف، خطوط کی نوعیت اور ماخذات بھی، مندرج ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور تعارف ڈاکٹر عابد حسین نے لکھا ہے۔

سید احمد خاں کے خطوط کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مبالغہ آرائی، مقفیٰ و مسجع انداز بیان کے بجائے وہ اثر آفرینی کو ضروری سمجھتے تھے۔

"یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرّہ کے رقعوں میں یہ سب خرابیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط اور رقعہ ایسا نہیں، جس میں جھوٹ اور وہ بات جو کہ درحقیقت دل میں نہیں مندرج نہ ہو پس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا۔"[1]

ان کے خطوں میں سادگی و سلاست، جامعیت اور اختصار ہے۔ القاب و آداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں بلکہ سادہ اور برمحل القاب کی وجہ سے ان کے یہاں یگانگت اور گرم جوشی کا احساس ہوتا ہے اور مخاطب سے ان کی وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے

بھائی سراج الدین۔ عزیزی عنایت اللہ خاں۔ شفیقِ من۔ مکرمی زینو۔

اور کبھی لمبے القاب سے بھی دوستوں کو یاد کرتے مثلاً

واہ واہ جناب محسن الملک واہ واہ!

قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش اصطلاح عشق بسیار است و من دیوانہ ام

قبلہ میرے مخدوم میرے محب میرے، محبوب میرے اب تو صاف لکھ دوں جو بھی ہو سو ہو، سلامت!

دراصل وہ حرفِ مدعا کی ترسیل کے لئے اندازِ بیان کا سہارا لئے بغیر اپنا منشا لکھ دیتے ہیں چنانچہ ان کی ترسیل واقعیت، صداقت اور سنجیدگی ہے۔ مراسلہ کو مکالمہ بنانے کا دعویٰ اور نرالا طرز تحریر ایجاد کرنے کے بجائے وہ خط کو خالص پیغام رسانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں

---

[1] مضامین تہذیب الاخلاق مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی جلد ۲۔ قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۲۴۷

اور ان کے خطوط پر وقار لب و لہجہ کے حامل ہیں لیکن ضمناً ان میں مزاح کے پہلو بھی نکل آتے ہیں یہ خطوط چونکہ قلم بر داشتہ اور ترسیل خیال کے لئے لکھے گئے اس لئے ان میں ہیں کہیں کہیں جملوں کی ترتیب اور قواعد سے بے پروائی کا احساس ہوتا ہے۔

عام طور سے اس صنف ادب کو مکتوب نگار کی شخصیت اور سوانح کا مستند ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے خیالات کے ارتقائی موڑ اور منازلِ ذہنی نشو ونما کے تدریجی مراحل اور زندگی کے دلچسپ پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ سید احمد خاں پر حادثاتِ زندگی اثر انداز ہوئے اور ان میں چھوٹی موٹی مخالفتوں اور اعتراضات کو برداشت کرنے اور درگذر کرنے کی قوت تھی مثلاً ایک خط سے ہم ان کی خوبیوں سے متعارف ہوتے ہیں کہ

"میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۸ جنوری پڑھا۔ بلاشبہ میں آپکی محبت کا جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے ممنون اور احسان مند ہوں اور آپکی اس تحریر کی نسبت جو اس پرچہ میں ہے بوجہ جوشِ محبت معذور سمجھا ہوں مگر جانے دو جس کا جو دل چاہے کہے ہمارا کیا بگڑتا ہے اگر ہمارے برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے خوش کر لینے دو۔ تم بھی اس بُرا کہنے سے خوش ہو کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔"[1]

انھیں اپنے زاویۂ نگاہ کی وضاحت میں دوسروں کی نکتہ چینی کا خوف اور مصلحت کا دھیان نہیں رہتا بلکہ مخاطب کو اپنا سمجھ کر وہ خیالات کا اظہار برجستہ کر دیتے اور قطعیت سے کرتے تھے:

"آپ جو رسالہ نسبت مرزا غلام احمد قادیانی کے لکھنا چاہتے ہیں کیا آپ کو بھی کچھ مالیخولیا ہو گیا ہے؟ اس لغو حرکت سے کچھ فایدہ نہیں اور مجھ کو ہرگز اس قدر فرصت نہیں کہ نسبت اس کے کچھ لکھوں۔"[2]

---

[1] خط بنام منشی سراج الدین ایڈیٹر سر مور گزٹ ناھن۔ مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۹ء ص ۵۸۰

[2] خط از لندن۔ بنام نامعلوم مورخہ ۸ ستمبر ۱۸۶۹ء مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۹ء ص ۶۸۹

اُن کے دل میں ساری زندگی قوم کی خدمت کا جذبہ موجزن رہا۔ وہ لندن کی طلسماتی فضاؤں میں بھی رہ کر اپنے ملک کو نہ بھلا سکے اُن کے رقعات سے قوم کا درد اور دُکھے دل کی کراہ سُنائی دیتی ہے بقول ڈاکٹر عبدالحق قوم کا دکھڑا اُن کے دل سے جُدا نہیں ہوتا اس کی حالت تپ کہنہ کی ہے جو ہڈیوں تک رچ بس گیا ہے۔

"افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں
ہائے افسوس امرت تھوکتے اور زہر اُگلتے ہیں اور مگر کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔
اے بھائی مہدی! فکر کرو اور یقین کرلو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے
اب ڈوبنے میں بہت کم فاصلہ باقی ہے"[۱]

یورپ کے قیام کے دوران وہاں کی زندگی اور ماحول کے بارے میں اپنے تاثرات سے احباب کو وقتاً فوقتاً مطلع کیا:

"صاف صاف بات یہ ہے کہ یوروپ دو آدمیوں کے کام کا ہے۔ اول اُن کے جو جواں نو عمر ہیں اور علوم و فنونِ جدیدہ کی تربیت چاہتے ہیں اور یوروپ کی زبان سے واقف ہیں۔

دوسرے ان لوگوں کے لئے جو صرف سیر کے خواہاں ہیں یا اپنے ملک اور اس کی ترقی میں کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ سیر کا تو مختصر حال یہ ہے کہ یہاں وہ چیزیں اور وہ کارخانے وہ صنائع اور وہ عمارات اور ایسی عجائبات ہیں کہ جن لوگوں نے اس کو نہیں دیکھا ہے ان کے سامنے بیان ہو سکیں اور سمجھ سکیں جس وقت انسان یورپ کی سرحد میں پہنچتا ہے حقیقت میں اس کو ایک نیا عالم معلوم ہوتا ہے"[۲]

سیّد احمد خاں کی شخصیت کے نمایاں اوصاف سادگی، معصومیت، خلوص، مستقل مزاجی اور محنت و ایثار اُن کے خطوط میں دیکھے جا سکتے ہیں اور ساتھ ہی

---

[۱] خط از لندن بنام محسن الملک مورخہ ۱۲ر فروری ۱۸۷۰ء مکتوب سرسید مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ستمبر ۱۹۵۹ء ص ۵۱

[۲] ایضاً " " " " ۱۵ ستمبر ۱۸۶۹ء " " " " " ص ۶۹۸

اُن کے احباب کی جھلک مل جاتی ہے اور اُن کے بے تکلف اندازِ تخاطب کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

"جس قدر آپ نے درحقیقت مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے درحقیقت وہ بہت کم ہے۔ اس غارت کن ایمان کو جیسا وہ ہے میں ہی جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے ...... وہ بچے ہیں انھوں نے دنیا نہیں دیکھی ہے۔ دوستی اور محبت کے معاملات اور برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ کسی رنڈی پر وہ عاشق نہیں ہوئے۔ ان کو مزہ محبت اور دوستی کا مطلق معلوم نہیں۔ سچ ہے کہ جس نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ ہی محبت کے لائق ہے"۔[۱]

ان کے مشن کے خد و خال اور علی گڑھ تحریک پر متعدد خطوط ہیں جن میں تعلیم کے علاوہ ان کی اہلِ اسلام کی عام حالت سے خصوصی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

"محڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اب کے سال الہ آباد میں ہوگا، ۲۸، ۲۹، اور ۳۰، دسمبر تواریخ اجلاس مقرر ہوئی ہیں پہلے اجلاس میں وہ امور تنقیح پاویں گے جو بحث کے لئے پیش ہونگے مگر تمام بحثیں تعلیمِ مسلمانان سے متعلق ہوں گی۔ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی غالباً اسبابِ تنزلِ مسلمانان پر لیکچر دیں گے ہمارے کالج کے ایک نہایت قابل اور عالم پروفیسر انگریز مسٹر آرنلڈ چین اور جاوہ میں اسلام کی ترقی اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت پر لیکچر دیں گے"۔[۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اُن کے مکاتیب پر صحیح اظہارِ خیال کیا کہ

"سرسید کی ادبی تحریک اور اُن کے شخصی رنگ خط نگاری نے بھی خاص حد تک اردو

---

[۱] خط از لندن بنام محسن الملک مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۸۶۹ء سرسید کے خطوط مرتبہ وحیدالدین سلیم حالی پریس پانی پت ص ۳

[۲] خط بنام نواب سید علی حسن از علی گڑھ مورخہ ۲۰ر نومبر ۱۸۹۰ء مکاتیب سرسید مرتبہ مشتاق حسین یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۵

خطوکتابت پر اثر ڈالا۔ سرسید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح خط نگاری میں بھی مقصدیت ہی کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین تہذیب الاخلاق میں خود اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے تھے اور عبارت آرائی، تکلف اور اطناب بے مقصد سے احتراز کرتے ہیں انکے خط ان کی عام نثر کے مقابلہ میں زیادہ شگفتہ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ سرسید نے اردو خطوط نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور تخاطب کے خلوص سے آشنا کیا۔"[1]

سید احمد خاں نے خاص مقصد اور کیفیات کے زیرِ اثر اپنی نثر میں عبارت آرائی، تشبیہ و استعارہ اور صنایع لفظی و معنوی کی گل کاری کی حالانکہ ایسے خطوں کی تعداد کم ہے۔ اس نثر کی شگفتگی اور اور اندازِ نگارش کا حسن اور ان پر مرتب ہونے والے تاثرات سے اس دور کی مخصوص روش کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

"تبدیل وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بہت بجا ہے بشرطیکہ میرا جادو تو بہ توبہ، میرا معجزہ نعوذ باللہ، میری کرامت لاحول ولا قوۃ الا اللہ، میری حماقت بھی تم پر اثر نہ کرے گی۔ ذرا صبر کرو۔ تین مہینے خیر سے گذر جاویں۔ جب الٰہ آباد اسٹیشن پر گلے لوگے اور چھاتی سے چھاتی لگے گی اس وقت پوچھیں گے کہ جانِ من (معاف کیجئے بے خودی یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔"[2]

انھوں نے غالب کی طرح بے ساختہ، براہِ راست اور بے تکلف خط نویسی کو مروج کیا۔ ان کے معاصرین نے بھی یہی انداز اپنایا۔ اس سلسلے میں محسن الملک، وقار الملک، نذیر احمد، حالی اور شبلی اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد اور اکبر الٰہ آبادی پر بھی ان کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ سید احمد خاں نے جس منفرد طرز کی مکتوب نگاری کی اس کی تقلید آج تک ہو رہی ہے۔ بعد کے مقلدین میں احسن مارہروی اور ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ، میرامن سے عبدالحق تک۔ چمن بک ڈپو اردو بازار دہلی۔ ص ۱۹۵

[2] خط از لندن بنام محسن الملک مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۰ء خطوط سرسید، مرتبہ سر راس مسعود نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء ص ۴۴

تقاریر

تقریر یا خطابت کی ابتداء وقت، حالات، اور ضرورت کے تحت ہوئی۔ یہ ایک معروف فن ہے جس کی مدد سے مقرر اپنا مقصد اور منشاء واضح کرتا ہے۔ کسی عمل کی جانب ترغیب، اچھے کام کی تلقین اور بُرے سے اجتناب کا مشورہ دیتا ہے۔

ہندوستان میں مختلف ادوار بالخصوص انیسویں صدی کے وسط میں جو مشہور مقرر ہوئے ان میں اکثر متفرق تحریکوں کے بانی اور روح رواں تھے۔ مثلاً راجہ رام موہن رائے کیشب چندر سین دادا بھائی نوروجی اور سر سُریندر ناتھ بنرجی کے نام خصوصیت سے لیے جا سکتے ہیں۔

سید احمد خاں کی ذات مجموعۂ صفات تھی۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ مقرر کی ظاہری شکل و صورت، لب و لہجہ اور آواز کا فطری اندازِ تخاطب اس کی کامیابی کا غمّاز ہوتا ہے۔ سید احمد خاں کی موثر تقاریر کا راز ان کی بارعب و بردبار شخصیت اور مقصد سے وابستگی میں مضمر تھا۔ وہ فطری باتوں پر زیادہ زور دیتے اور انھیں موزوں الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔

عقل عامہ رکھنے کی وجہ سے وہ عین موقع پر سامعین کے احساسات اور نفسیات کو سمجھ لیتے۔ ان کی معلومات عامہ اُن کے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ تھی۔ وہ مشکلات اور مصائب کا ذکر اس طرح کرتے کہ مجمع متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ خود بھی زود حس تھے۔ قوم کی بدحالی انھیں آب دیدہ کر دیتی۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا، آواز میں گہرا درد اور لہجہ میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا تھا۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے لکھا ہے کہ تقریر کرتے وقت وہ خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رُلاتے تھے۔

وہ تقریر چاہے کسی موضوع پر کریں کوئی نہ کوئی نیا نکتہ ضرور نکال لیتے تھے۔ برمحل واقعات اور اقوال کے بیان کرنے سے نہ صرف سید احمد خاں کے حافظہ بلکہ قوتِ متخیلہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ان کی زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ اختصار بھی تھا۔ پیچیدہ اور طویل جملوں کے بجائے ان کی تقریر میں استدلال اور سادگی ہوتی تھی۔

فی البدیہہ تقاریر کو "ارتجالی خطبات" سے موسوم کیا جاتا ہے جن کا تعلق براہِ راست موضوع کے علاوہ اسلوب بیان سے بھی ہوتا ہے۔

سید احمد خاں عموماً فی البدیہہ تقریر کیا کرتے تھے۔ انھیں حسب ضرورت اور برجستہ تقاریر کا ملکہ حاصل تھا جو موضوع، مقام اور کیفیت کے اعتبار سے مختلف النوع ہوتیں اور مسودے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی تو ضایع ہو گئیں۔ اس وقت تک فن مختصر نویسی رواج نہ پاسکا تھا اس لئے تمام تر تقریر نوٹ کرنی مشکل تھی۔ البتہ کوئی نہ کوئی ان کی تقریر کو تیزی سے لکھنے کی کوشش کرتا اور پھر طباعت کے لئے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سید احمد خاں کی تقاریر "سفرنامہ پنجاب"، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد وں، حیاتِ جاوید اور تذکرہ سرسید میں ملتی ہیں۔ ان کے لیکچرز کے چار مجموعے چھپے جن میں سے دو ان کی حیات میں ہی شایع ہو گئے تھے۔

سرسید کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین ایڈیٹر سرمور گزٹ ن، ہن، منصور پریس لاہور سے ۶ دسمبر ۱۸۹۰ء کو ۳۰۲ صفحات پر مشتمل شایع ہوا۔ جس میں سید احمد خاں کی تینتالیس تقریریں ملتی ہیں۔

"لیکچروں کا مجموعہ" مرتبہ منشی سراج الدین باہتمام منشی فضل الدین تاجر کتب قومی نے لاہور ۱۸۹۳ء سے طبع کیا جس میں پہلے کے مقابلے میں چند لیکچرز کا اضافہ ہے۔

"مکمل مجموعہ لیکچرز اور اسپیچز" ۱۸۶۳ء سے ۱۸۹۸ء کے چالیس تک کی تقاریر۔ مرتبہ محمد امام الدین گجراتی، مطبع نول کشور پرنٹنگ ورکس لاہور سے ۴۹۶ صفحات میں فروری ۱۹۰۰ء میں چھپا۔

"خطبات سرسید" مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور سے دسمبر ۱۹۷۲ء، صفحات ۶۰۸ شایع ہوا۔ جس میں اٹھاون لیکچرز شامل ہیں۔ شروع میں شیخ اسماعیل کا تحریر کردہ جامع اور مبسوط مقدمہ ہے اور ہر تقریر کی ابتدا میں اس کے موضوع اور اندراجات کی مختصراً وضاحت کر دی گئی تقاریر کی ترتیب زمانی اعتبار سے کی گئی ہے۔

سید احمد خاں کی تقریروں کے موضوعات مختلف ہیں۔ بیشتر میں انگریزی تعلیم کی

ضرورت وافادیت اور متفرق علوم وفنون کی جانب توجہ نیز موجودہ نصاب میں تبدیلی کی سفارش ہے اور مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی :

" درحقیقت ہندوستان میں اب تک ہائی ایجوکیشن کا وجود ہی نہیں ہے ۔ ہماری یونیورسٹیوں میں ہم کو اب تک صرف ہائی ایجوکیشن کے دروازے تک پہنچا دیا ہے مگر اس کے اندر جانے کا رستہ بند کر رکھا ہے ۔ انسان کی تعلیم کی عمدہ حالت ہونے کو یہ بات لازم ہے کہ وہ ہر فن میں کچھ نہ کچھ جانتا ہو اور ایک میں کامل ہو مگر ہندوستان کے کالجوں اور ہماری یونیورسٹیاں ہم کو کچھ کچھ سکھلاتی ہیں اور کسی ایک میں کامل نہیں کرتیں ۔

گورنمنٹ اپنے فرض سے ہرگز بری نہیں ہو سکتی جب تک وہ تعلیم کا کوئی ایسا طریقہ نہ قایم کرے جس سے ہندوستانی نوجوان بیس برس کی عمر میں اور بہ موجب قواعد حال کے انیس برس کی عمر میں اس قدر قابلیت حاصل کرلیں کہ وہ انگلستان میں جاکر سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں اپنے ہم پیشہ انگریزوں کا ساتھ دیں "۔[1]

سید احمد خاں کی تحریک اور اس کے پس منظر میں کچھ نئے اور اہم پہلوؤں کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ابتدا سے ارتقائی مراحل کا حرف بحرف حال ان کی تقریروں کی روشنی میں سامنے آتا ہے اور ان کی تعلیمی تحریک کے جملہ ادوار کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے مثلاً انھوں نے وکٹوریہ اسکول غازی پور کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں رکھی ۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے چندے کے لئے عظیم آباد (پٹنہ) سہارنپور، میرٹھ، گورکھپور اور پنجاب کے اضلاع کا دورہ کیا ۔ انجمن حمایت اسلام لاہور میں مدرسہ کے تعلیمی حالات اور جدید واقعات پر تقریریں کیں ۔ ان کی تقاریر میں جہاں تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے قابلِ توجہ

---

[1] خطبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۵۸۱ تا ۵۸۲

نکات ملتے ہیں وہیں ان کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ ان سے سیاسی حالات، معاشرتی احوال ملک و قوم کی اقتصادی حالت، قانون اور حکومتِ وقت کی پالیسیاں اور مختلف جشن و جلوس کی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر قانون کے متعلق بھی اظہار خیال کیا مثلاً قانونِ حقوق استفادہ مسودۂ قانون ترمیم فوجداری، متولیانِ اوقاف وغیرہ کے بارے میں اور اس کے علاوہ ٹیکہ لگانے اور ہومیو پیتھی کے علاج پر بھی تقریریں کیں۔ انھوں نے اتحاد باہمی پر زور دیا کہ

"ہم کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیئے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں۔۔۔۔ اسی ملک کی ہوا سے، اسی ملک کے پانی سے، اسی ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے۔۔۔۔۔ ہمسائے کا ادب ہمارے مذہب کا جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔"[1]

اور مولانا حالی نے اس وصف کے متعلق لکھا:

"۔۔۔۔ مگر ۲۹ دسمبر کو جو لکچر کہ سید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں دیا جہاں کئی ہزار کا مجمع تھا اس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہیگا۔۔۔ سامعین پر ایک سکتہ کا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین برس میں اہل پنجاب پر کیا تھا اس لکچر نے دو تین گھنٹے میں اس کو دو چند کر دیا۔"[2]

سید احمد خاں کی تقاریر سے بہت سی جید ہستیاں متاثر ہوئیں اور اس فن میں اُن سے براہ راست یا بالواسطہ فیض حاصل کیا ان میں ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، محمد حسین آزاد پھر انکے بعد مولانا محمد علی، شوکت علی سید حید رحیدری، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی شبیر احمد عثمانی، سید سلیمان ندوی، وزیر حسن، ابوالکلام آزاد، اور ذاکر حسین وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں اور سرسید کی سادہ و مدلل انداز میں تقریر کرنے سے مستفید ہونے اور روشنی حاصل کرنے والوں کی اب بھی کمی نہیں ہے۔

---

[1] تقریر سر سید جلسہ عظیم آباد (پٹنہ) ۱۸۷۳ء تہذیب الاخلاق ۱۸۷۳ء ص ۵۳

[2] مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء ص ۲۸

سفر نامے

اردو میں سفرنامے کا آغاز انیسویں صدی کے نصفِ اول میں ہوا۔ یوسف خاں کمبل پوش کے پہلے سفرنامے "عجائباتِ فرنگ" (۱۸۴۷ء) کے بعد دوسرا اہم سفرنامہ مسیح الدین علوی کا "سفیرِ اودھ" ہے۔ اس سلسلے کی تیسری کڑی سید احمد خاں کا "مسافرانِ لندن" (۱۸۷۰ء) ہے ان کے دوسرے سفرنامے کو سید اقبال علی نے ۱۸۸۴ء میں مرتب کیا اور اس کا نام "سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب" رکھا۔

سفر نامہ مسافرانِ لندن

"مسافرانِ لندن" کو سید احمد خاں کے خطوط سے ترتیب دیا گیا جو انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کے سیکرٹری راجہ جیکشن داس اور محسن الملک کو بھیجے تھے۔ آخرالذکر کو لکھے گئے خطوط نجی نوعیت کے ہیں البتہ جیکشن داس کو انھوں نے سفر کا مفصل حال انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ہی شایع کیے جانے کی غرض سے لکھا تھا تاکہ ان کے مشاہدات سے اہلِ وطن بھی واقف ہو سکیں۔ ان کے خطوط "مسافرانِ لندن" کے عنوان سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بالالتزام شایع ہوتے رہے اسکی پہلی قسط گزٹ (ساتویں جلد، شمارہ ۱۸) مورخہ ۳۰ اپریل ۱۸۶۹ء میں چھپی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب سید احمد خاں نے اپنے تاثرات بھیجنا بند کر دیے کیونکہ ایک خط میں انھوں نے "کیفیتِ طعام" کے سلسلے میں لکھا کہ مسلمانوں کو اہلِ کتاب کے ذبیحے کھانے کی دینی اعتبار سے اجازت ہے جسے ان کی دین سے گمراہی پر محمول کیا گیا اور مدیر کو اعتراضات کے جواب میں لکھنا پڑا کہ "ایڈیٹر کا مضمون نگار کے خیالات و نظریات سے متفق ہونا ضروری نہیں" چنانچہ اس کے ردعمل میں انھوں نے لکھنے سے گریز کیا مگر راجہ جیکشن داس کے اصرار پر ۹ ستمبر ۱۸۶۹ء کو ایک طویل خط میں چھ ماہ کے حالاتِ سفر بیان کیے اور یہ بھی کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے مفاد کے پیشِ نظر انھوں نے خط لکھنا بند کر دیا تھا[۱]۔

اب ان کے خطوط میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ان کی بے تکلف اور آزادانہ رائے

---

[۱] سفرنامہ مسافرانِ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۱ء ص ۱۴

اہلِ وطن کی برہمی کا باعث ہوئیں۔ اسی لیے حالات و مصلحت کے تحت انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی دکھتی رگوں کو چھیڑنے کی اور اخلاقی گراوٹ پر کڑی تنقید کرنے کے بجائے معذرت خواہانہ لب و لہجہ اختیار کیا" عذر از طرف گنہگار سید احمد" اور " عرضداشت بخدمت اہل وطن " جیسے مضامین اس بات کا ثبوت ہیں۔

وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں ضرور مرتب کرنا چاہتے تھے اس کے بارے میں محسن الملک کو لکھا:

"میں چاہتا ہوں کہ حالاتِ سفر جو اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپتے ہیں آپ اس کو بطور کتاب یکجا نقل کرواتے جائیں اور جس امر کی نسبت زیادہ تفصیل کی حاجت ہو مجھ کو لکھ کر دریافت فرمالیں اور اس میں کوئی اضافہ کردیں تاکہ آپ کی اصلاح سے کتاب بھی درست ہو جائے اور سب چیز کو حاوی بھی ہو اور میرے آنے تک کتاب مرتب تیار رہو گی اور صرف چھپنا شروع ہوگا۔ میں بعض بعض عمدہ مکانات کے نقشے بھی لاؤں گا اور وہ بھی کتاب میں چھپوائے جائیں گے"۔[1]

ان کی مصروفیات کی بناء پر یہ سفرنامہ ادھورا رہ گیا اور خواہش کے مطابق مکمل نہ ہو سکا۔ انھوں نے ۱۱ مارچ ۱۸۷۰ء سے حالات سفر بھی لکھنا بند کر دیئے تھے یہ حصہ مسافرانِ لندن یعنی سفرنامہ سید احمد خاں بابت سفر لندن۔ تہذیب الاخلاق ۱۲۹۵ھ ۱۸۸۰ء صفحات ۱۵۵ تا ۲۴۳ میں شائع ہوا جس میں بنارس سے روانگی سے لے کر انگلستان میں ولیم ملز کے مکان کے حالات تک ہیں آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ

"اس بات کے خیال سے کہ ہمارے ملک کے متمول اور دولتمند لوگ کیسی بری طرح اور بداخلاقی اور خراب عادتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور یہاں کے لوگ کیسی خوبی سے اپنی زندگی کو صرف کرتے ہیں دل جل کر کباب ہو گیا۔ اب میں زیادہ اور کچھ نہیں لکھ سکتا کیونکہ مجھ کو کانپور کی مہیب آواز کا بڑا اندیشہ ہے اور مجھ کو اپنے ملک کے نہایت لائق اور عالی طبیعت اور تربیت یافتہ و شائستہ لوگوں کا جو اپنا کسی

---

[1] سفرنامہ مسافرانِ لندن : مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء ص ۲۲

کو نہیں سمجھنے پر ایمان جانے کا اندیشہ ہے"۔[1]

شیخ اسماعیل پانی پتی نے جولائی ۱۹۶۱ء میں سید احمد خاں کے تمام سفرنامہ کو از سرِ نو ترتیب دیا۔ دورانِ سفر ان کے مشاہدات و تجربات پر مبنی تحریروں کو تندہی سے اکٹھا کیا اور اصل میں چھ ضمیموں کا اضافہ کیا جس سے بڑی حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ پہلا ضمیمہ سیکریٹری سائنٹفک سوسائٹی کے نام ایک طویل خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء پر مشتمل ہے[2]

دوسرا حیاتِ جاوید سے ماخوذ ہے۔

تیسرا ضمیمہ محسن الملک کو لندن سے لکھے گئے خطوط پر مبنی ہے۔

چوتھے میں "ابتہنیم کلب کا حال" کے عنوان سے سرسید کا وہ مضمون شامل ہے جو تہذیب الاخلاق رجب ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں طبع ہوا تھا۔

پانچواں ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کی تقریب پر سرسید کی تقریر سے اخذ ہے۔ اس میں شہر لندن کا تاریخی پس منظر بھی بیان کیا گیا۔

چھٹے اور آخری ضمیمے میں گارسین ڈتاسی کے خط کی نقل ہے جو پیرس سے ۷ ار جولائی ۱۸۶۹ء کو سید احمد خاں کے نام لندن بھیجا گیا تھا۔

سفرنامہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء سے شروع ہوتا ہے جب بروز جمعرات سید احمد خاں سمیت پانچ لوگوں پر مشتمل یہ چھوٹا سا قافلہ بنارس سے لندن کے لئے روانہ ہوا جس میں اُن کے دونوں بیٹے سید حامد، سید محمود، مرزا خداداد بیگ[3] اور ان کا پُرانا ملازم چھجو شامل تھے۔

سفرِ انگلستان کا بنیادی محرک سیر و سیاحت کا شوق نہ تھا بلکہ ان کے سامنے چند مقاصد تھے اور لندن جانے سے یہ مسائل حل بھی ہو گئے جو قومی اور ملی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

---

[1] تہذیب الاخلاق ماہ شوال لغایت ماہ رمضان مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء ص ۲۴۲

[2] انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۶، شمارہ ۶۸، ۲۶ نومبر ۱۸۶۹ء ص ۲۲۶

[3] سید محمود کی طرح مرزا خداداد بیگ کو بھی انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری وظیفہ ملا تھا۔

سید احمد خاں عرصہ سے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لئے ایک معیاری تعلیمی ادارہ کے قیام کی فکر میں تھے مگر اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے سے پہلے وہ خود انگلستان کے نظامِ تعلیم اور وہاں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نصابات سے واقفیت ضروری سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنا بھی ان کے پیشِ نظر تھا جس کے لیے مطلوبہ کتابیں اور ماخذات صرف لندن کے کتب خانوں سے دستیاب ہوسکتے تھے۔ انگلستان کا یہ سفر ان کی اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں کی ایک اہم کڑی ثابت ہوا۔

قوم کے ہمدرد تو اور بھی تھے لیکن سید احمد خاں ایک دردمند دل کے ساتھ بیدار مغز بھی رکھتے تھے۔ تلاش و جستجو کا میلان ہونے کی وجہ سے انھوں نے سفر کے دوران ہر کارآمد چیز پر غور کیا۔ مثلاً بمبئی کے پارسیوں اور میمن لوگوں کا مقابلہ کیا تو پارسیوں کو زیادہ روشن خیال اور شستہ پایا اور وہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ

"یہ قومی ترقی ان کے لباس کی عمدگی، رہن سہن، معاشی استحکام، شائستگی اور تعلیم تمام سطحوں پر نظر آتی ہے۔ ان کی ترقی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے لیے مدارس قائم کر رکھے ہیں۔"[1]

ان کے تجربات دیگر سفرنویسوں سے منفرد ہیں کہ وہ واقعات کی حقیقی تصویر کے ساتھ اپنے تاثرات بھی پیش کرتے ہیں اور لمحاتی نشاط کی جگہ آگہی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں جو ان کے ذوقِ اعلیٰ اور تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے ابدی مسرت کا باعث ہے۔ چنانچہ بڑودہ جہاز سے لے کر لندن کے ایتھنیم کلب تک کے حالات سے ان کی قوت مشاہدہ اور تجرباتی طریقہ کار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ سفر کے دوران انھیں انسانی عقل کے حیرت انگیز کارناموں اور ایجادات کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جہاز کی تفصیل میں لکھا:

"بڑودہ اسٹیمر نہایت عمدہ جہاز ہے۔ لندن میں بنا ہے ۱۸۶۳ء میں بننا شروع ہوا تھا ۱۸۶۴ء میں تیار ہو کر سمندر میں ڈالا گیا۔ تین سو نوفٹ لمبا اڑتیس فٹ چوڑا اور

---

[1] سفرنامہ مسافران لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۱ء ص ۵۰۔۵۱

اور چھتیس ۳۶ فٹ گہرا ہے۔ باون ہزار چار سو چالیس من بوجھ اٹھاتا ہے۔ بیچوں بیچ چار سو گھوڑوں کے زور کا انجن لگا ہوا ہے۔"[1]

پھر سمندر میں اس کی رفتار، سمت کے تعین، رات میں دور سے گذرتے ہوئے جہازوں کے مابین پیغام رسانی اور گھنٹہ کی آواز، طول البلد اور عرض البلد معلوم کرنے کا طریقہ، جہاز پر مختلف کھیلوں سمندری جانوروں اور پانی کے دلفریب نظاروں کا تفصیل سے ذکر کیا۔

جہاز میں ان کی ملاقات جے بی لارنس اور میجر ڈاڈ سے ہوئی جو بظاہر مہذب اور شائستہ معلوم ہوئے مگر مذہبی اعتبار سے شدت پسند تھے۔ لارنس مدراس میں آرامنی کا افسر ہونے کی وجہ سے جنوبی ہندوستان سے واقف تھا اس نے سوال کیا:

"میں مشنری نہیں ہوں۔ میرا کام توپ مارنے کا ہے میں نے مدراس کے علاقہ میں جن لوگوں سے پوچھا تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں تین مذہب سچے ہیں، ہندو، عیسائی، مسلمان، کیا یہ بات تمہارے نزدیک بھی سچ ہے؟"[2]

سید احمد خاں نے بات سُنی ان سنی کر دی کہ اس چھیڑ خانی سے عصبیت کی بو آتی تھی البتہ میجر ڈاڈ (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، ناگپور) کی بے تعصبی کی تعریف لکھی کہ اس کے نزدیک مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ تھا۔

جہاز کے عرشہ پر جب انگریز عبادت کرتے تو سید احمد خاں خاموش اور مودب کھڑے ہو جاتے۔ ایک بے تکلف انگریز ملاقاتی نے دریافت کیا کہ جب خدا ایک ہے تو آپ ہماری عبادت میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ جواب دیا: "یہی تو ہاں نہ تھا"[3] ان کا اشارہ عقیدۂ تثلیث کی طرف تھا۔ انھوں نے وہ واقعہ بھی رقم کیا کہ جب بحر قلزم سے گذرتے وقت رات کو تیز ہوائیں چلنے لگیں، کھڑکیوں سے پانی اندر آنے لگا۔ پورے جہاز میں افراتفری مچ گئی۔

---

[1] سفرنامہ مسافران لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۱ء ص ۵۳

[2] ایضاً ص ۶۴

[3] ایضاً ص ۷۸

جہاز کا عملہ پوری طرح چوکس ہوگیا۔ ساری رات خوف و پریشانی میں گذری صبح تک ہوا کا زور کم ہوا مگر پانی میں تلاطم باقی تھا۔ سید احمد خاں کو جہاز رانی کے اصول وضوابط اور ضروری ہدایات پر فراہم کردہ کتاب کو پڑھنے کا موقع ملا جو آسان روزمرہ زبان میں تھی کہ ہر چھوٹا بڑا اور سارا عملہ ضرورت کے وقت اس سے استفادہ کرسکتا تھا۔

"تمام علوم وفنون اس زبان میں ہیں جو سب بولتے ہیں اگر آج انگریزی زبان میں تمام علوم وفنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن میں، گریک میں یا فارسی عربی میں ہوتے تو آج تک تمام انگریز ایسے ہی جاہل اور بے علم اور لاکھوں ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آیندہ کو بھی جب تک تمام علوم وفنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی۔"[1]

"بڑودہ" جہاز ۲۳ اپریل کو نہر سوئز کے قریب رُکا اور اس سے سید احمد خاں کا سفر ختم ہوا اور ۲۴ اپریل کو مسافر شہر اسکندریہ سے مارسیلز کے لئے "پونا" پر روانہ ہوئے جو نسبتًا بڑا اور مضبوط تھا اور اس کا عملہ یورپین تھا۔ "پونا" میں سید احمد خاں کی ملاقات نئے ہم سفروں سے ہوئی جن میں ٹی ڈی فیرپیٹرک سابق کمشنر دہلی، نہر سوئز کے فرانسیسی معمار انجینئر ڈی لیپس، کپتان میتھوس، جنرل ٹیپ، جنرل ہگیٹن، مسٹر ووزینی، ٹیلیٹ، مانڈرس اور مسٹر کوپر ڈپٹی کمشنر دہلی بھی تھے اور مسماۃ لفینّا اکیسویں بار یورپ کا سفر کررہی تھی جو بطور آیا انگریز بچوں کو ٹھیکے پر ولایت پہنچاتی تھی اور انگریزی فراٹے سے بولتی تھی اس سے مل کر سیّد احمد خاں متاثر ہوئے کہ یہ بلند ہمت عورت محنت مشقت کرنے میں کسی طرح مردوں سے کم نہ تھی۔

۲ مئی کو پیرس پہنچے شہر، بازار، شاہی محلات، کلیسا، پارک اور وہاں کی تہذیبی اور تمدنی ترقی کو دیکھ کر فرانسیسیوں کے مثبت اقدار، اخلاق، شجاعت

---

[1] سفرنامہ مسافران لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۱ء ص ۱۰

اور وطن پرستی کا ذکر کیا۔ پھر "لور" (شاہی محل کی آرٹ گیلری) کے ایک سو تیس شاہکاروں میں وہ تصویر بھی دیکھی جس میں نپولین کو عبدالقادر کی والدہ سے معانقہ کرتے اور امام عبدالقادر کو قید سے رہا ہوتے دکھایا گیا تھا[1] بقول ان کے یہ تصاویر فرانسیسی قوم کے ذوقِ مصوری کی غماز تھیں۔ تعجب ہے انھوں نے گارسین دتاسی سے پیرس میں ملاقات نہ کی۔ شاید تھکن اور وقت کی تنگی مانع رہی۔ پھر ۴ مئی ۱۸۶۹ء کو لندن آئے جہاں تین چار دن سید احمد خاں نے "ہوٹل چیرنگ کراس" میں گزارے بعد ازاں گھر میں منتقل ہو گئے۔

انھوں نے کرایہ پر ایک مکان میکلن برگ اسکوائر وسط لندن میں لے لیا اور ہندوستان واپس آنے تک وہیں رہے۔ ان کے مالک مکان مسٹر جے لڈلم ایک عالم اور خلیق شخص تھے وہ ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے ان کی تعلیم یافتہ بیوی مسز لڈلم اور گھر کی دونوں خادمائیں بھی مہذب اور فرض شناس تھیں۔ ان میں سے ایک نوعمر اور غریب لڑکی اوپر کے کام پر مامور تھی جو قلیل تنخواہ پانے کے باوجود "ایکو" اخبار خرید کر پڑھتی اور خوش خط و مضمون نگار بھی تھی۔ اس کے متعلق سر سید احمد خاں نے لکھا:

> "آپ یقین جانئے اگر یہ عورت (این اسمتھ) جو نہایت غریب اور نوکری کی محتاج ہے اور دن و رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہے اگر ہندوستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے۔ یہ نتیجہ صرف عام تعلیم و تربیت کا ہے۔"[2]

اور بقول انکے لکھنے پڑھنے کا شوق صرف امیروں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ کوچوان (کیب مین) بھی اپنی گدی کے نیچے کوئی نہ کوئی کتاب یا اخبار دبائے رکھتا اور خالی وقت میں بجائے گپ لڑانے کے پڑھا کرتا تھا۔

---

[1] عبدالقادر ۱۸۰۸ء میں الجزائر میں پیدا ہوئے ان کی وفات دمشق میں ۱۸۸۳ء میں ہوئی۔ انھوں نے ۱۸۳۲ء تا ۱۸۴۷ء فرانسیسیوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔

[2] سفرنامہ مسافران لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء ص ۱۹۶

انھیں مرد اور عورت دونوں میں تعلیمی اور علمی رجحان نظر آیا اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ لکھا کہ ان کی مالکہ مکان کی چھوٹی بہن مس ایلن ویسٹ بیمار ہوگئی اور کمزوری کے باعث چلنے پھرنے سے معذور تھی اس نے سید احمد خاں سے تازہ خریدی ہوئی کتابیں پڑھنے کے لئے منگائیں۔ انھوں نے کہلوایا کہ مذہبی کتابیں تمہاری دلچسپی کا باعث نہ ہوں گی لیکن فرمائش سے منگا کر پڑھا اور ملاقات ہونے پر اس نے جس انہماک سے مذہب پر گفتگو کی تو اس کے وسعتِ مطالعہ اور علمی ذوق پر حیرت ہوئی۔

"بلا مبالغہ یہ ایک مثال ہے۔ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور جملہ تربیت اور زیورِ تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو بڑا ہی تعجب ہوتا ہے۔" [1]

اس سفرنامہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں کے حق میں تھے اور ان کی تربیت کے بھی خواہاں تھے۔ سفر کے دورانِ انھوں نے بارہا اس مسئلہ پر غور کیا اور ایک مصری لڑکی کا ذکر بھی اسی سلسلے میں کیا کہ

"روم اور مصر دونوں میں روز بروز تعلیم کی ترقی ہے۔ عورتیں بھی بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی جاتی ہیں۔ مصر کی ایک مسلمان لڑکی کا میں نے حال سنا کہ عربی زبان کہ جو اس کی اصلی زبان ہے اور جس میں وہ نہایت فصاحت سے لکھتی پڑھتی ہے۔ فرنچ زبان میں بھی نہایت خوب بولتی ہے اور لیٹن اس قدر جانتی ہے کہ جو مضمون یا شعر اس کے سامنے رکھا جائے اس کو پڑھ لیتی ہے اور مضمون سمجھ لیتی ہے۔" [2]

انھوں نے سیر کے دوران کلفٹن کا لٹکوان پل اور وہاں کی رصدگاہ دیکھی جس کی مہتمم ایک انگریز خاتون تھی جو ایسی مستعدی سے رصدگاہ کے آلات دکھاتی اور استعمال کے طریقے بتاتی تھی کہ ذہن نشین ہوجاتے تھے اس کی صلاحیت کے بارے میں لکھا۔

---

[1] سفرنامہ مسافرانِ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء ص ۱۸۹

[2] ایضاً ص ۱۷۶ - ۱۷۷

"ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنے ملک کے کسی بڑے قبلہ وکعبہ سے اور جناب مولوی صاحب سے اس کا سبب پوچھیں گے تو ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکلے گا۔
مجھ کو تو اپنی سفید داڑھی پر اس عورت کے سامنے شرم آتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے ہم وطنوں کو شرم بھی نہیں آتی اور جب سچی بات انھیں لکھی جاتی ہے تو الٹا برا کہنے اور الزام دینے کو موجود ہیں اور عجیب عجیب آوازیں سناتے ہیں۔" [1]

سید احمد خاں نے لندن میں کارخانے، میوزیم، عمارات، سیرگاہیں اور تعلیمی ادارے دیکھے وہ صرف سرسری نظر ڈال کر ہی نہ رہ جاتے بلکہ کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کرتے مثلاً سر ولیم ملز کا مکان ان کے لئے ایک عبرت گاہ بن گیا :

"ایک وسیع کمرہ میں کتب خانہ آراستہ تھا اور ہر قسم کی کتابیں زرنگار جلدوں کی نفیس نفیس الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں ..... دل بہلانے کے لئے ایک کمرہ میں عمدہ عمدہ قسم کے باجے بھی تھے اور دوسرے میں تمام ریاضت بدنی کے لئے ہر قسم کے سپاہیانہ ہنر کا اکھاڑہ موجود تھا اور ان کے کمروں میں نہایت عمدہ اور بڑی بڑی تصویریں نامی آدمیوں اور مشہور واقعات کی زرین چوکھٹوں میں لگی ہوئی تھیں جو تاریخانہ (تاریخی) واقعات کی یاد دلاتی ہیں۔" [2]

ان کی ملاقات وہاں کے مشاہیر، اہلِ قلم اور عائدین سلطنت سے ہوئی جن میں وزراء اور امراء بھی شامل تھے اور وہاں کی علمی مجالس میں بھی شریک ہوئے۔ قیام لندن کے ملنے والوں میں گورنر جنرل لارڈ لارنس کا نام سرِ فہرست تھا۔ جن سے اکثر ملاقات رہتی اور ایک دوسرے کے مہمان ہوتے تھے۔ انھیں کی وساطت سے سید احمد خاں شاہی خاندان کے متعدد افراد سے متعارف ہوئے۔ لارڈ لارنس نے ان کو ملکہ وکٹوریہ، ڈیوک آف آرگایل (ملکہ وکٹوریہ

---

[1] سفرنامہ مسافرانِ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی کلب روڈ لاہور ۱۹۶۱ء ص ۱۷۶ - ۱۷۷
[2] ایضاً " " " " " ص

کے سمدھی) مارکوئز آف لارن (ڈیوک کے بیٹے اور ملکہ وکٹوریہ کے داماد) اور لارڈ اسٹینلے سفیر برائے قسطنطنیہ سے ملوایا اور لارڈ لارنس کی تحریک پر ہی انھیں چھ اگست ۱۸۶۹ء کو سی۔ ایس آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ انگلستان جانے سے قبل وہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے آنریری فیلو مقرر ہو چکے تھے اس کے اہم جلسوں جو ملکہ وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کی لیوی (فوجی اعلیٰ افسروں کے لئے مخصوص تھے) میں شرکت کی۔ انھیں اُس ملک کی ادبی سوسائٹی "ایتھینیم کلب" کے رکن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کلب میں متعدد مشاہیر سے ملاقات ہوئی۔ یہیں عالم دین سر اسٹینلے سے تبادلۂ خیال ہوتا رہتا جو دوستی کی صورت اختیار کر گیا۔ شاہِ ایران کے سفیر حاجی محمد حسین خاں سے بھی مذہبی معاملات پر اظہار خیال ہوتا اور چارلس ڈکنز کے ناول کی آخری ریڈنگ میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔

سید احمد خاں نے لندن کے مختصر قیام تقریباً ڈیڑھ سال (ایک سال پانچ ماہ اور آٹھ یوم) میں جو علمی اور اصلاحی خدمات انجام دیں وہ حیرت انگیز ہیں، دوستی اور تعلقات کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ وہ پوری طرح تصنیفی مشاغل میں منہمک تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کے لئے ایک تعلیمی ادارہ کے قیام کا منصوبہ بھی بنا رہے تھے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک تعلیمی انجمن کی تشکیل کے لئے محسن الملک سے خط و کتابت کی اور "التماس بخدمت اہلِ اسلام و حکام ہند در بابِ ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند" کے نام سے اردو اور انگریزی[1] میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر پمفلٹ لکھا اور چھپوا کر لندن سے بھیجا۔

اس کے علاوہ "خطباتِ احمدیہ" کو شایع کیا اس کے لئے انھوں نے تن دہی سے وہاں کے کتب خانوں سے مواد اکٹھا کیا۔ لاطینی اور انگریزی کی گراں قیمت کتابیں خریدیں۔ سیرت کے موضوع پر جو عربی کتابیں مصر، فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں ان سے استفادہ کیا گاڈفری ہیگنز کی کتاب "اپالوجی فار محمد اور قرآن" کو اپنے خرچ سے طبع کرایا۔ وہ اندلس محاربات پر تاریخی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے دو کتابیں جان ڈیوک پورٹ سے لکھوانا چاہتے تھے اور ایک کتاب

---

1) STRICTURE UPON THE PRESENT EDUCATIONAL SYSTEM IN INDIA PAGES 33.

سیرت نبوی پر بھی - یہ تینوں انگریزی کتابیں بوجب وعدہ لکھی گئیں یا نہیں ۔ تحقیق طلب امر ہے ۔ سید احمد خاں کی اشاعتی سرگرمیوں سے امیر علی (کلکتہ) متاثر ہوئے اس لئے کہ جب وہ انگلستان پہنچے تو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ ان کی مذہب سے متعلق تصنیفی روایت کو آگے بڑھایا اور اُن ہی موضوعات کی تحقیق سے وضاحت کی ۔

سید احمد خاں ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو بمبئی پہنچے اور وطن آکر وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئے ۔ ان کی روانگی پر اخبار "ورلڈ میل" میں سید عبد اللہ مقیم لندن کی طرف سے مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو ایک مضمون چھپا جس میں کہا گیا کہ

"یہاں کے بہت سے مدبر ان سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایسے لائق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے سر سید احمد خاں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور ادھوری ہوتی ۔" [1]

"سفرنامہ مسافران لندن" کی اہمیت زبان و بیان کی خوبیوں سے زیادہ مصنف کے ذہنی رویے اور فکری نظام سے ہے ۔ اگر ناقدین ان کے سفرنامے کو محض اصلاحی نوع کے سفرناموں میں شمار کریں اور ان کے تاثرات کو احساس کمتری پر محمول کریں تو یہ صحیح نہیں کہ ایک پس ماندہ قوم کو ترقی یافتہ اہل ملک کے بالمقابل لا کھڑا کرنا اور انھیں اپنی کوتاہیوں سے آگاہ کرنا کسی طرح بھی احساس کمتری کا رویہ قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

سفرنامہ پنجاب

سید احمد خاں کا "سفرنامہ پنجاب" مؤلفہ مولوی سید اقبال علی تاریخی اہمیت کا حامل ہے ۔ انھوں نے ۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو پنجاب کا سفر شروع کیا اور دوران سفر ملک کے تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لئے پرجوش تقریریں کیں اور مدرستہ العلوم کے لئے چندہ جمع کیا ۔ ان کے ہم سفروں میں حاجی محمد اسماعیل خاں رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ اور

---

[1] سفرنامہ مسافران لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۱ء ص ۲۱۶

سید محمد علی[1] کے علاوہ اقبال علی جج بارہ بنکی (مولف رسالہ بندہ) شامل تھے اور دہلی سے اکرام اللہ رئیس شہر بھی ساتھ ہو لیئے۔

سب سے پہلے یہ قافلہ ۲۳ جنوری ۱۸۹۴ء کو لدھیانہ پہنچا اور نواب علی محمد خاں کی کوٹھی میں قیام کیا۔ سید احمد خاں کے ساتھ کھانے پر منشی حکیم الدین اور معین الدین بھی بیٹھے جو ان کے لبرل خیالات سے متفق نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اسی دوران تہذیب الاخلاق کے متعلق گفتگو شروع ہوئی اور مذہبی مسایل زیر بحث آئے اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے جواباً کہا کہ علوم جدیدہ اور انگریزی تعلیم سے اگر ایسا ہوتا ہے تو شبہات کو عقل کی روشنی میں دور کرنا چاہیئے تاکہ ایمان میں اُستواری آ سکے۔ وہاں انھوں نے دو بچوں کو دیکھا جو مشن اسکول کے طالب علم تھے پوچھنے پر تعجب ہوا کہ ان میں ایک لڑکا حکیم الدین کا اور دوسرا معین الدین کا تھا۔

یہیں شام کو انھوں نے تقریر میں کہا کہ جس نے کلمہ پڑھا وہ قوم کا ایک فرد ہو گیا۔ اسلام میں عربی عجمی، گورے کالے اونچے نیچے کا کوئی امتیاز نہیں لیکن اب قومی اتفاق کا لفظ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔ ہر شخص اپنی بھلائی اور مالی منفعت کے بارے میں سوچتا ہے، مسجدیں، خانقاہیں اور امام باڑے بنوائے تو ہیں مگر ان کے پیچھے بھی دنیاوی بھلائی چھپی ہے دل میں یہ بات کبھی نہیں آتی کہ قومی ہمدردی کا جوش و ولولہ پیدا کریں اور کام بغیر کسی ذاتی فایدے کے کریں۔ پھر انھوں نے شکایت کی کہ لدھیانہ کے مسلمانوں نے اپنے بچوں کی پڑھائی کا خود کوئی انتظام نہیں کیا بلکہ عیسائی مشنریوں کے اسکول کے سپرد کر دیا ہے۔ پھر ۲۴ جنوری کو جالندھر پہنچے۔ باشندگانِ شہر نے ان کی تقریر ٹاؤن ہال میں رکھی تھی مگر آپسی اختلافات کی بنا پر نہ ہو سکی۔ سید احمد خاں اور ان کے ساتھی کنور رہنام سنگھ اہلووالیہ کوٹھی پر ٹھہرے

---

[1] سید محمد علی سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد کے نواسے اور سید حامد کے سالے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں وہ مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے اور ابتدائے تعلیم سید احمد خاں کے زیر نگرانی ہوئی اور کئی سال ان کے پرسنل سکریٹری رہے پھر منصف کے عہدے پر تقرر ہوا اور جنوری ۱۹۱۹ء سے ایک برس تک کالج کے سکریٹری رہے

ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کے مستقبل کے بارے میں کھل کر گفتگو کی جائے انھوں نے تقریر کے شروع میں زور دے کر کہا کہ انگریزوں کی اطاعت میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ سامعین نے بالعموم ان کے خیالات کی تائید نہیں کی اور مخالفت کا شور اٹھ کھڑا ہوا ان کی تقریر شور کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی اور بعد میں شایع ہوئی۔

وہاں سے ۲۵ جنوری کو وہ معہ دوستوں کے امرتسر گئے۔ اسٹیشن پر حاجی غلام حسن (ایجوکیشن کمیشن کے ممبر) اور شیخ غلام حسن (آنریری مجسٹریٹ) استقبال کے لئے موجود تھے سید حسن بلگرامی بھی پیش پیش تھے جو انگلستان سے ڈاکٹری کی سند لے کر آئے اور امرتسر میں فوجی ڈاکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ اہل شہر کی محبت اور مروت نے ان کے ارادے کو کہ کسی دعوت کو قبول نہیں کریں گے متزلزل کر دیا۔

ان کی خدمت میں کئی استقبالئے (ایڈریس) پیش کئے گئے۔ مدرسہ اسلامیہ امرتسر نے اپنے تقسیم اسناد کے جلسے کی صدارت سید احمد خاں سے کروائی جس میں انھوں نے کہا کہ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اس مدرسہ میں سنی، شیعہ ہندو اور سکھ سب پڑھتے ہیں اس میں کیا شک ہے کہ قوم و ملک کی بہتری اتحاد و اتفاق میں ہے۔ علی گڑھ مدرستہ العلوم میں بھی ہمارا مطمح نظر یہی رہا جو اس لئے کھولا گیا کہ مغربی علوم سے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو واقفیت پیدا ہو سکے لیکن اس کے دروازے ہر بچہ پر کھلے ہیں اور مدرسہ کی تعمیر میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی فراخدلی سے مدد کی ہے اور ان کے نام عمارتوں پر کندہ ہیں۔ اس مدرسہ کی تشکیل میں مجھ سے زیادہ میرے دوستوں نے تعاون کیا اس لئے وہی اس کے بانی کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان میں خاص طور سے حاجی محمد اسماعیل خاں اور اقبال علی قابل ذکر ہیں۔

۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو یہ قافلہ گورداسپور کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں بٹالہ اسٹیشن پر تحصیلدار رام داس منشی ٹیک چند، شیخ ناصر الدین اور شیخ محمد ان سے ملنے آئے اور پندرہ روپے چندے کے حاضر کئے۔ پھر گورداسپور پر سردار پرتاپ سنگھ

اسسٹنٹ کمشنر، رائے بوٹامل اسسٹنٹ کمشنر، سردار محمد حیات خاں اسسٹنٹ کمشنر منشی منولال، تحصیلدار لالہ لیشن داس، وکیل گورچرن داس اور شیخ احمد علی نے مہمانوں کا شاندار خیر مقدم کیا۔ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے تقریر کی کہ آپ مدرستہ العلوم کو قابل تعریف سمجھتے ہیں کہ اس میں ہندو مسلمان دونوں تعلیم پاتے ہیں جب تک ہم سب قومی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی نہ لیں گے اس وقت تک ہماری قوم آگے نہیں بڑھ سکتی اس دور میں صرف عربی اور سنسکرت پڑھنا کافی نہیں بلکہ ضرورت انگریزی زبان کو عام کرنے کی ہے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ہے کہ یہی زبان ہم کو ترقی یافتہ بنا سکتی ہے۔ اور ہم مغربی قوموں سے کاندھے سے کاندھا ملا سکیں گے۔ "خواتین پنجاب" لاہور کے ایڈریس مورخہ ۲۸ر جنوری ۱۸۸۴ء کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ بات ترجیح کی ہے ورنہ جس طرح میں مردوں کی تعلیم کا خواہاں ہوں اسی طرح قوم کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی خواہش مند ہوں۔ وہ ۲۹ر جنوری کو دوبارہ امرتسر گئے اور اپنے لیکچر میں اتحاد باہمی اور نئی تعلیم کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ ان کا قیام مہاراجہ کپور تھلہ کی کوٹھی میں تھا لالہ سنگم لال نے اپنے ایڈریس میں مدرستہ العلوم میں مختلف مذہبوں کے بچوں کا ایک ہی جگہ قیام اور ایک ساتھ تعلیم لینے کو امید افزا صورت حال بتائی۔ سید احمد خاں نے جواباً کہا کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں شروع سے ہی ہر مذہب و ملّت کے بچے تعلیم پاتے رہے ہیں۔ امرتسر سے لاہور ہوتے ہوئے ۴ر فروری کو جالندھر پہنچے جہاں سر بکرما سنگھ بہادر کی کوٹھی پر مقیم ہوئے اور وہیں ان کا ایک عام لیکچر تعلیم پر ہوا پھر ۵ر فروری کو پٹیالہ آئے یہاں بھی سائنس اور انگریزی تعلیم کی اہمیت پر خطاب کیا۔ یہ سب لوگ ۶ر فروری کو مظفر نگر میں نواب محمد اسحاق خاں (رئیس جہاں گیر آباد) کے اصرار پر ان کے ساتھ ٹھہرے۔ جلسہ مظفر نگر کے اسکول میں منعقد کیا گیا جس میں سید حسین علی (رئیس جانسٹھ) منشی علی خاں (ڈپٹی کلکٹر) منشی احمد حسن تحصیلدار اور منصف محمد سعید خاں وغیرہ موجود تھے۔ سید احمد خاں نے اپنی تقریر میں اپیل کی کہ مدرستہ العلوم اب تک ایک ڈھانچہ کی مانند ہے۔ قوم کو چاہیئے کہ چندہ دے کر اس میں جان ڈال دے یہ کام کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تو

سب کو آگے بڑھ کر کارِ خیر میں حصّہ لینا ہوگا۔ پھر انھوں نے سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے پر زور دیا اور اس میں بطور ایک مضمون عربی کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

وہاں سے شام کو روانگی طے تھی۔ محمد اکرام اللہ خاں غازی آباد سے رخصت لے کر دہلی چلے گئے۔ اقبال علی اور سید محمد علی اپنے بزرگ سید احمد خاں کے ساتھ علی گڑھ واپس آگئے۔

اس زمانہ میں مختصر نویسی (شورٹ ہینڈ) کا رواج نہ تھا مگر اُن کے جاں نثاروں نے اس کا کیسا اہتمام کیا تھا اقبال علی نے اس اٹھارہ روزہ سفر کی روداد کے متعلق لکھا کہ

"اگرچہ وہ سب لکچر اور اڈریسوں کے جواب زبانی تھے مگر میں نے التزام کیا تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے میں لفظ بلفظ ان کے خیالات کو قلمبند کرتا جاؤں میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس کام کو پورا کیا اور وہ ذخیرہ ان کی تمام تقریروں کا اور تمام یادداشتیں اس سفر کے واقعات کی میرے پاس موجود ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اُن سب کو اس رسالہ میں جمع کروں"[1]

سید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب قومی جدوجہد کی ایک مختصر روداد ہے جس کا بنیادی مقصد اپنے تعلیمی مشن کو فروغ دے اور قوم کو جدید مغربی تعلیم کی ترویج پر متوجہ کرنا تھا۔ دلاورانِ پنجاب نے بھی سید کے قافلہ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں اور دوران سفر انھوں نے بھی امیر غریب، ہندو مسلمان اراکین آریہ سماج اور ہندو سبھا نیز اسکول و کالج کے لڑکوں سے ملاقاتیں کیں اور سب کا دل اپنی دردمندی اور حق گوئی سے جیتا اور اپنا پیغام علم و عمل دوسروں تک پہنچایا اور ان میں تحرک پیدا کیا۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اٹھائے گئے سیاسی اور ملی سوالات، تجارت و اقتصادیات اور ہندو مسلم اتفاق کی ضرورت پر اس میں اظہار خیال کیا گیا ہے جو آج بھی اہم اور معنی خیز ہیں۔

---

[1] سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب" تالیف سید اقبال علی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۴ء ص ۳-۲

اردو نثر کا ارتقا اور علی گڑھ تحریک

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اردو زبان و ادب بالعموم اور نثر بالخصوص سید احمد خاں سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ ان کی استعانت کی بدولت پروان چڑھی اور آخر انیسویں صدی کی ہر ادبی تخلیق پر ان کے افکار و خیالات اور نثری نگارشات کا اثر نظر آتا ہے اور نہ صرف اس دور میں بلکہ مستقبل کی زبان کے لئے بھی نئی سمت مقرر کی۔ انھوں نے اپنی زبان کے سرمائے کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ

"فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب و ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بُری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے کچھ اور نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔"[۱]

شاعری میں غزل کی صنف نظم پر حاوی تھی۔ یہ سید احمد خاں کے تنقیدی خیالات کا اثر تھا کہ "انجمن پنجاب"[۲] کی تاسیس سے جدید نظم نگاری کا آغاز ہوا اور محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے روایتی غزل کو چھوڑ کر موضوعاتی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ انھوں نے اس نئی انقلابی کوشش سے خوش ہو کر لکھا:

"اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں پہل

۱؎ تہذیب الاخلاق جلد سوم، شمارہ نمبر ۱، ۱ر مارچ ۱۸۷۲ء صفحہ ۴

۲؎ انجمن پنجاب کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" ہے جس کی تاسیس ۲۱ر فروری ۱۸۶۵ء کو عمل میں آئی۔ اس کے قیام کا اصل مقصد غیر طرحی قسم کے مشاعرے منعقد کرنا تھا۔ اس نوع کا پہلا مشاعرہ ۳۰ر جون ۱۸۷۴ء کو ہوا جس میں مصرع طرح کے بجائے عنوان دیا گیا تھا اور نو شعراء نے پہلی بار اپنی نظمیں پڑھیں۔

شاعری (پوئٹری) کا مشاعرہ ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا۔ محمد حسین آزاد کی مثنوی "خواب امن" ہماری دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے۔ مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے ان کی مثنوی "حب وطن" اور مثنوی مناظرہ "رحم وانصاف" درحقیقت ہمارے زمانے کے علم وادب میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔" [1]

لیکن سید احمد خاں کا مہتم بالشان کارنامہ اردو نثر کی ترقی و ترویج ہے۔ اُن سے قبل اردو نثر کا کم وبیش سارا سرمایہ داستانوی ادب سے متعلق تھا اور نثر میں علمی وادبی مضامین بہت کم لکھے گئے تھے۔ اس وقت کے ذخیرہ کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی نثر

غالب کے خطوط کی نثر

اور دلی کالج کی نثر

فورٹ ولیم کالج کی وساطت سے جو کچھ نثر میں لکھا گیا اس کا بنیادی مقصد غیر اردو داں انگریز حکام کو اردو سے روشناس کرنا تھا اس لئے وہاں سے یا تو مختلف علوم سے ترجمے یا پھر دیگر زبانوں کی منظوم داستانوں سے ماخوذ نیم طبع زاد کتابیں شایع ہوئیں۔ کالج میں جو ادبی اصلاح عمل میں آئی اس کا تعلق زبان و بیان سے تھا نہ کہ موضوعات اور مباحث سے۔ وہاں کے ارباب قلم نے دقیق اور مشکل اسلوب سے گریز کیا اور سادہ و عام فہم زبان میں قصّے کہانیاں لکھیں۔

غالب نے اپنے خطوں میں جیسا کہ پیشتر بھی خطوط کے سلسلے میں کہا جا چکا ہے کہ رنگین اور مرصع زبان کے بجائے سلیس اور بے ساختہ عبارت لکھی اور سہل ممتنع کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے اپنے قلبی واردات ذہنی افکار، کائنات کے اسرار اور اپنے مشاہدات و تجربات کو سیدھے سچے بے تکلف مگر سحر آفریں

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۶ شمارہ نمبر ا یکم محرم الحرام ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء ص ۵

طریقے پر بیان کیا۔ یہ خطوط نہ صرف ان کی ظاہری و باطنی زندگی کے ترجمان تھے بلکہ ایک ایسا مجلّیٰ و مصفیٰ آئینہ جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا اور دل کی دھڑکن سن سکتا تھا لیکن اس کے باوجود ان کا اسلوب اتنا قوی نہیں تھا کہ عمیق، دقیق اور علمی وفنی موضوعات کا بار گراں اٹھا سکتا۔

دلی کالج سے متعلق مصنفین نے اپنی تخلیقات سے علمی نثر کو فروغ دیا بالخصوص ماسٹر رام چندر نے ہر نوع کے مضامین لکھے جو ان کے ذاتی اخبار "فوائد الناظرین" اور "محبِّ وطن" میں شائع ہوئے جو ملک و قوم کی اصلاح کی خاطر اور زمانے کے تقاضوں اور مطالبات کو سمجھ کر تحریر ہوئے تھے۔

اردو نثر کے اس محدود سرمایہ سے سید احمد خاں یقیناً مستفید ہوئے ہوں گے لیکن نسبتاً نثر کا دائرہ محدود تھا کبھی طوعاً و کرہاً لکھی بھی جاتی تو وہ چیستاں و معمہ معلوم ہوتی تھی اور اس کو سمجھنے کے لئے ہفت خواں طے کرنا پڑتا تھا۔ سید احمد خاں بنیادی طور پر مصلح تھے۔ اس محشر خیال مصلح کو جب اپنی آرا اور افکار کے اظہار کے لئے اردو کا دامن تنگ نظر آیا تو انھوں نے خود اپنا ایک جہانِ زبان وادب تعمیر کر ڈالا۔ انھوں نے ارادی طور پر ایسے مضامین لکھے جن میں دلائل وشواہد کی ایک خاص منطقی ترتیب ہوتی ہے۔ ان کی نثر حشو و زوائد اور تضاد سے پاک ہے۔ عموماً وہ عبارت آرائی، انشا پردازی اور روایتی محاسن نگارش کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اپنے مقصد کو صراحت اور سلاست سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس سعی کا ذکر یوں کیا کہ

> "جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی، رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات، استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہیں اور جن کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفی عبارت کہلاتی ہے ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی

اس میں کوشش کی جو لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے"۔[1]

انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں اُن کے شائع شدہ مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

علمی مضامین

اور

انشائیے

سنجیدہ علمی مضامین اُن کا طرۂ امتیاز ہیں جن میں انھوں نے حقیقت پسند دانشور کی طرح واقعات و کوائف کا محاکمہ اور مسائل پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

انشائیے دراصل مضمون نگاری کی وہ صورت ہے جس میں مصنف کسی موضوع پر اپنے خیالات اور تاثرات کو بے ساختہ اور برجستہ انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ قاری تک اس کے احساسات کی ترسیل میں کوئی اشکال اور پیچیدگی پیدا نہ ہو اور جب کبھی انشائیہ نگار اپنے موضوع سے بھٹک جاتا ہے تو ایسے انشائیے کو ذہن کی ایک لہر سے تعبیر کیا گیا ہے انشائیہ نگاری میں شواہد و علل کا وہ التزام نہیں ہوتا جو علمی و ادبی مضامین کے لئے مختص ہے۔ سید احمد خاں کے انشائیوں کو اس صنف کی ابتدائی اور نیم پختہ شکل کہا جا سکتا ہے ان کے انشائیوں میں 'امید کی خوشی' 'بحث و تکرار' 'گزرا ہوا زمانہ' اور جاڑا اہم ہیں۔

ان کے کچھ مضامین کے ماخذات کی نشاندہی ذیل میں درج ہے[2]

۱۔ تعلیم۔ اسپیکٹیٹر نمبر شمارہ ۲۱۵

۲۔ رسم و رواج کی پابندی۔ مل کی کتاب "لبرٹی" سے ص ۷۹ ۔ ۹۰

۳۔ آزادیٔ رائے۔ " " " ص ۲۲ ۔ ۶۴

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۲، شمارہ ۱، یکم محرم الحرام ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء مطابق علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، ص ۳

[2] محمد صادق ہسٹری آف اردو لٹریچر، سیکنڈ ایڈیشن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی ۱۹۸۴ء۔ ص ۳۴۳

۴۔ سمجھ ۔۔۔ اسپیکٹیٹر شمارہ نمبر ۱۷۴
۵۔ دنیا بہ اُمید قائم ہے۔ اسپیکٹیٹر نمبر شمارہ ۱۷۴
۶۔ اخلاق ۔۔۔ " " " ۴۵۹
۷۔ ریاکاری ۔۔۔ " " " ۳۹۹
۸۔ خوشامد ۔۔۔ مصنفہ اسٹیل " " " ۲۳۸
۹۔ وحشیانہ نیکی ۔۔۔ اسپیکٹیٹر " " " ۲۱۵
۱۰۔ اپنی مدد آپ ۔۔۔ سیموئیل اسمائیلز "سلیف ہیلپ" تعارف

سید احمد خاں نے سادہ، رواں اور عام فہم زبان لکھ کر اردو کو اس قابل بنایا کہ علمی اور سائنسی موضوعات کی متحمل ہو سکے۔ ان کی تحریروں میں لسانی تزئین وتہذیب کی اتنی کارفرمائی نہیں جتنی تصنیفی تنظیم اور ترتیب کی۔ ان کا یہ مخصوص طرز تحریر ادبی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے مقصدیت، واقعیت اور افادیت کے تانے بانے سے اردو نثر کا جامہ تیار کیا اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ عبارت کو جاندار اور مؤثر بنانے کے لئے تشبیہ واستعارے سے بھی کام لیا جو خیالی اور دور از کار نہیں ہوتیں۔ مثلاً انھوں نے ایک مضمون "بحث وتکرار" میں کتوں کے باہمی جنگ وجدل کا نقشہ استعاراتی طور پر پیش کرکے غیر مہذب انسانوں کے بحث ومباحثہ کا نقشہ یوں کھینچا:

"مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کر کرا آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے ایک کوئی بات سمجھاتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو؟ وہ بولتا ہے تم کیا جانو؛ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چڑھ جاتی ہیں۔ لپادگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر"[1]

ان کی موثر طرز تحریر کی ایک اور مثال انشائیہ امید کی خوشی ہے۔

---

[1] مقالات سرسید احمد خاں مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۲ء ص ۱۶۹

"اونورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی امید۔ یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقتوں میں ہم کو تسلّی دیتی ہے تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز کار خوشیاں ہم کو نہایت پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں"

دیکھو نادان بے کس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اس گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے، ہاتھ کام میں ہے اور زبان سے اس کو لوری دیتی ہے۔ سو رہ میرے بچے سو رہ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سو رہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہو گا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی زیادہ اچھی ہو گی۔ تیری ہستی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہو گی" [1]

سید احمد خاں نے اپنے رسالوں اور تحریروں کے ذریعے اردو ادیبوں کی توجہ ایک ایسے ادب کی طرف مبذول کی جو تعمیری، اخلاقی اور افادی ہو اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر ارباب علم و فن کا ایک ایسا حلقہ پیدا ہو گیا جو ان کا ہمنوا اور ہم مسلک بنا جنھیں انھوں نے فکری سطح پر معروضی طرز اختیار کرنے اور سائنسی نقطۂ نظر اپنانے کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا اور ان اہل قلم نے جس دبستانِ ادب کی بنا ڈالی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف ہوئی۔ ان کے رفقا نے بھی سلیس و صاف زبان میں اظہار خیال کیا۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اردو میں کئی ادیب نمایاں ہوئے، مثلاً محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی

---

[1] مقالات سرسید مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۹-۲۱،

اور ذکاء اللہ کے نام اہم ہیں۔

سید مہدی علی، محسن الملک (۱۸۳۷ء - ۱۹۰۷ء) کی پیدائش اٹاوہ (یوپی) میں ہوئی سید احمد خاں انھیں "ایک جان دو قالب" کہتے اور اسی ہم نشینی کی وجہ سے انھوں نے اُن کے خیالات کی توضیح اور نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے رکن بن گئے اور اکثر مدرستہ العلوم اور مذہبی موضوعات پر اخبار سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق میں لکھتے رہتے تھے۔ ان کا شمار ان ادیبوں میں تو نہیں ہوتا جنھوں نے اردو کو نئی جہتوں سے روشناس کیا البتہ نثر کے فروغ میں ان کے کارنامے معاون ثابت ہوئے۔ انھوں نے "رسالہ میلاد شریف" (۱۸۶۰ء) "آیاتِ بینات" "کتاب الحبیت والشوق" (غزالی) "تقلید و عمل بالحدیث" اور "فی تفسیر علوم قرآن" تصنیف کیں۔

محسن الملک کی تحریروں کی ایک انفرادی خصوصیت اعتدال پسندی اور میانہ روی تھی وہ مغربی تہذیب کی اندھادھند تقلید کے بجائے مسائل کا فلسفیانہ تجزیہ کرتے اور جدید دور کے مفید و معتبر عناصر کو مشرقی مذاق کے مطابق ڈھالنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی آواز سرسید کی ہی آوازِ بازگشت تھی وہ اُن کے مشن اور علی گڑھ تحریک کے پُرجوش مبلغ تھے جس کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

> "مجھ سے زیادہ سرسید کا جاننے والا، ان کی عزت کرنے والا، ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں۔"[1]

مشتاق حسین وقار الملک (۱۸۳۹ء - ۱۹۱۷ء) بھی سائنٹفک سوسائٹی اور مجلس "خزینۃ البضاعۃ" کے سرگرم رکن اور تعلیمی تحریک میں سید احمد خاں کے دوش بدوش کوشاں رہے انھوں نے مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب کی تدریس کو بھی ضروری قرار دیا، ان کی متوازن تحریروں سے اردو نثر کی ترویج ہوئی۔ ان کے اخلاقی اور اصلاحی مضامین انسٹی ٹیوٹ گزٹ

---

[1] محمد امین زبیری۔ حیاتِ محسن مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۴ء ص ۲۰۹

اور تہذیب الاخلاق میں شایع ہوئے۔ انھوں نے کارلائل (۱۷۹۵ء-۱۸۸۱ء) کی کتاب سے "انقلاب فرانس" کا اردو ترجمہ کیا اور ان کے خطوط کا مجموعہ بھی سرسید اکیڈیمی علی گڑھ سے طبع ہوا ہے۔ مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ء-۱۸۹۵ء) عربی فارسی، انگریزی اور عبرانی زبانوں کے ماہر تھے۔ لاطینی اور یونانی سے بھی واقفیت تھی چونکہ انھیں اسلام سے غیر معمولی موانست تھی۔ اس لئے بعد مطالعہ انھوں نے عیسائی مشنریوں کے اسلام پر اعتراضات کا مدلل جواب لکھا اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں "محمد پیغمبر برحق" تعلیقات (۱۸۷۲ء) تحقیق الجہاد "اسلام کی دنیاوی برکتیں" اور "قدیم قوموں کی مختصر تاریخ" عظم الکلام فی ارتقاء الاسلام اہم ہیں۔

سید احمد خاں کے مویدین میں شاید ہی کسی نے اُن کے مقصد و مدعا کی اتنی مسلسل تائید کی ہو جتنی چراغ علی نے کی اور ان کی مذہبی تصانیف کی توسیع اس طرح کی کہ انھوں نے بی بی ہاجرہ ماریا قبطیہ اور مولوی نذیر احمد نے "امہات الامہ" کے نام سے حضرت محمدؐ کی ازواج کے حالات زندگی لکھے۔ ان کے انتقال پر سید احمد خاں نے بڑے تاسف کا اظہار کیا کہ:

"ان کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلے کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدر آباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری اور کالدی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی زبان میں انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ مذہب اسلام کے ایک زبردست فلاسفر تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسے خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا، ایسے زمانے میں کہ ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے ..... افسوس کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"[1]

---

[1] مقالات سرسید مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۵ء ص ۲۸۱ - ۲۸۲

مولانا محمد حسین آزاد، منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد کا علی گڑھ سے براہِ راست تعلق نہ تھا مگر تینوں سید احمد خاں کی پُرخلوص شخصیت اور اُن کے اصلاحی خیالات کے معترف تھے۔

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔ ۱۹۰۷ء) نے "آب حیات"، "سخندان پارس"، "قصص ہند"، دربار اکبری، کے علاوہ ۱۸۸۰ء میں "نیرنگ خیال"، تمثیلی مضامین کا مجموعہ دو جلدوں میں انگریزی طرز پر لکھا وہ بھی سید احمد خاں کی طرح انگریز مصنفین اور ان کے مضامین سے متاثر ہوئے۔ ... مثلاً"

۱۔ آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہوگیا۔
جانسن "آرام اور محنت کی تمثیلی تاریخ"

۲۔ سچ اور جھوٹ کا زمانہ۔	جانسن "سچ جھوٹ اور فسانہ پر تمثیل"
۳۔ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا"	ایڈیسن کے "ایک خواب سے انسان کی بار گراں سے سبکدوشی"
۴۔ علمیت اور ذکاوت کا مقابلہ	جانسن "ذکاوت اور علمیت کی تمثیل"
۵۔ جنت الاحمقار	پارنل "احمقوں کی جنت"
۶۔ خوش طبعی	ایڈیسن۔ اسپیکٹر نمبر ۳۵
۷۔ مرقع خوش بیانی	ایڈیسن۔ اسپیکٹر نمبر ۳۵
۸۔ سیر آدم	اسپیکٹیٹر نمبر ۵۰۱

۹۔ شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار۔ "شہرت کا وجدان" ٹیٹلر نمبر ۸۱ [1]

"نصیحت کا کرن پھول"۔ بچوں اور عورتوں کے لئے موثر انداز میں تحریر کیا اور انھوں نے اردو اور فارسی کے چھوٹے درجوں میں پڑھائے جانے کے لئے عمدہ درسی کتابیں بھی لکھیں۔ محمد حسین آزاد اردو کے بڑے نثر نگار ہیں ان کی عبارت بظاہر سادہ لیکن دراصل پرکار اور سجی ہوتی ہے۔

---

[1] محمد صادق ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی ۱۹۸۴ء دوسرا ایڈیشن ص ص ۲۷۶۔۲۷۷

کردار اور واقعہ دونوں کو چند لفظوں میں زندہ کرکے آنکھوں کے سامنے پیش کردینا ان کی نثر کا کمال ہے چنانچہ "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) میں جتنے واقعات لطیفے اور شاعروں کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اُن کے حسنِ بیان کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر نقش ہوگئی ہیں۔

منشی ذکاء اللہ (۱۸۳۲ء - ۱۹۱۵ء) سائنٹیفک سوسائٹی کے رکن ۱۸۶۶ء میں بنے انھوں نے مغربی علوم کی کتابوں کے اردو تراجم کی پُرزور تائید کی اور عملاً سوسائٹی کے اس مقصد کو تقویت پہنچائی۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ مدرستہ العلوم کے ٹرسٹی اور خزینۃ البضاعۃ کے رکن رہے حالانکہ وہ "دلی کالج" میں ماسٹر رام چندر کے زیرِ اثر ریاضیات کے ذہین طالب علم اور پھر ممتاز استاد رہے۔ ان کی تصانیف، ریاضی، تاریخ ادب و فلسفہ اور جغرافیہ کے موضوع پر ہیں۔ علاوہ تدریسی رسالوں کے "تاریخِ ہندوستان" آٹھ جلدوں میں ان کا کارنامہ ہے اتنی مبسوط کتاب اُردو میں اس سے پہلے نہیں ملتی "تاریخ عہدِ انگلشیہ" بھی اہم تصنیف ہے۔ انھوں نے بھی سرسید کی طرح تاریخ نویسی میں معروضی اندازِ فکر اپنایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حاجی سمیع اللہ خاں کی سوانح عمریاں بھی لکھیں۔ ان کی علمی کاوشیں ڈیڑھ سو کے قریب ہیں اور بقول عبدالحق ان کا ذخیرۂ کتب ایک چھوٹا موٹا کتب خانہ بن سکتا ہے۔ ان کا قیام بہ سلسلۂ ملازمت دہلی، آگرہ اور الٰہ آباد رہا لیکن انھیں ذہنی لگاؤ علی گڑھ سے تھا اور وہ سید احمد خاں کو اپنا فکری قاید سمجھتے تھے۔

مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ء - ۱۹۱۲ء) بھی "دلی کالج" کے طالب علم اور عربی کے استاد تھے۔ ان کی پہلی ملاقات دورانِ ملازمت جب سید احمد خاں سے ہوئی تو وہ ان کی راست بازی خلوص اور فعال شخصیت کے قدر شناس ہوگئے۔ اصلاحِ قوم کا جذبہ دونوں میں مشترک تھا نذیر احمد نے اپنا سارا زورِ قلم اصلاحِ معاشرہ پر صرف کیا اور اس کے ایک جزو یعنی طبقۂ نسواں کے حال زبوں کی طرف توجہ کی اور اپنے ناولوں کو ان کی تعلیم اور کردار کی درستی کا ذریعہ بنایا۔

ان کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ۱۸۶۹ء میں اپنی لڑکی کی تعلیم کے سلسلہ میں چھپا۔ پھر "رویائے صادقہ" اور ۱۸۷۳ء میں "بنات النعش" شایع ہوئے اور اپنے لڑکے کو پڑھانے

کے لیے "توبۃ النصوح" ۱۸۷۴ء میں لکھا۔ ان ناولوں کے کردار اصغری، اکبری، حسن آرا، کلیم اور مرزا ظاہردار بیگ بہت مشہور ہوئے۔

۱۸۸۵ء میں "فسانۂ مبتلا" اور "ابن الوقت" چھپے۔ "ابن الوقت" میں نذیر احمد نے ان مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کا کردار پیش کیا جو مغربی تہذیب سے مرعوب اور مغربیت زدہ ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن الوقت کی تخلیق انھوں نے سید احمد خاں کو پیش نظر رکھ کر کی لیکن یہ ایک مفروضہ ہے کیونکہ وہ ان کے خیالات و افکار کے اس قدر قایل تھے تو پھر ان کا استہزا کیسے گوارا کرتے۔ ابن الوقت کے کردار میں جو ضروری مماثلت ہے وہ اتفاقی ہو سکتی ہے۔ وہ فکشن کے سربراہ اور سرخیل ہیں۔ نذیر احمد کی مذہبی کتابوں میں "الحقوق والفرایض"، "امہات الامۃ" اور "مطالب قرآن" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے متعدد مضامین بھی تہذیب الاخلاق میں شایع ہوئے انھوں نے تحریر و تقریر کے سبھی ذرایع اصلاح قوم کے لئے استعمال کئے اور اپنی ذکاوت اور علم و فضل سے سید احمد خاں کے مشن کو وسعت و معنویت بخشی۔

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء) نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی مگر انھیں سید احمد خاں کا اصلاحی نصب العین اتنا عزیز تھا کہ غزل گوئی ترک کر کے نظم نگاری شروع کی۔ انھوں نے اعتراف کیا:

> "اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔"[1]

مسدس حالی (مدوجزر اسلام) سید احمد خاں کے ایما پر لکھی گئی تھی اور اس نے ان کے لئے "توشۂ آخرت" مہیا کر دیا تھا۔ حالی کی نظمیں نیچرل شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ "نیچرل" کی اصطلاح حالی نے سید احمد خاں سے لی۔ مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) جو اردو تنقید میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے اس میں شعر کی خصوصیات سادگی، اصلیت اور جوش کو قرار دیا۔ پھر مناظرِ قدرت

---

[1] الطاف حسین حالی۔ دیباچہ مسدس حالی۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء ص ،

مظاہر فطرت اور حیاتِ انسانی کے عام رموز کو جاننے کے لئے قوتِ متخیلہ اور تفحص الفاظ کو اہم بتایا۔ واقعات و مسائل کو صداقت سے بیان کر دینے کے اصول نے آگے چل کر ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار کی۔ حالی اور محمد حسین آزاد نے ورڈز ورتھ اور کولرج کی طرح روایت سے بغاوت کی۔ ان کے مابین شاعری اور تنقید مشترک ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری پر ورڈز ورتھ اور کولرج کی تصنیف "لرِیکل بیلیڈ" کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔

انھوں نے عورتوں کے حال زار پر اصلاحی نظمیں "مناجات بیوہ" (۱۸۸۶ء) اور "چپ کی داد" (۱۹۰۵ء) لکھیں۔

حالی کو کئی ادبی اصناف مثلاً نظم گوئی، تنقید اور سوانح نگاری میں تقدم حاصل ہے۔ "حیات سعدی" (۱۸۸۶ء) "یادگار غالب" (۱۸۹۷ء) کے علاوہ "حیات جاوید" (۱۹۰۱ء) سرسید احمد خاں کی دلاویز اور جامع سوانح ہے جس میں حالی نے ان کی زندگی کے مختلف واقعات اور انقلاب آفریں کارناموں کا مفصل جائزہ اور محاکمہ کیا ہے جس سے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء) مدرستہ العلوم علی گڑھ میں عربی زبان و ادب کے مدرس ۱۸۸۲ء میں مقرر ہوئے۔ اور سوانح نگاری کی داغ بیل شعراء کے تذکروں سے پڑی لیکن صنف کی حیثیت سے فروغ سید احمد خاں کا مرہون منت ہے۔ "سیرۃ فریدیہ" میں انھوں نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین کے حالاتِ زندگی اور اپنی والدہ عزیزالنساء کے گھریلو ماحول اور خود اپنی تعلیم و تربیت کے متعلق واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب محدود معنی میں سوانح کہی جا سکتی ہے لیکن ان کے رفقاء میں حالی اور بالخصوص شبلی نے اسے باقاعدہ صنف بنایا۔ شبلی کو امام ابو حنیفہ سے بہت عقیدت تھی انھوں نے ان کی مستند سوانح عمری "النعمان" (۱۸۹۲ء) لکھی چونکہ امام کا نام نعمان تھا اس لئے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے نام کے ساتھ بھی "نعمانی" کا اضافہ کیا۔ انھوں نے بھی تاریخی سوانح اس مقصد سے لکھیں کہ قوم اپنے قابلِ رشک ماضی اور اسلاف کے کارناموں سے آگاہ ہو سکے "الفاروق" (۱۸۹۹ء)، "المامون"، "الغزالی" (۱۹۰۲ء) سوانح مولانا روم (۱۹۰۲ء) اور پیغمبر اسلام کی سیرت کی ایک ہی

جلد لکھ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا باقی جلدیں ان کے ممتاز شاگرد سید سلیمان ندوی نے ختم کیں اس کے علاوہ علم الکلام ۱۹۰۳ء جیسی فلسفیانہ کتاب بھی تحریر کی۔ ادبی تاریخ و تنقید میں شعر العجم (۱۹۰۶ء—۱۹۱۲ء) اور "موازنۂ انیس و دبیر" (۱۹۰۷ء) شامل ہیں۔ شعر العجم فارسی شاعری کی تاریخ پانچ جلدوں میں ہے۔ انھوں نے شاعری کے اصول فصاحت و بلاغت محاکات اور مرقع نگاری بیان کئے ہیں اور موازنہ سے اردو میں عملی اور تقابلی تنقید کی ابتدا ہوئی۔ جدید اردو ادب اور تنقید میں حالی نے ادب کے سماجی مقصد اور اس کی افادیت پر زور دیا اور مغربی تصورات سے روشناس کیا تو شبلی نے ادبیت اور ادب کے حسن پر زور دیا ان کی نثر پختہ اور مہذب ہے۔

علی گڑھ کے کچھ اور اہل قلم نے مختلف اصناف اور متفرق اوقات میں نام پیدا کیا ان میں کچھ خوشی محمد ناظر، فانی بدایونی، عزیز مرزا، عنایت اللہ دہلوی، چودھری محمد علی، احمد علی، شوق قدوائی اور عبد الحق جیسے لوگ شامل تھے۔

سید احمد خاں کے خیالات سے اختلاف ان کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ یہ بیشتر ان کے مذہبی اعتقادات سے متعلق تھا۔ لیکن بعض ادیبوں نے ان کے ادبی نظریات سے بھی اختلاف کیا ہے وہ اردو کے تمام ترورثہ کو ہر عیب سے مبرّا اور کسی بھی نئی تبدیلی سے بالاتر سمجھتے تھے انھوں نے سید احمد خاں، محمد حسین آزاد اور حالی کے نقطۂ نظر پر نکتہ چینی کی ان میں اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۶ء—۱۹۲۱ء) سرفہرست ہیں انھوں نے طنزیہ کہا کہ

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی — کھلیں گے اور ہی گل، زمزمے بلبل کے کم ہونگے
عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہونگے

اور ان کی آواز میں طنز کی شدت بڑھتی گئی۔

سیّد کی روشنی کو اللہ رکھے قائم — بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے
نہایت حکمت آگیں آپ کی ہر پیچ ہوتی ہے — مزا شربت کا دیجاتی ہے گو وہ پیچ ہوتی ہے

سید احمد خاں کے انتقال کے بعد بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں اور وحید الدین سلیم نے اردو صحافت میں عملی حصّہ لیا دونوں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور

تہذیب الاخلاق سے منسلک رہے اور اپنے اجرا کردہ رسالہ "معارف" میں بھی ادبی مضامین اور ترکی سے تراجم شایع کرتے تھے۔ علی گڑھ کے نوجوان طلباء نے صحافت کے ارتقاء میں عملی حصہ لیا۔ مثلاً محمد علی جوہر نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" اخبار جاری کیے۔ سید احمد خاں کی طرح ان کی صحافت بلند ہمتی اور قومی ہمدردی کا آئینہ تھی حسرت موہانی نے "اردوئے معلیٰ" نکالا مگر سیاست میں زندگی گزارنے کے باوجود اپنی ادبی صلاحیتوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ پھر ظفر علی خاں مدیر روزنامہ "زمیندار" لاہور نے اداریوں اور تبصروں کے ذریعے باشعور صحافی ہونے کا ثبوت دیا۔ عہدِ حاضر میں عبدالماجد دریا بادی بتدریج "سچ"، "صدق"، اور "صدق جدید" کے بانی اور مدیر رہے۔ ان کی تحریروں میں گرد و پیش کے حالات پر طنز کا عنصر نمایاں تھا۔

حیدر آباد دکن میں سر اکبر حیدری نے یورپی علوم اردو میں پڑھائے جانے کی تحریک ۱۹۱۷ء میں کی اور اس کو سر راس مسعود نے ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کی شکل میں عملی جامہ پہنایا جس میں انگریزی زبان کی تدریس کے ساتھ ساتھ درسی مغربی کتابوں کے اردو ترجمے پڑھائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس اسکیم کے تحت مختلف علوم کے اردو تراجم بڑے پیمانے پر ہوئے۔ اس "دارالترجمہ" کے بیشتر اہل قلم علی گڑھ سے وابستہ رہ چکے تھے مثلاً ظفر علی خاں، عبدالحق، عنایت اللہ، وحید الدین سلیم، فانی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ۔

سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی تحریروں سے لوگوں کو ذہنی آزادی حاصل ہوئی۔ انھوں نے تاریخ، مذہب، تعلیم، سائنس، جمہوریت، آزادئ رائے، ملکی قوانین، بین الاقوامی حالات و افکار، زبان و ادب، صنعت و حرفت، زراعت، معاشرتی و معاشی مسائل اور تعلیم نسواں جیسے موضوعات پر خلوص سے اظہار خیال کیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں حرکت و عمل کی روح پھونک دی اور تہذیب کا ایک وسیع تصور عام کیا اور علمی نثر کو بالخصوص فروغ دیا، اس بناء پر علی گڑھ تحریک احیائے علوم کے دور سے موسوم کی گئی۔

باب چہارم

سیاست

- سیاسی روّیہ
- سرکشی ضلع بجنور
- اسباب بغاوت ہند
- رسالہ لایل محمڈنز آف انڈیا

سیاسی رویّہ :

سیّد احمد خاں نے سیاست پر کوئی باقاعدہ علمی بحث نہیں کی بلکہ ان کے خیالات ان کے عہد کی دین تھے ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگلستان کی حکومت نے افادیت پسندوں (Utilitarianism) کے زیرِ اثر اندرون و بیرون ملک بہت سی اصلاحات کیں اور انگریزی تاریخ میں گلیڈ اسٹون کی سربراہی کا زمانہ (۱۸۷۰ - ۱۸۸۴ء) لبرل خیال و عمل سے معمور نظر آتا ہے ۔ لارڈ رپن وائسرائے ہند (۱۸۸۰ - ۱۸۸۴ء) لبرل ازم کا نمایندہ تھا ۔ سیّد احمد خاں ان دونوں سے متاثر تھے اور وہ اس صدی کے مغربی مفکرین میں بالخصوص جان اسٹوارٹ مل (۱۸۰۶ - ۱۸۷۳ء) سے واقف ہوئے ۔ اس کی کتاب "سیاسی اقتصادیات" (پولیٹیکل اکانومی) کے مضامین مثلاً آزادی (لبرٹی ۱۸۵۷ء) نمایندہ حکومت (۱۸۶۱ء) اور عورتوں کی محکومیت (۱۸۶۹ء) کے اردو تراجم "اخبار سینٹیفک سوسائٹی" میں چھپے ۔ اس کے علاوہ اسٹیل اور ایڈیسن کے اصلاحی مضامین کے واضح نقوش "تہذیب الاخلاق" کے اوراق میں ملتے ہیں ۔ برصغیر میں ماہرینِ تعلیم اور انگریز افسروں نے لبرل نقطۂ نظر کو روشناس کیا تھا جسے اوروں کے مقابلے میں ہندو مصلحین نے پہلے قبول کیا ۔ سیّد احمد خاں جو بنیادی طور پر مصلح تھے ان کو خواہش ہوئی کہ یہ خیالات مسلمانوں میں بھی رائج ہوں ۔ اس وقت بنگال، مہاراشٹر اور دیگر علاقوں کے لبرل مصلحین حکومت کے ملازم تھے اور انگریزوں کے مخالف نہیں تھے ۔ وہ برک[1] (۱۷۲۹ - ۱۷۹۷ء) کی طرح خدا اور مذہب پر یقین رکھتے تھے ان کے یہاں اسلامی تعلیم اور فقہ کا ذکر برابر ملتا ہے چاہے وہ مسلمانوں کی حکومت سے وفاداری ثابت کریں یا عیسائیوں کے ساتھ اہلِ اسلام کے کھانے کو جائز قرار دیں یا غلامی کی تردید کریں ۔ ان کے دلایل اسلامی ماخذات پر مبنی ہوتے ہیں ۔

---

[1] مشہور سیاستداں ایڈمنڈ برک ڈبلن کا رہنے والا تھا ۔ ۱۷۶۵ء سے آخر عمر تک ۔ اس نے انگلستان کے سیاسی مسایل میں گہری دلچسپی لی اور پارلیمان کی اہمیت پر زور دیا ۔ وہ اُس دور کی سیاسی تاریخ کا اہم فرد تھا ۔

انیسویں صدی کے ہندوستان میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل ایک دوسرے سے اس درجہ پیوست تھے کہ ان میں ربط و توازن پیدا کئے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی اور سید احمد خاں ایسے قومی رہنما تھے جنھوں نے اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر غور کیا:

"جب میں اپنے ہم وطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گذشتہ حالات سے اس قدر نا واقف ہیں کہ آئندہ راستے چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی روشنی نہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے؟ اور اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔"[1]

ہر سیاسی و معاشرتی تبدیلی اپنے عہد کی پیداوار ہوتی ہے اور ان کے خیال میں اسے سمجھنے کے لئے عصری تقاضوں سے واقفیت ضروری ہے۔ انھوں نے اشارہ کیا:

"تم اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو۔ آپ کے بزرگ جس زمانے میں تھے انھوں نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق بنا لیا تھا اس لیے وہ دولت و حشمت اور عزت سے نہال تھے اور جس زمانے میں کہ ہم ہیں ہم نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق نہیں بنایا اس لئے نکبت اور ذلت میں ہیں۔"[2]

سید احمد خاں کو دہلی کی شورش کی خبر ملتی رہی۔ اُن کے گھر والے سب وہیں مقیم تھے وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر کسی طرح بجنور سے میرٹھ پہنچے اور پانچ ماہ قیام کے بعد افتاں و خیزاں دہلی آئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ماموں وحید الدین خاں، ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں اور عزیز دوست امام بخش صہبائی فرنگیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن چکے ہیں البتہ والدہ اور نابینا خالہ تین روز کی بھوکی پیاسی نوکر کی کوٹھری میں چھپی ہیں۔ ان کو بہ ہزار دقت میرٹھ لائے جہاں بیماری اور ناتوانی کے باعث ان کی والدہ کا انتقال آخر ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ ان

---

[1] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ مولوی سراج الدین۔ کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۹ء ص ۲۶

[2] ایضاً " " " " " " " ص ۴۱

لرزہ خیز واقعات کا انھوں نے گہرا اثر قبول کیا اور اپنے کرب کا اظہار یوں کیا کہ

"کم بخت زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں۔ اس زمانے میں بجنور میں تھا جو مصیبت کہ وہاں کے موجودہ حکام انگریزی اور عیسائی مذہب کے زن و مرد اور بچوں پر پڑی صرف اس خیال سے کہ انسانیت سے بعید ہے کہ ہم مصیبت کے وقت ان کا ساتھ نہ دیں۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ غدر میں جو حال انگریزوں اور بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہو گئے ان دونوں واقعات کا ذکر بھی دل کو شق کر دینے والا ہے۔ غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا اور نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیر جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعد میں اس وفاداری کے صلہ میں جہاں آباد جو سادات کا ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں ان کی جایداد لے کر تعلقدار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔"[1]

پھر جب حالات قدرے سدھرے تو وہ ۱۸۵۸ء ہی میں بحیثیت صدر الصدور مراد آباد گئے وہاں کی حالت دیکھ کر وہ ہندوستان میں رہ کر اصلاحِ قوم پر مجبور ہو گئے کہ انسانیت اور اخلاق کا تقاضا بھی یہ ہی تھا:

"چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھ کو بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد آیا جو ایک بڑا غم کدہ بربادی

---

[1] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری مرتبہ منشی محمد سراج الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء ص ۴

ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا اس غم کو کسی قدر ترقی ہوئی مگر اس وقت یہ خیال
پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں
چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا
چاہیئے اور مصیبت پڑی تو اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں
نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"[1]

سید احمد خاں نے اپنے وطن میں رہنے کا فیصلہ کرنے کے بعد مفلوک الحال بالخصوص
مسلمانانِ ہند کے لئے دو تدبیریں اختیار کیں:

ایسے رسالے لکھنا جس سے انگریزوں کی وہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو
ان میں ہندوستانیوں کی طرف سے پیدا ہو گئی تھیں مثلاً "سرکشی ضلع بجنور"۔

"رسالہ اسباب بغاوت ہند" اور لائل محمڈنز آف انڈیا"

ہندوستانیوں میں مغربی تعلیم اور یورپی تہذیب کو فروغ دینا۔ ان کا خیال
تھا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کر لیں تو ان کی زبوں حالی اور پسماندگی جاتی رہیگی

اس اعتقاد کے مطابق انھوں نے مراد آباد میں جدید تعلیم کو رائج کرنے کیلئے ۱۸۵۹ء میں
ایک مدرسہ کھولا اس سے قبل یہاں کوئی تعلیمی ادارہ مسلمانوں کے لئے نہیں تھا۔ یہ ایک قدیم
طرز کی درسگاہ تھی جس میں زبانِ انگریزی کے علاوہ زیادہ تر تعلیم فارسی کی تھی۔ غازی پور کا
اسکول بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ان کے خیال میں جدید تعلیم انگریزوں سے مصالحت،
سیاسی حقوق کے حصول اور ان کی شخصیتوں کی تعمیر میں معاون ہو سکتی تھی:

"ہندوستانیوں کو اس درجہ تعلیم دی جائے کہ ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت
ہو جاوے۔"

"ہائی ایجوکیشن ہمارے اندر وہ اعتماد اور صلاحیت پیدا کر دے گی کہ ہم جو

---

[1] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری مرتبہ منشی محمد سراج الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء ص ۴

چاہیں گے حکومت کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔"

اور اگر حکومت نے حقوق نہیں دیئے تو اعلیٰ تعلیم وہ حربہ ہے جو جائز حقوق کے حاصل کرنے میں نہ صرف ہندوستانیوں کی مدد کرے گی بلکہ سیاسی لحاظ سے اتنا معتبر کردے گی کہ وہ خود قانون ساز بن سکیں گے۔

"وہ دن دور نہیں ہے کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا وہ دن آوے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔"

سرکشی ضلع بجنور:

سرکشی ضلع بجنور[1] میں سید احمد خاں نے مسلمانوں کے مسائل کو غدر کے پس منظر میں دیکھا اور ایک لائحہ عمل پیش کیا جو ان کی فلاح و ترقی کا باعث بن سکے۔ وہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں بسلسلۂ ملازمت بجنور میں مقیم تھے۔ وہاں کے باشندوں کا ردعمل اور اہلِ فرنگ پر جو کچھ بیتی اس کی تفصیل انھوں نے اپنی اس کتاب میں صداقت اور بے خوفی سے پیش کردی ہے۔ اس میں مصنف نے چشم دید واقعات کو حقیقت

---

[1] سرسید احمد خاں۔ سرکشی بجنور، مفصلائٹ پریس آگرہ سے ۱۸۵۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی جس میں مختلف فرقوں؛ گوجروں "رواؤں" چودھریوں اور مسلمانوں کو بدامنی کے لئے بڑی حد تک ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ پھر مسلمانوں اور ہندوؤں کی وفاداری کا ذکر بھی ہے۔ وہ قیام امن کے لیے بجنور کے کلکٹر الیگزنڈر شیکسپیر اور دیگر افسران کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ایک فہرست ستائیس ہندو، چوبیس مسلمان اہلکاروں اور چھ انگریز حکام کی شاملِ کتاب ہے۔ سرکشی ضلع بجنور کو ڈاکٹر معین الحق سابق پروفیسر شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے سلمان اکیڈیمی کراچی سے سرسید کے حالات زندگی اور حواشی کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ شرافت حسین مرزا نے ۱۹۶۳ء میں مع مبسوط مقدمہ اور ضمیموں کے ندوۃ المصنفین الجمعیۃ پریس دہلی سے چھاپا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "ہسٹری آف بجنور ریبلین" کے نام سے حفیظ ملک اور ہورلیس ڈیکورنے کیا اور ادارۂ ادبیات دہلی سے ۱۹۸۲ء میں چھپوایا، جس میں مترجمین نے سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پسندانہ انداز میں بیان کیا۔ اس کتاب سے نہ صرف سید احمد خاں کا سیاسی موقف منظر عام پر آیا بلکہ وہ اسباب بھی جنکی بناء پر انھوں نے انگریزی حکومت کی طرفداری کی تھی اور اس کی افادیت و معقولیت کا جواز فراہم کیا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا: یہ خیال ترک کر دینا چاہیئے کہ انگریز یہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اور ہمیں ان سے وفاداری کا ثبوت دے کر گذشتہ غلطیوں کی تلافی کر لینی چاہیئے۔ انھوں نے انگریز حکام کو بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمان مذہباً اہلِ کتاب کے خلاف نہیں جا سکتے اور باغیوں میں سب ہی باشندے شامل تھے۔

سید احمد خاں نے اس کے اختتامیہ میں اپنے ہم وطنوں کو باخبر رہنے، زمانہ کے ساتھ چلنے اور آیندہ زندگی کے بارے میں معروضی انداز میں سوچنے کی دعوت دی۔ اس تصنیف سے کچھ انگریزوں کو گمان ہوا کہ مصنف میں تخریب کاری کا رجحان ہے لیکن سنجیدہ حکام نے اس کی روشنی میں اپنی پالیسیوں پر نظرثانی بھی کی۔

رسالہ اسباب بغاوت ھند:

رسالہ اسباب بغاوت ہند[1] اور سرکشی ضلع بجنور دونوں کو سید احمد خاں نے تقریباً ساتھ ساتھ لکھا، انھوں نے اسباب بغاوتِ ہند کو اس وقت مکمل کیا جب وہ تبدیل ہو کر مراد آباد آئے اس لئے یہ ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ ان کو یقین تھا کہ انگریزوں سے بغاوت کے اسباب و محرکات کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے اس لئے صحیح صورت حال سے واقفیت ان کے شکوک کو بڑی حد تک دور کرے گی چنانچہ ۱۸۵۹ء میں جب "رسالہ اسباب بغاوتِ ھند" کی پانچ سو جلدیں چھپ کر آئیں تو انھوں نے چند نسخے اپنے پاس رکھ کر ایک حکومت ہند کو اور بقیہ کتابیں انگلستان بھیج دیں۔ دوستوں نے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے اس کا ذکر حالی نے کیا کہ

"ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سر سید کے دوست تھے انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں نہ ڈالو۔ سر سید نے کہا کہ میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر

---

[1] سید احمد خاں۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ مفصلا ئٹ گزٹ پریس۔ آگرہ ۱۸۵۹ء بعد کو اس کے بہت سے اردو ایڈیشن چھپے جن میں علی گڑھ سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور فوق کریمی نے شائع کیا۔

کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کیلئے مفید ہو۔ مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔" لہ

جب اس کتاب کے انگریزی ترجمے انڈیا آفس اور حکومت ہند کی طرف سے کروائے گئے اور اس پر کاؤنسل میں متعدد بار بحث ہوئی تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور بارٹل فریئر رکن کاؤنسل نے اسے حکومت کی خیر خواہی پر محمول کیا تو ایک اور رکن سسل بیڈن نے باغیانہ کہا۔ پھر ۱۸۷۳ء میں سید احمد خاں کے دو انگریز دوستوں سر آکلینڈ کالون اور جی ایف۔ آئی گراہم نے ترجمہ کیا جو سابقہ ترجموں سے بہتر اور مکمل تھا اور جب یہ برطانوی پارلیمان کے سامنے پیش ہوا تو بالعموم پسند کیا گیا اس پر انگلستان کے اخباروں نے تبصرے چھاپے جن میں سید احمد خاں کی سیاسی بصیرت کی تعریف اور ان کی تجاویز پر غور کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

سید احمد خاں کے نزدیک بغاوت کے خاص خاص محرکات میں ہندوستانیوں کی اعلیٰ مراتب میں عدم شمولیت ان کے رسم و رواج اور مذاق کے خلاف قوانین کی تشکیل اور حکومت برطانیہ کی اُن کے حالات و جذبات سے ناواقفیت تھی "رسالہ اسباب بغاوت ہند" میں مصنف کی پیش کردہ بہت سی تجاویز پر عمل درآمد ہوا۔ مثلاً سید احمد خاں کی تجویز پر ۱۸۶۱ء میں ہندوستانیوں کو قانون ساز مجلس (کاؤنسل) کا ممبر منتخب کیا گیا اور ۱۸۶۲ء کے اجلاس کاؤنسل میں پہلی بار مہاراجہ نریندر دیو (پٹیالہ) راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ دنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار بحیثیت رکن شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے نہ ملنے کی بھی شکایت کی تھی تو ۱۸۶۲ء میں پہلی بار شمبھوناتھ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

اس رسالے کے متعلق خود سید احمد خاں نے جو رائے زنی کی وہ خالی از دلچسپی نہیں کہ

"ہنوز سیاہ تہلکے ایام غدر جاری تھیں کہ میں نے ایک رسالہ قوم کی بے گناہی کا لکھا

لہ خواجہ الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء صفحہ ۸۶

جو کازز آف انڈین ریوولٹ کے نام سے موسوم تھا۔ ۔ ۔ ۔ یہ میرا پہلا سبق قومی ہمدردی کا تھا۔ ہمیں اصلی سبب جاننے چاہیئے کہ قوم پر یہ مصیبت کیوں پڑی اور کیوں کر دور ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہ تھی اور انگریزوں میں اتحاد تھا۔[1]

لائل محمڈنز آف انڈیا:

لائل محمڈنز آف انڈیا[2] (رسالہ خیر خواہان مسلمانان ہند) کو سید احمد خاں نے انگریزوں سے باہمی منافرت کی خلیج کو پاٹنے اور مسلمانوں پر عائد کردہ الزامات رفع کرنے کیلئے اس ششماہی رسالہ کو ۱۸۶۰ء جاری کیا اور تیسرے شمارہ کے بعد ۱۸۶۱ء میں اس کی اشاعت بند ہو گئی! انھوں نے اس کے پہلے شمارہ میں اپنے موقف کا اظہار کیا کہ

"اگرچہ کچھ کچھ حالات غدر کے کھلتے گئے ہیں روز بروز اور بھی کھلتے جاویں گے اور جب اصلی حالت بالکل روشن ہو جاوے گی تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کے لیے دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جاویں گی۔"[3]

اس رسالہ میں ایسے بائیس خیر خواہوں کے حالات درج ہیں جنھوں نے قربانیاں دے کر حکومت سے وفاداری کی۔ اس فہرست میں سب سے پہلے انھوں نے اپنا حال مفصل اور مدلل طریقے پر لکھا اور ثابت کیا کہ ہنگامہ کی کوئی مذہبی حیثیت نہ تھی اور اس پر جہاد کا اطلاق نہیں ہوتا تھا دوسرے شمارے میں اس خیال کی حمایت میں انھوں نے جہاد کے اسلامی تصور کی وضاحت اور عیسائیوں کو اہل کتاب

---

[1] مقالات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۸۳ء ص ۸۵ تا ۸۶

[2] سید احمد خاں کے رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا (رسالہ خیر خواہان مسلمانان ہند) کا پہلا اور دوسرا شمارہ ۱۸۶۰ء میں اور تیسرا ۱۸۶۱ء میں مفصلائٹ پریس میرٹھ سے شایع ہوا تینوں کے صفحات کی تعداد دو سو تہتر (۹۱+۱۰۰+۸۲) ہے۔ پہلے شمارہ میں اردو انگریزی زبانوں میں متوازی کالم کے اندر اپنے علاوہ بارہ خیر خواہوں کا حال لکھا ہے: ذکریا خاں، عبداللہ خاں، علی محمد خاں، محب اللہ خاں، سیف اللہ، اللہ یار خاں محمد خاں، عبدالکریم، سید نور، غلام ضامن محمد حسین، شیخ شرف الدین پھر دوسرے میں امام الدین، نواب نبی بخش، شیخ خیرالدین اور تیسرے شمارے میں تاج الدین، سید تراب علی، شیخ امیر علی، بدرالدین، عبدالغنی اور محمد ابراہیم خاں کی تفصیل درج ہے۔

[3] سید احمد خاں۔ لائل محمڈنز آف انڈیا۔ مفصلائٹ پریس میرٹھ ۱۸۶۰ء شمارہ ۱ ص ۱

ہونے کی وجہ سے برادرانہ سلوک کا مستحق قرار دیا۔ اسی شمارے کے آخری صفحہ پر سید احمد خاں نے ایک اشتہار میں حکومت کا ساتھ دینے والے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے حالات بھیجدیں تو ان کو آئندہ شمارے میں چھاپ دیا جائے گا لیکن کم لوگوں نے اس پر عمل کیا۔ تیسرے شمارہ میں لان سیلارٹ ایڈیسن کی کتاب سے ایک معاہدہ نقل کیا گیا ہے جو پیغمبرِ اسلام اور عیسائیوں کے مابین مدینہ میں ہوا تھا۔ جس کی رو سے دونوں مذاہب کے درمیان باہمی میل جول، اقتصادی ہم آہنگی اور مذہبی آزادی کا تحفظ کیا گیا تھا[1]۔ اس کے علاوہ موصول شدہ حالاتِ اشخاص معہ خطوط اور سرٹیفکٹ درج کئے ہیں۔ "لائل محمڈنز آف انڈیا" کے تینوں شماروں میں انھوں نے قرآن اور احادیث کے حوالے سے عیسائیوں اور مسلمانوں میں مذہبی سطح پر اخوت کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔

"سرکشی ضلع بجنور" ہو یا "رسالہ اسباب بغاوت ہند"، یا ان کی کوئی اور سیاسی تحریر سب مدافعانہ ہیں جن میں ہندوستانیوں کی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ اس وقت کے حالات کو قرار دیا گیا ہے اور پھر ایسے تکلیف دہ واقعات کا ذکر ہے جن کی بناء پر ہنگامہ کے ذمہ دار انگریز حکام تھے۔ اس تحلیل سے سید احمد خاں کے سیاسی تدبر، اخلاقی جرأت اور حبِ قومی کا اندازہ ہو جاتا ہے ان کا طریقۂ کار تجزیاتی اور اندازِ بیان مدلل ہے۔

ہندوستانیوں اور انگریزوں کو قریب لانے کے لئے انھوں نے کئی انجمنیں قایم کیں جن میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" (۱۸۶۶ء) "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" (۱۸۸۸ء) اور "ڈفنس ایسوسی ایشن" (۱۸۹۳ء) قابلِ ذکر ہیں۔

سید احمد خاں کی فکر کے منابع اور ان کی کوششوں کا رخ سمجھنے کے لئے ان سیاسی حالات پر نظر ڈالنی ضروری ہے جنھوں نے قوم کو تنزل اور ادبار کی اس منزل تک پہنچا دیا تھا! انھوں نے خود حالات کا جائزہ لیا اور انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت سے اس لئے انکار نہیں کیا کہ وہ قومی جد و جہد کے خلاف تھے بلکہ ان کے خیال میں مسلمان

1) LAUNCELOT ADDISON : THE FIRST STATE OF MAHOMEDANISM.

IMPRIMATURE .GEO. THORP., L697.

تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے ابھی تیار نہیں تھے کہ سیاست میں عملی حصہ لے سکیں۔

"جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری ترقی ہو گی میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کو اور صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔ ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیئے وہ یہ کہ ہم پولٹیکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں کم ہیں۔ پس ہم کو اپنی قوم کی تعلیم پر کوشش کرنی چاہیئے"[1]

وہ قوم کی توجہ تعلیم پر مرکوز رکھنا چاہتے تھے تاکہ پہلے وہ علم حاصل کر کے مضبوط بن سکیں پھر بعد کو سیاسی حقوق طلبی کی مہم میں شریک ہوں۔

ان کے سیاسی رویہ میں ملک کی ترقی کے لئے ہندو مسلم اتحاد لازم و ملزوم تھا اسی بنیاد پر وہ سرزمین ہند کے رہنے والوں کو ایک زنجیر کی کڑیوں سے تعبیر کرتے ہیں:

"ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں، مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں عادتیں لے لیں یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔ درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بہ اعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے"[2]

پھر وہ "قوم" کی تشریح کرتے ہوئے قوموں کی عادتوں اور طبیعتوں کا اختلاف ملک کی جغرافیائی خاصیت پر منحصر بتاتے ہیں:

"یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں گو ان میں دوسرے ملکوں کے لوگ بھی آکر بس جاتے ہیں، وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اے ہندو مسلمانو کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا

[1] تقریر سرسید احمد خاں، جلسہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء مرقع کانفرنس مرتبہ انوار احمد مارہروی مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۴

[2] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء ص، ۱۴۲

اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین پر تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ہی ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدہ میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیئے۔"[1]

وہ ہندو مسلم اتحاد و یک جہتی کے مظاہروں پر خوشی کا اظہار کرتے تھے وفات سے چند ماہ قبل انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۹۷ء میں بریلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی محبت کے مظاہرے پر انہوں نے طمانیت اور خوشی ظاہر کی کہ بقرعید پر مسلمانوں نے گائے نہیں کی بلکہ بھیڑ بکریوں کی قربانی کی اور محرم میں ہندوؤں نے سبیلیں لگائیں اور ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوئے۔

عصر حاضر کے نامور مورخین کے۔ ایم۔ پانیکر اور اچاریہ نریندر دیو نے تحقیق کے بعد سید احمد خاں کو ہندوستانی قومیت کا حامی، ہندو مسلمان یکجہتی کا قایل اور سچا محبّ وطن ثابت کیا ہے اور ان کے فرقہ پرست ہونے کی تردید کی ہے۔ جواہر لال نہرو کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ ان کا یہ فیصلہ کہ مسلمان سیاست سے دور رہ کر صرف مغربی تعلیم حاصل کرنے پر اپنی توجہ مبذول کریں بلاشبہ صحیح تھا۔

"تعلیم کے بغیر وہ جدید طرز کی ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں موثر ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ سرسید تاریخی اور نظریاتی اعتبار سے بورژوا نظام کے طرفدار نہیں تھے۔ ان کی سرگرمیاں اگرچہ اعتدال پسند تھیں لیکن وہ ایک عظیم انقلاب کی طرف رہنمائی کر رہی تھیں.... ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی بیداری یقیناً سرسید اور ان کی تحریک کی مرہون منت ہے"[2]

---

[1] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ۔ مرتبہ منشی سراج الدین ۱۸۹۰ء، کشمیری بازار لاہور ص ۱۷۹

[2] جواہر لال نہرو۔ خود نوشت۔ الائیڈ پبلشرز۔ نئی دہلی ۱۹۶۲ء صفحہ ۴۶۲

بیسویں صدی کی ابتداء میں ہی ایم اے او کالج کے اندر ذہین اور باہمت نوجوانوں کا ایک بڑا گروہ تیار ہو گیا جس نے انگریزی سرکار کی مخالفت کی۔ اس کا مظاہرہ ۱۹۰۳ء میں ایک خفیہ سوسائٹی کے قیام سے ہوا جس میں عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق شیروانی اور سید محمود پیش پیش تھے ان کے علاوہ اور طلباء بھی کانگریس سے ہمدردی رکھتے تھے حسرت موہانی نے جولائی ۱۹۰۳ء میں "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ سے جاری کیا۔ اس اردو ماہانہ جریدے نے قومیت پر مبنی سیاسی شعور کو مزید بیدار کیا۔ اس کے لکھنے والوں میں شیخ عبداللہ۔ قاضی تلمیذ حسین برکت اللہ خاں اور موسیٰ خاں قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی کانگریس سے اختلاف اور حکومت کی بے جا خوشامد پسندی کے خلاف آوازِ بلند کی۔ حسرت نے اظہارِ خیال کیا کہ اب وہ حالات نہیں رہے جو سرسید کے زمانہ میں تھے ہمیں عملی سیاست میں حصّہ لینے کی ضرورت ہے اور ۱۹۰۴ء کے بمبئی کانگریس اجلاس میں شرکت کے بعد اس کی مفصل روداد چھاپی اور اپنے مضمون "نیشنل کانگریس اور پولیٹیکل ایجی ٹیشن (مطبوعہ اردوئے معلیٰ ستمبر ۱۹۰۴ء) میں لکھا:

> "ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں جب کہ تعلیم یافتہ مسلمانانِ بمبئی، مدراس کی طرح شمالی ہندوستان کے مسلمان بھی کانگریس سے ہمدردی کا عملی اور اعلانیہ اظہار کرنے لگیں گے۔ اعلانیہ کا لفظ قابلِ لحاظ ہے اس لئے کہ دل ہی دل میں ہر ذی ہوش اور تعلیم یافتہ مسلمان کانگریس کے مقاصد سے متفق ہونے پر مجبور رہے۔"

سید محمود اور عبدالرحمٰن بجنوری نے بھی کانگریس اجلاس ۱۹۰۵ء میں شرکت کی۔ علی گڑھ میں ۵ رفروری ۱۹۰۶ء کو طلباء نے بال کشن گوکھلے کا پُرزور استقبال کیا۔ حسرت کانگریس کے گرم دَل سے تعلق رکھتے تھے! انھوں نے بال گنگادھر تلک کو اپنا قاید بنایا۔ اب ہندوستانی نوجوان ذہنی طور پر ایسے باشعور ہو گئے تھے کہ وہ ملک کی سیاست میں حوصلہ کے ساتھ قدم رکھ سکیں لہٰذا ایم اے او کالج میں ایسی تنظیمیں تشکیل پانے لگیں جن کا مقصد ملک کو آزاد کرانا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں طلباء نے پرنسپل بیک کی کالج میں بیجا مداخلت پر اسٹرائیک کیا۔ اطالیہ کے حملہ پر ترکوں کے ہاتھ سے طرابلس کا نکل جانا، جنگِ بلقان، کانپور مسجد

کے انہدام کی کوشش اور پہلی جنگِ عظیم کے ہولناک اثرات نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ سیاسی سرگرمیوں میں سید محمود، غلام حسین، عبدالرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، نثار احمد شیروانی، سید حسین، حسن شاہد سہروردی اور ایم اے خواجہ شامل تھے۔ ستیہ گرہ کرنے والے پہلے جتھے میں سید محمد ٹونکی، شفیق الرحمٰن عبدالرحمٰن بجنوری، امیر عالم اور سید علی شریک تھے۔ حسرت نے دفاعی مزاحمت کے طریقے کو بطور لائحۂ عمل پیش کیا اور قید با مشقت کی سزا پائی مگر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ عام کر دیا۔ انھوں نے بے خوف ہو کر کہا:

میں غلبۂ اعدا سے ڈرا ہوں نہ ڈروں گا
یہ حوصلہ بخشا ہے مجھے شیرِ خدا نے

انھوں نے کانگریس کے احمد آباد اجلاس ۱۹۲۱ء میں مکمل آزادی کی آواز پہلی بار اٹھائی ان کی سودیشی تحریک میں اولیت اس طرح مسلم ہے کہ انھوں نے علی گڑھ میں سودیشی اسٹور کھولا اور کھدر کے استعمال کو مروّج کیا۔

شوکت علی اور محمد علی جوہر نے "خلافت تحریک" میں آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ مہاتما گاندھی نے اس کی حمایت میں جب ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء کو یومِ خلافت منایا گیا تو "قیصرِ ہند" کا اپنا طلائی تمغہ حکومت کو واپس کر دیا اور علی برادران نے گاندھی جی کو اپنا رہنما تسلیم کیا۔ انھوں نے اپنے انگریز مخالف خیالات کو مشتہر کرنے کے لئے کامریڈ اور "ہمدرد" اخبارات کا سہارا لیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کا پردہ فاش کیا اور گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی آزادی کی مانگ پر زور طریقہ پر رکھی محمد علی جوہر نے سید احمد خاں سے مخاطب ہو کر کہا ؎

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا ۔۔۔ جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

علی گڑھ کے اولڈ بوائے راجہ مہندر پرتاپ سنگھ نے ملک سے باہر انقلابی تنظیم تیار کی۔ اسی طرح یہاں کے تربیت یافتہ سیف الدین کچلو، رفیع احمد قدوائی، ذاکر حسین، کشمیر کے شیخ عبداللہ اور بہت سے لوگوں نے حصولِ آزادی اور عصری سیاست میں عملی حصہ لیا اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

باب پنجم

تعلیم

- تعلیمی نظریات
- مدرستہ العلوم
- سائنٹی فک سوسائٹی
- آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
- تعلیمِ نسواں
- مستشرقین:

گارسین دتاسی، کرنل گراہم، طامس والکر آرنلڈ
تھیوڈر مارلیسن۔ والٹر الیگزنڈر ریلے۔
چارلس ایمبروز اسٹوری، سالم کرنکو، اوٹو اسپیس۔
کرسچین ڈبلیو ٹرال، ڈبلیو ڈلیلی ویلڈ

تعلیمی نظریات

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے مدارس و مکاتب ہندوستان میں موجود تھے۔ لیکن جدید انگریزی تعلیم اور مغربی علوم سے مسلمانوں کی کلی بے اعتنائی کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان انگریزی زبان اور مغربی تعلیم کے حصول کو دین کے لئے ایک خطرۂ مسلسل تصور کرتے تھے۔ علماء اور قائدینِ ملّت نے بھی انگریزی تعلیم کو ان کے لئے مضرت رساں قرار دیا جس کا ثبوت وہ عرضداشت ہے جو ۱۸۳۵ء میں آٹھ ہزار علماء کے دستخط کے ساتھ حکومت کو پیش کی گئی۔ جس میں کہا گیا کہ ہم مسلمان انگریزی تعلیم کے خواہاں نہیں۔[1]

اس کے برخلاف سید احمد خاں چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کی قدر اور اس کو باقی رکھنا چاہیئے مگر مغرب سے بھی بلا تامل فائدہ حاصل کرنے کی کوشش اور انگریزی زبان سیکھنی چاہیے کہ :

"مسلمانوں کو بھی یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت میں سمٹک زبانوں میں لاثانی ہے۔

اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاش ہماری بہتری، ہماری زندگی با آرام بسر کرنے کے ذریعے بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم

---

1) SYED MAHMOOD : A HISTORY OF ENGLISH EDUCATION IN INDIA, BAPTIST PRESS CALCUTTA AND SOLD BY M.A.O. COLLEGE PRESS, 1895 P. 51

کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہیئے"[1]

ان کے خیال میں انسان کی صلاحیتوں کو اُبھارنا تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کام کے لائق بنانا اس کی تربیت کرنا ہے۔

"انسان کی تعلیم درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں بلکہ دل کے سوتوں کو کھولنا اور ان کے سرچشمے کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے اور شگفتہ وشاداب کرنے سے نکلتا ہے اور انسان کو تربیت کرنا اس کے لئے سامان کا مُہیّا کرنا اور اس سے کام لینا ہے"[2]

وہ مختصر طور پر اس سلسلۂ تعلیم کا ذکر کرتے ہیں جو بالفعل ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج ہے اور سلسلۂ نظامیہ کہلاتا ہے "مقصود ہمارا اس کے بیان سے صرف اتنا ہے کہ لوگ اس بات پر غور کریں کہ بلحاظ حالات اور علوم مروجہ زمانۂ حال کے آیا یہ سلسلہ اور طریقہ درحقیقت کافی اور مفید ہے یا واقعی اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔[3]

انھوں نے وضاحت کی کہ علم کے معنی "جاننے" کے ہیں اور تعلیم کو افادی ہونا چاہیے:

"پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ تعصب کو چھوڑیں اور بعد تحقیقات اور مباحث کے سلسلۂ تعلیم مسلمانوں کا ایسا قائم کریں جو ان کے دین اور دنیا دونوں کے لئے مفید ہو"[4]

تعلیم سے ان کا مقصد قوم کی ذہنی سطح کو بلند کرنا اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا۔

---

[1] سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ مرتبہ سراج الدین بفرمائش فضل الدین تاجر کتب قومی بازار کشمیری۔ لاہور۔ ۱۸۹۰ء صفحہ ۱۸۴

[2] سرسید۔ مقالات سرسید مرتبہ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور حصہ ہفتم ۱۹۶۳ء ص ۱۲

[3] تہذیب الاخلاق ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ بمقام علی گڑھ ص ۶۸

[4] ؍؍ مقالات سرسید مرتبہ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور حصہ ہفتم ۱۹۶۳ء ص ۱۵

وہ مغربی تعلیم کو سائنسی علوم کے حصول کے لئے ضروری سمجھتے اور اس کے تجربی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

"ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس زمانے کے فلسفہ و حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربے سے ثابت کیے جاتے ہیں اور ہم کو دکھلائے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جو قیاسی دلائل سے اُٹھا دیئے جائیں۔"[1]

وہ ایسے نظام کے خواہاں تھے جو عوام کے لیے ہو تاکہ ہر ایک بچہ کو پڑھنے لکھنے کی سہولت میسر آسکے ان کی نظر میں انفرادی کے بجائے قومی تعلیم اہمیت رکھتی تھی۔

"جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے۔ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے۔ جب تک تمام شہر اس ہوا سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا کسی علم کے پڑھ لینے سے انسان تربیت یافتہ نہیں ہو جاتا جب تک کہ اس کے لیے ایک بہت بڑا گروہ اس کے ہم جنسوں کا جس میں اس کا میل جول ہو تربیت یافتہ موجود نہ ہو۔۔۔۔ پس خوب سمجھ لو کہ جو شخص قومی تعلیم و تربیت پر متوجہ نہ ہو گا۔ درحقیقت

---

[1] سرسید احمد خاں کے لیکچروں، کا مجموعہ مرتبہ سراج الدین بفرمائش فضل الدین تاجر کتب قومی بازار کشمیری۔ لاہور ۱۸۹۰ء ص ۲۸

اپنا اور اپنی اولاد کا نقصان کرے گا۔" [1]

اجتماعی اور قومی تعلیم کا تصور جو آج عام ہے اُن کے زمانے میں بالکل اجنبی اور نیا تھا لیکن انھوں نے بہت پہلے اس کی معنویت محسوس کر لی تھی۔

وہ مدرسوں اور کالجوں کی مروجہ تعلیم کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ کتابی اور روایتی ہوتی تھی۔ وہ ایسے مدارس کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں جو مفلس، محتاج اور نالائق بنانے کے بجائے انسان میں قومی، وطنی اور ملی شعور کی نشو و نما کر سکیں اور یہ صرف لائق اور صاحب کردار اساتذہ کی نگرانی میں ممکن ہے انھوں نے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کو راجہ رام موہن رائے اور ایشور چندر ودیا ساگر کی طرح پسند کیا:

"کمیٹی کا اجلاس، ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو منعقد ہوا لارڈ میکالے اس کمیٹی کے صدر بنائے گئے اس کے اراکین میں اختلاف رائے تھا۔ ایک فریق انگریزی زبان میں تعلیم دیئے جانے کا مخالف تھا تو دوسرا حامی تھا۔ جب رائے لی گئی تو دونوں فریق کے ووٹ برابر ہوئے تب لارڈ میکالے نے اپنا فیصلہ کن ووٹ انگریزی زبان کی تعلیم کی تائید میں دیا جس سے انگریزی کے اجراء کا فیصلہ ہو گیا۔" [2]

سید احمد خاں نے اس کی معقولیت کا جواز فراہم کیا:

"وہ شخص جو اپنی نیک دلی سے خدا کے بندوں پر نیکی کرنا چاہتا تھا اس امر میں گورنمنٹ سے مخالف تھا مگر بڑی بحث کے بعد وہ نیک بندہ یعنی لارڈ میکالے جیت گیا۔ میری دانست میں کوئی گورنر جنرل، کوئی وائسرائے کوئی ملک کا خیر خواہ ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان پر اور ہندوستانیوں پر احسان کیا ہو جس نے اس طرح کے استقلال اور ملک کی خیر خواہی، زور قلم اور سچی رائے سے

---

[1] سید طفیل احمد منگلوری۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل طبع اول ۱۹۳۷ء طبع پنجم مطبع علیمی دہلی ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۵

ثابت کر کے یہ طے کر دیا کہ انگریزی زبان اور یورپین سینسز (سائنس) کی ہندوستانیوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو۔ میں پنجاب کے لوگوں سے کہتا ہوں کہ اس کے احسان کو یاد رکھیں اور سوچیں کہ اس نے کہیں مفید چیز ہم کو دلادی اور لوگوں کو خود دیکھنا چاہیے کہ ان کی کیا چیز مفید اور کیا مضر ہے۔" [1]

سید احمد خاں نے تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑا۔ انھوں نے تعلیم اور انفرادی زندگی کے حوالے سے سماجی اور اقتصادی پہلو پر زور دیا اور اُسے معاشی بہبود کا ذریعہ قرار دیا۔ انھوں نے سرکاری ملازمتوں، اور حکومت کے دفاتر چلانے کے لیے بابو تیار کرنے پر قناعت کرنے کے بجائے تجارت اور دوسرے پیشوں کو ترجیح دی اور اُن کے حاصل کرنے کی ترغیب دلائی:

"ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملکوں میں آڑھت اور کمپنیاں قائم کریں جس سے اعلیٰ درجے کے تاجر ہوں۔ ملک کی پیداوار اور قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی ہیں اُن سے فائدہ اٹھائیں۔" [2]

ایجوکیشن کمیشن کے سامنے بحیثیت رکن دیئے گئے بیانات سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم (ہائیر ایجوکیشن) کے متمنی تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے دوسرے جلسے منعقدہ ۱۸۸۷ء لکھنؤ میں اعلیٰ انگریزی تعلیم کی ضرورت کی طرف وہ قوم کو یہ کہہ کر مائل کراتے ہیں کہ

"میں اس ریزولیوشن کے پاس ہونے کی تائید کرتا ہوں۔ کیا اب بھی کسی کو اس بات میں شبہ باقی ہے کہ ہماری قوم کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہائی ایجوکیشن ہے۔" [3]

---

[1] سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب مؤلفہ مولوی سید اقبال علی سب جج علی گڑھ۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۸۸۴ء ص ۲۵۱

[2] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ مولوی سراج الدین بقرمائش فضل الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء ص ۱۸۷

[3] ایضاً۔ ص ۲۵۳

جالندھر کے سفر کے دوران انھوں نے حکومت کے تعلیمی انتظام کے متعلق اظہارِ خیال کیا کہ:

"ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کا شکر گذار ہونا چاہیئے جس نے براہ مہربانی ہمارے لیے تعلیم کا بڑا بوجھ اس طرح سے اپنے اوپر اٹھا لیا ہے جس کی نظیر دُنیا میں نظر نہیں آئی۔ گورنمنٹ ہمارے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتی۔"[1]

ان کے خیال میں جب تک تعلیم کا بندوبست خود ہندوستانی اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس کا انتظام قابل تشفی نہیں ہوسکتا۔

"کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو۔ جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لے وے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔"

جب ۱۸۸۱ء میں اورینٹل کالج لاہور میں ڈاکٹر لیٹنر نے علوم مشرقیہ کی تعلیم فارسی اور اردو کے ذریعے حاصل کرنے کی سفارش کی تو سید احمد خاں نے اس کی پُرزور مخالفت کی کہ اس خیال کے افسر ہمیں پیچھے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ غلامی میں مبتلا رہیں۔

"پس پنجاب یونیورسٹی اگر قائم ہوجاوے تو ہمارے حق میں بجز اس کے کہ ہمارے اعلیٰ درجے کی یورپین تعلیم کو برباد کردے گی اور اس پالیسی پر عمل کرے جو ہماری برباد کرنے والی ہو اور کیا کرے گی؟ ۔۔۔۔ ہمارے لئے سیدھا راستہ کھلا ہے کہ جہاں تک ہوسکے یورپین لٹریچر اور یورپین سئینز میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ترقی کریں۔ جہاں تک ہوسکے یونیورسٹی کے سچے خطابات حاصل کریں اور جب اس سے بھی زیادہ ہمت ہو، آکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹی میں تعلیم کو جاویں اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں۔"[2]

---

[1] سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ علی گڑھ ۱۸۸۴ء ص ۲۵۳

[2] تہذیب الاخلاق مطبع انسٹی ٹیوٹ، باہتمام لالہ گلاب سنگھ علی گڑھ ۱۸۸۱ء ص ۱۲۷-۱۲۸

سفرِ انگلستان کے دوران انھوں نے وہاں کے کلچر اور تہذیب کا مطالعہ کیا۔ کیمبرج، آکسفورڈ کی اقامت گاہوں اور وہاں کے تعلیمی نظام کو دیکھا۔ اور اپنے ملک کی تعلیمی صورت حال سے موازنہ کیا۔ لندن ہی سے انھوں نے "التماس بخدمت اہل اسلام وحکامِ ہند درباب ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند" چھپوا کر بھیجی[۱] جس میں مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے روشناس ہونے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

ہندوستان واپس آکر سید احمد خاں نے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" (۱۸۷۰ء) قائم کی۔ اس سلسلے میں ایک انعامی مقابلہ بھی رکھا گیا جس میں ان مسائل سے بحث کی گئی کہ کیوں سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں عام طور پر مسلمان اپنے بچوں کو بھیجنے سے گریز کرتے ہیں؟ موصول مضامین کے پیشِ نظر کمیٹی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمان اپنے دینی احساس کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے برگشتہ ہیں اور یہ بھی کہ مروجہ تعلیم بڑی حد تک ناقص ہے۔ اور بالخصوص مسلمانوں کے حق میں سودمند نہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایک دارالعلوم قائم کیا جائے جہاں مغربی تعلیم کا انتظام ہو۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک التماس شایع ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ کچھ عرصے پہلے بہت سے قابل اور اعلیٰ ہمت مسلمانوں نے جمع ہو کر "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" بنائی جس کا کام یہ تھا کہ ان اسباب کی تحقیق کرے کہ دن بہ دن مسلمانوں میں دینی و دنیوی ترقی کیوں گھٹتی جا رہی ہے؟ اس کمیٹی کی بہت سی نشستیں ہوئیں جن میں مدرسہ کا منصوبہ بنایا گیا۔

> "دس فروری ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں سید محمود نے ایک نہایت کامل تجویز تعلیم علوم کی جو انھوں نے لندن ہی میں بہ صلاح وہاں کے لائق پروفیسروں اور عالموں نے مرتب کی تھی پیش کی۔"[۲]

---

[۱] التماس محسن الملک کو ارسال کیا لیکن محسن الملک لوگوں میں تقسیم کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ سرسید نے واپس آکر لوگوں میں اسے مشتہر کیا۔

[۲] مقالات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۲۰۰

کہ اس میں اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم دی جائے۔
اور مندرجہ ذیل علوم خاص طور پر پڑھائے جائیں گے۔

دینیات :۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، علم سیر، علم عقاید۔

علم ادب :۔ زباندانی وانشاء پردازی، اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور لاطینی، علم تاریخ
علم جغرافیہ، علم اخلاق، مینٹل سائنس، یعنی قوائے انسان، علم منطق، علم فلسفہ
علم سیاست یعنی اصول گورنمنٹ۔

علم ریاضیات :۔ علم حساب، علم جبر و مقابلہ، علم ہندسہ، فروعات اعلیٰ علم ریاضی کے۔

طبعیات :۔ علم سکون، علم حرکت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر، علم برق، علم
ہیئت، علم آواز، علم حرارت، نیچرل فلاسفی۔

علوم تعلیم خاص :۔ علم انجینری، حیوانیات، اناٹومی یعنی علم تشریح باٹنی یعنی علم نباتات،
جیالوجی یعنی علم طبقات الارض، مزالوجی یعنی علم جمادات کیمسٹری یا علم کیمیا۔

اس تعلیمی تجویز کو زیر عمل لانے کے لئے زر کثیر کی ضرورت تھی چنانچہ ۱۸۷۲ء میں ایک مجلس عمل میں آئی جس کا نام "خزینۃ البضاعۃ" (فنڈ کمیٹی) تھا جس میں یہ طے ہوا کہ مختلف شہروں اور دوسری اقوام سے بھی چندہ لیا جائے۔ اور جب تک اس قدر زر چندہ جمع نہ ہو جائے کہ اس سے مدرسہ قائم کیا جاسکے تو چندہ مانگنے کی کوشش بدستور جاری رہے گی فنڈ کمیٹی کے قوانین بنائے گئے۔ اس میں ملک کے باثر ۲۶ افراد شامل تھے۔ فنڈ کمیٹی کے سپرد مختلف کام تھے۔ مثلاً روپیہ جمع کرنا، سرمایہ کی حفاظت، جائیداد کی خرید اور اس کی آمدنی اور اخراجات کا حساب۔ مزید یہ کہ جس کام کے لئے جو رقم دی جائے، اسی کام میں صرف ہوگی۔

سید احمد خاں کی قائم کردہ کمیٹیاں جب اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئیں تو انھوں نے ۱۸۷۲ء میں ایک اعلان کے ذریعے یہ استفسار کیا کہ مدرسۃ العلوم کہاں قائم ہو؟ بالآخر کثرت رائے سے یہ قرار پایا کہ علی گڑھ میں مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے[1]

[1] انسٹی ٹیوٹ گزٹ جولائی ۱۸۷۳ء ص ۲۶۲ - ۲۶۳

انھوں نے علی گڑھ کو دوسرے شہروں پر ترجیح دینے کے مندرجہ اسباب بیان کیے کہ

"کثرت رائے ممبران کمیٹی سے یہ امر قطعی طے ہو چکا ہے کہ مجوزہ مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں بنایا جائے جو ضلع بہ نسبت خاص خاص اضلاع کے نہایت عمدہ موقع پر واقع ہے اور بذریعہ ریل کے پنجاب اور روہیلکھنڈ کے قریب ہے اور اسی سبب سے ضلع مذکور کو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادکاریوں کا گویا مرکز کہنا چاہیئے۔"[1]

مدرستہ العلوم کا مقصد اُن کے یہاں یہ تھا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کو پورا کرے گا اور تعلیم کے لئے دو حصے مقرر کئے جائیں گے۔ پہلا انگریزی (مغربی) جس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہوگی۔ دوسرا مشرقی (اورینٹل) جہاں تمام علوم اردو میں پڑھائے جائیں گے طالب علموں کو اختیار ہوگا کہ وہ جس حصہ تعلیم کو پسند کریں اس کا انتخاب کرسکتے ہیں ان کے علاوہ تیسرے حصے میں انگریزی اور اردو کے فارغ التحصیل طلبا کو ان کی خواہش کے مطابق عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم دی جائے گی۔ مدرستہ العلوم دو سطحوں میں منقسم ہوگا: مدرسہ یا اسکول اور کالج۔

مدرسہ یا اسکول کا نظام الگ ہوگا۔ اس کا تعلق کالج سے اتنا ہی ہوگا کہ وہ اس کی نگرانی کرے گا اور کمیٹی خزینۃ البضاعۃ اس کام کے لئے عمارتیں تعمیر کرے گی جن میں پڑھنے اور رہنے کے لئے کمرے ہوں گے۔ اس مدرسہ میں سکونت اختیار کرنا طالب علم کی مرضی پر منحصر ہوگا۔ سب سے ادنیٰ درجہ میں داخل ہونے والے بچہ کی عمر تخمیناً دس برس ہوگی اور پانچ گھنٹہ پڑھائی ہوگی اور پانچ برس تک تعلیم دی جائے گی اور ہر سال امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبا کو وظائف ملیں گے۔

---

[1] مسودہ خط سید احمد خاں سکریٹری مجلس خزینۃ البضاعۃ بنام سکریٹری گورنمنٹ مغربی د شمال بمقام نینی تال

اس مدرسہ کے طالب علم کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرنس (ہائی اسکول) امتحان میں شریک ہونگے۔ اس کا انتظام کمیٹی مدیران (انتظامی) کرے گی۔ سید محمود نے اپنے مضمون بعنوان "طریقۂ انتظام وسلسلہ تعلیم جس طرح پر مجوزہ مدرسۃ العلوم مسلمانان میں ہونا چاہیئے"، میں کہا کہ ابتدائی تعلیم مندرجہ ذیل علوم پر مشتمل ہوگی۔[1]

(الف) فارسی زبان، فارسی اور اردو کا علم انشاء۔ عربی زبان کی حیثیت اختیاری مضمون کی ہوگی۔

(ب) حساب

(ج) جبر ومقابلہ (الجبرا)

(د) ابتدائی اقلیدس

(ہ) تاریخ ہند

(و) جغرافیہ

(ز) انگریزی زبان انٹرنس کے معیار تک۔

(ح) ضروری کتب مذہب اہل سنت والجماعت اور مذہب شیعہ اثنا عشری۔

وظیفہ پانے والے طالب علم کا نتیجہ اگر خراب ہوگا تو مدرس مدیران کو اس کی اطلاع کر کے وظیفہ بند کروا سکتا ہے اس مدرسہ میں پانچ برس کی تعلیم کے بعد مدرسۃ العلوم کے داخلہ کے لئے ایک امتحان ہوگا جس میں کامیاب ہونے والے طالب علم ہی کو آگے داخلہ مل سکے گا۔

مدرسۃ العلوم یا کالج دو درجات پر مشتمل ہوگا۔ جس میں درجہ وسطی میں مختلف علوم کی تعلیم اور درجہ اعلیٰ میں صرف ایک ہی مضمون کی تدریس ہوگی۔ وسطی کی پڑھائی کا عرصہ چار برس ہوگا۔ مدرسۃ العلوم میں پڑھائی تین گھنٹہ ہوگی۔ دو برس بعد سالانہ امتحان ہونگے جن میں کامیابی کے بعد طالب علم کلکتہ سے ایف اے اور اس کے دو برس بعد بی اے کے امتحان میں شریک ہو سکتا ہے کمیٹی مدیران کالج کے امتحانات کا انتظام بھی کرے گی۔ چار برس کے امتحان (بی اے) کے بعد کامیاب ہونے والا طالب علم درجہ اعلیٰ میں جانے کا مجاز ہوگا۔ یہ کسی خاص علم کی مفاخرت (ایم اے) کیلئے

---

[1] روئداد اجلاس ممبران، منعقدہ ۱۰ فروری ۱۸۷۳ء، مطبوعہ تہذیب الاخلاق ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۳ء ص ۲۰۲

مقرر کیا گیا ہے۔ جس میں دو برس تک پڑھائی ہوگی۔ ایم اے کے امتحان کی درخواست کے ساتھ طالب علم کو ایک اپنا تصنیف کردہ رسالہ بھی پیش کرنا ہوگا جو اس نے اس علم کے کسی خاص مسئلہ پر لکھا ہو۔ ایم۔ اے کا امتحان دینے کی اجازت اس مقالہ کے منظور ہونے پر منحصر ہوگی۔ وظیفہ کا امتحان تین دن برابر ہوگا۔ پھر مدبران کمیٹی کے سامنے ممتحن طلباء کے نمبروں کی فہرست پیش کریں گے وظیفہ پانے والا رفیق (فیلو) مدرستہ العلوم کہلائے گا جو سات برس کے لئے ہوگا۔ رفیق کو چھ سو روپیہ سالانہ وظیفہ کے اور رہنے کے لئے علیحدہ کمرہ بھی مفت ملے گا۔

مدرستہ العلوم کے طلباء کے لئے مکانات (بورڈنگ ہاؤس) بنائے جائیں گے۔ ہر ایک کو عموماً الگ الگ کمرہ ملے گا۔ غریب طلباء کو جو اخراجات ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ سکونت سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ اقامت گاہ میں رہنے والے طلباء کو اختیار ہوگا کہ جیسا لباس چاہیں پہنیں۔ بس کپڑے اجلے صاف اور شریفانہ ہوں، کھانے، سونے اور جسمانی ورزش کے اوقات معین ہوں گے۔ طلباء اپنی مرضی کے موافق کمروں کو آراستہ کریں۔ اسباب ضرورت اور خورد و نوش کا علیحدہ انتظام بھی کر سکتے ہیں اور ایسا کمرہ بھی مل سکتا ہے جہاں وہ اکٹھا کھانا کھائیں۔

مدرستہ العلوم میں سکونت اختیار کرنے والوں کی تربیت پر خاص زور دیا جائے گا۔ انھیں مہذب گفتگو کے آداب سکھائے جائیں گے۔ سنّی و شیعہ طلباء کے لئے مسجد کے موذن اور امام بھی علیحدہ ہوں گے۔

علاج معالجہ کے لئے مدرسہ میں انگریزی اور یونانی اطبّاء کا انتظام کیا جائے گا۔ ان تمام قواعد کا نفاذ اور اہتمام (اتالیق) ٹیوٹر کے سپرد ہوگا۔ جو دن رات مدرسہ میں رہیگا۔ اور وہ ہر قسم کی اطلاع کمیٹی مدبران کو دے گا۔

ضرورت پڑنے پر طلباء کو فہمائش بھی کی جائے گی۔ متعدد خلاف ورزیوں کے بعد طالب علم کا اخراج بھی ممکن ہے۔ سید احمد خاں نے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۲ء کو جلسۂ انجمن اسلامیہ لاہور میں تعلیم مسلمانان کے متعلق تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"ایک گروہ مسلمانان نے جس گروہ کا میں خادم ہوں یہ تجویز کی ہے کہ ایک مدرسۃ العلوم مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کیمبرج اور آکسفورڈ کے نمونے پر قائم کیا جاوے جس میں علوم دینی و دنیاوی اور تمام وہ علوم جن کی تعلیم قومی ترقی اور قومی عزت کا باعث ہو تعلیم دیئے جاویں اور مسلمان لڑکوں کی تربیت کا طریقہ بھی جو تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے اس میں نہایت عمدگی سے ملحوظ رکھا جاوے۔"[1]

۲۵ فروری ۱۸۷۵ء کے اجلاس فنڈ کمیٹی منعقدہ بنارس نے ابتدائی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں مدرسہ کھولنا تجویز کیا اور مذکورہ بالا تجویز پر عمل درآمد کے لئے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸ مئی ۱۸۷۵ء میں ایک اشتہار شایع ہوا۔

"تمام لوگوں کی اطلاع کے لئے اس بات کا اشتہار دیا جاتا ہے کہ کمیٹی خزینۃ البضاعۃ للتاسیس مدرسۃ العلوم للمسلمین نے اس بات کو منظور کیا ہے کہ مدرسۃ العلوم مسلمانان کے متعلق مدرسہ تعلیم ابتدائی جس کا ذکر دفعہ ۸ سلسلہ تعلیم مدرسۃ العلوم میں مندرج ہے یکم جون ۱۸۷۵ء سے باہتمام جناب محمد سمیع اللہ خاں صاحب، سب آرڈی نیٹ جج علی گڑھ، کے بمقام علی گڑھ جاری کر دیا جاوے۔"[2]

---

[1] سرسید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ: مرتبہ مولوی سراج الدین بفرمائش فضل الدین کشمیری بازار لاہور۔ ۱۸۹۰ء ص ۹۳

[2] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸ مئی ۱۸۷۵ء ص ۲۸۴

مدرسۃ العلوم

مدرسۃ العلوم کی رسم افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ادا ہوئی (۱) اور ابتدائی تعلیم یکم جون ۱۸۷۵ء سے ان بنگلوں میں شروع ہوئی جو کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کی کوشش سے خریدے گئے تھے۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ

"سکریٹری نے اطلاع کی کہ حسب تجویز اجلاس منعقدہ ۲۴ ستمبر ۱۸۷۴ء تین قطعہ بنگلہ واقع علی گڑھ بہ قیمت پندرہ ہزار روپیہ کے خریدے گئے۔ بیع ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو رجسٹری ہو گیا۔ آٹھ ہزار روپیہ خزینۃ البضاعۃ نے اور سات ہزار کمیٹی علی گڑھ نے دیئے۔ چوتھا بنگلہ جو متصل واقع ہے اس کی خرید کا معاملہ بھی درپیش ہے۔ جب تک نئی عمارت مدرسہ کی تیار نہیں ہو گی تب تک انھیں مکانوں سے مدرسہ کا کام چلے گا۔"[۲]

اس سے ایک مہینہ قبل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک اعلان نامہ کے ذریعے خواہشمند استادوں سے اپیل کی کہ درخواست مع اسناد ۲۲ مئی ۱۸۷۵ء تک مولوی سمیع اللہ خاں کے پاس علی گڑھ بھیج دیں اس اشتہار میں مدرسین کے عہدے معہ تنخواہ مندرج تھے۔ یوروپین ہیڈ ماسٹر کو

---

[۱] مدرسۃ العلوم کی رسم افتتاح علی گڑھ چھاؤنی کے میس ہاؤس (واقع صاحب باغ) میں ادا کی گئی۔ یہ دن ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کا دن تھا۔

[۲] روداد اجلاس ممبران خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم المسلمین منعقدہ ۷ اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۳-۴۔

تنخواہ تین سو روپیہ ماہوار کے علاوہ مختلف بھتے بھی دیئے جائیں گے ۔[1] ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم کی رپورٹ بابت ہفت ماہ ۱۸۷۵ء دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع میں سات مدرسین کا تقرر ہوا جن کی فہرست حسب ذیل ہے ۔

نام عہدہ دار	عہدہ	کام پر آنے کی تاریخ	تنخواہ
(۱) ایچ۔جی۔آئی سڈنس	ہیڈ ماسٹر	۲۸ جون ۱۸۷۵ء	۳۰۰ روپے ماہوار
(۲) لالہ بیج ناتھ بی اے	سیکنڈ ماسٹر	۱۳ " " "	۱۲۰ روپیہ "
(۳) مولوی ابوالحسن	تھرڈ ماسٹر	" " "	۶۰ " "
(۴) مولوی محمد اکبر	سنی عربی مدرس	" " " "	" " "
(۵) مولوی سید جعفر علی	شیعہ " "	" " " "	" " "
(۶) مولوی بخت علی خاں	مدرس اول فارسی	" " " "	۲۰/= " "
(۷) مولوی عبدالرزاق	دوم " "	" " " "	" " "

اس مدرسہ میں داخل ہونے والا پہلا طالب علم مولوی سمیع اللہ خاں کا بیٹا محمد حمید اللہ خاں تھا ۔ بعد ازاں دو طلباء یعنی احسان اللہ جریا کوٹی اور ثناء الحق اعظم گڑھ سے آئے تھے ۔ پھر رفتہ رفتہ ہندوستان بھر سے طالب علم آنے لگے ۔ اس مدرسے کے دو صیغے تھے ۔ صیغۂ انگریزی میں تمام علوم کی تعلیم انگریزی زبان میں ہوتی تھی ۔ اور بطور دوسری زبان طالب علم کو عربی یا فارسی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تھا ۔ صیغۂ مشرقی میں عربی و فارسی کو اسی زبان میں پڑھایا جاتا تھا ۔ طالب علم کو اختیار تھا کہ وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور دینیات کی تدریس اردو زبان میں ہوتی تھی اور انگریزی دوسری زبان کی حیثیت سے لینی پڑتی تھی ۔ ہر ایک صیغہ تین درجوں پر منقسم تھا ۔ اسکول کلاس یعنی درجۂ ادنیٰ ۔ لوئر کالج کلاس یعنی درجۂ اوسط اور اپر کالج یعنی درجۂ اعلیٰ ۔[2]

---

[1] رپورٹ ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بابت اخیر ہفت ماہ ۱۸۷۵ء مطبوعہ میڈیکل ہال پریس بنارس ۱۸۷۶ ۔

۱۸۷۷ء میں صیغۂ دوم (عربی و فارسی) میں (۱۸) اٹھارہ لڑکے تعلیم حاصل کررہے تھے لیکن یہ تعداد گھٹتی چلی گئی۔ سید احمد خاں نے بحیثیت سکرٹیری یہ رپورٹ پیش کی کہ اس حصہ کی حالت کچھ قابل اطمینان نہیں ہے اس لیے نومبر ۱۸۸۵ء سے بند کردیا گیا۔

۱۸۷۵ء کی رپورٹ کے مطابق سات مہینے میں نواسی طالب علم مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے لیکن سالِ آخر میں ان کی تعداد چھیاسٹھ رہ گئی اگرچہ شروع میں نو جماعتیں قائم کرنے کی تجویز تھی۔ لیکن صرف چھ جماعتیں شروع کی جاسکیں[۱] دوسری جماعت میں ایک طالب علم، تیسری میں تین، چوتھی میں نو، پانچویں میں نو، چھٹی میں سترہ اور ساتویں میں ستائیس طالب علم تھے۔ ہر روز دس سے چار بجے تک درس و تدریس کا کام ہوتا۔ نماز اور کھانے کا وقفہ ایک سے دو بجے تک رہتا۔ جون ۱۸۷۵ء میں روزانہ اوسط حاضری تیئس رہی جولائی میں چالیس، اگست میں پچاس، ستمبر میں چوالیس نومبر میں باون (۲) دسمبر میں اٹھاون حالانکہ آخر ماہ میں لڑکے بہت کم آئے۔

ابتداء میں نصاب کے مطابق کتابیں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے غیر درسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ مدرسہ میں جتنے بھی طالب علم داخل کئے گئے سب فیس دیتے تھے۔ سب سے زیادہ فیس پانچ روپے اور سب سے کم چار آنے تھی۔ اگرچہ کمیٹی کی طرف سے طلبار کو کوئی وظیفہ نہیں ملتا تھا۔ لیکن نجی طور پر مختلف اصحاب وظیفہ دیتے تھے۔[۴]

---

[۱] ہیڈ ماسٹر کی رپورٹ ۲۹ مارچ ۱۸۷۶ء کے مطابق شہر میں رہنے والے لڑکے وقت پر نہیں آپاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ حال بہتر ہوتا گیا۔

[۲] ماہ نومبر میں رمضان کے باعث مدرسہ بند رہا۔

[۳] ماہ دسمبر میں ہیضہ کے باعث اوسط حاضری کم رہی۔

[۴]

	نام طالب علم	تاریخ	عطیہ دہندگان	رقم
۱	ادریس خاں	یکم جولائی ۱۸۷۵ء	سید اقبال علی	۴/-
۲	یعقوب شاہ	”	سید حامد علی	۵/-

سید احمد خاں کی نظر میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے علاوہ اگر ایشیاء کے کسی ملک کی تعلیمی میدان میں تقلید کی جا سکتی تھی تو وہ ترکی تھا اس لئے کہ وہ مغرب و مشرق کی بہترین روایات کا ایک عمدہ اور حسین امتزاج پیش کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مدرستہ العلوم کے طالب علموں کے لئے یونی فارم تجویز کیا تو اس میں ٹرکش کوٹ اور ترکی ٹوپی شامل تھی۔

اس مدرسہ کے معائنہ کے لئے مختلف اصحاب آتے رہے جن میں ولیم میور اور مہاراجہ پٹیالہ قابل ذکر ہیں۔

مدرسہ کی ابتداء کے ساتھ ہی ایک بورڈنگ ہاؤس بھی کھولا گیا۔ دوسرا بورڈنگ ہاؤس نومبر کے مہینے میں شروع ہوا۔ ان دونوں بورڈنگ ہاؤسوں کے وارڈن ابتداً مولوی ابوالحسن اور بعد میں محمد اکبر ہوئے[1]۔ یہ اقامت گاہ مدرسہ سے متصل تھی۔ رہنے کے لئے علیحدہ علیحدہ کمروں کا انتظام تھا۔ صفائی اور دیگر کاموں کے لئے ملازمین مقرر تھے۔ یہ اقامت گاہ تین حصوں پر مشتمل تھیں۔ فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ۔ ان میں مختلف حیثیتوں کے طلباء رہتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں تھرڈ کلاس توڑ دی گئی اور تخصیص ختم کر کے ۱۸۸۵ء میں تمام اقامت گاہوں کو ایک ہی میں ضم کر دیا گیا۔

(حاشیہ ص گزشتہ)

				رقم
۳۔	ابراہیم	یکم جولائی ۱۸۷۵ء	سید محمد احمد	۵/-
۴۔	احمد حسین	۱۰ر جولائی ″	خلیفہ محمد حسن خاں	۵/-
۵۔	محمد حسین	یکم اگست ″	مولوی زین العابدین	۵/-
۶۔	حبیب احمد	۵ر اگست ″	سید احمد خاں	۵/-
۷۔	عشرت حسین	۲۳ر اگست ″	کنور جوالا پرشاد	۵/-
۸۔	خواجہ وجیہ الدین	۲۰ر ستمبر ″	ہنر ہائی نس لچھمن رام پرشاد	۱/-
۹۔	شریعت اللہ	یکم نومبر ″	سید احمد خاں	۵/-

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جولائی ۱۸۷۵ء ص ۱۱۱

ان میں رہنے والے طلباء اوقات کے پابند ہوتے ۔ اوقاتِ طعام واستراحت مقرر تھے ۔ مذہبی پابندی کے لئے نماز کی حاضری، تراویح کا انتظام اور میلاد شریف بھی ہوا کرتے ۔ بڑے طلباء کے مقابلے میں چھوٹے بچوں کی خاص نگرانی کی جاتی ۔ نماز فجر اور تلاوت قرآن پاک کے بعد ورزش کرتے جس کے لئے مختلف کپنیاں بنی ہوئی تھیں ۔ صبح کے ناشتہ سے قبل طلباء اپنا آموختہ (اسٹڈی) کرتے ۔ اسکول کی پڑھائی نو بجے سے شروع ہو کر ظہر تک جاری رہتی کھانے کے بعد پھر مدرسہ کھلتا اور چار بجے تک تدریس ہوتی ۔ طلباء کی نگرانی کے لئے اساتذہ مقرر تھے ۔ اسی طرح ان کے لئے ایک پراکٹر یا منتظم بھی ہوتا جو طلباء کا محافظ کہلاتا تھا ۔

طالب علموں کے لئے ایک شفاخانہ کا بھی انتظام تھا ۔ یہ بورڈنگ ہاؤس ان خوابوں کی تعبیر تھا جو انھوں نے برطانیہ کی درسگاہوں میں دیکھے تھے ۔ دسمبر ۱۸۹۴ء میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

" مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس سے چھپی ہوئی ہے ۔ نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے ۔

اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے " کالج لائف " یا اقامتی زندگی " یہی اصل کتاب ہے اور اس کا پڑھنا اور سمجھنا اصل فائدہ اور اصل مقصد زندگی کا اور اس کالج کا ہے ۔ اس کتاب کو تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور رداغدار نہ کیا تو تمھاری آئندہ زندگی وہ ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہیئے ۔ ورنہ اس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہے " [1]

---

[1] سرسید تہذیب الاخلاق جلد اول شمارہ ۱ ۔ یکم رجب ۱۳۱۲ھ ص ۱۸۱ ۔ ۱۸۵ لیکچر جو دسمبر ۱۸۹۴ء کو سرسید نے مدرستہ العلوم کے طالب علموں کو دیا ۔

۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن نے ایم۔ اے۔ او کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر خزینۃ البضاعۃ کی پیش کردہ رپورٹ کو سید محمود نے وائسرائے ہند کے سامنے پڑھا اور کہا کہ اس جگہ پر کالج کا مرکزی ہال بنے گا جو سر اسٹریچی لفٹننٹ گورنر یوپی کے نام سے موسوم ہوگا جنھوں نے مختلف مواقع پر ہماری ہمت افزائی کی تھی پھر کالج کی توسیع کا منصوبہ پیش کیا۔ یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کی کلاسیں شروع ہوئیں۔

۱۸۷۷ء میں پہلی دفعہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے چار طلباء نے انٹرنس کے امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی سے شرکت کی۔ محبوب عالم نے امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اس پہلے کھیپ میں ایک ہندو طالب علم ہرناتھ سنگھ بھی شریک ہوا جو سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔

کالج کے انتظام کے لئے چار کمیٹیاں بنائی گئیں جن کے سپرد مختلف کام تھے۔

(۱) کمیٹی مدیرانِ تعلیم السنہ مختلفیہ وعلوم دنیویہ کی ہدایت اور رہنمائی پر مدرستہ العلوم کی ترقی منحصر تھی۔

(۲) کمیٹی مدیران تعلیم مذہب اہل سنت جماعت

(۳) ” ” ” ” ” شیعہ اثنا عشریہ

(۴) ” منتظم مدرستہ العلوم کے ہاتھ میں مدرستہ العلوم اور بورڈنگ ہاؤس کے اندرونی انتظام کا اختیار تھا۔

کمیٹی مدیران تعلیم السنہ مختلفیہ وعلوم دنیویہ کے صدر کے ڈپن، نائب صدر سید احمد خاں بہادر، معتمد (سکریٹری) مولوی سمیع اللہ خاں تھے۔ ایچ جی۔ آئی سڈنس، مولوی اکبر اور مولوی عباس حسین اوفیشل رکن تھے۔ دیگر ممبران میں ڈبلیو ایچ اسمتھ جان ایلیٹ، ایچ جی کیں، آکلینڈ کالون، نواب محمد ضیاء الدین احمد خاں درخشاں، مولوی عنایت رسول، منشی ذکاء اللہ، سید محمود، مولوی عبید اللہ عبیدی سید حسن کریم بخش، الطاف حسین حالی، محمد اسماعیل، چراغ علی، محمد حسین، خواجہ یوسف اور سید مہدی علی تھے۔ اس کمیٹی نے پہلا نصاب تیار کیا تھا۔

یکم جنوری ۱۸۸۰ء ہی سے ایف اے کلاسوں کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے
ہو گیا تھا اور جنوری ۱۸۸۱ء سے بی اے کی کلاسیں شروع ہوئیں تو ۳، مارچ ۱۸۸۱ء
کے اعلان نمبر ۹۹ (سیکشن ۲، ایکٹ ۲ ۱۸۵۷ء) کے مطابق گورنر جنرل کونسل نے
محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کا الحاق برائے بی اے یکم جنوری ۱۸۸۱ء سے کلکتہ یونیورسٹی
سے منظور کیا۔

۱۸۸۳ء میں تھیوڈور بیک[1] پرنسپل ہوئے جو کیمبرج یونیورسٹی کے گریجویٹ
تھے اور جنھیں سید محمود چھ سو روپے ماہوار مشاہرہ پر اپنے ساتھ انگلستان سے
لائے تھے۔ ان کے آنے کے بعد مسٹر سڈنس جو ۱۸۸۰ء سے کالج کے پرنسپل تھے مستعفی
ہو گئے اور ۱۸۸۰ء سے مسٹر لنبٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ ان کے بعد ۱۸۸۳ء
میں ہورسٹ ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے جو ۱۸۹۶ء تک رہے۔ اس زمانے
میں مندرجہ ذیل حضرات اسکول کے اساتذہ تھے۔

مسٹر ڈبلیو ہورسٹ (بی اے) اسکول ہیڈ ماسٹر

ولایت حسین بی اے اسکول کے سیکنڈ ماسٹر اور اس کے علاوہ اقامت گاہ
کے نگراں اور پراکٹر بھی تھے۔

سید کلن (ایم۔ اے) اسکول کے تیسرے ماسٹر، شیخ بہادر علی (ایم اے)
چوتھے، بابو انبا پرشاد پانچویں، سید ابو طالب (بی اے) چھٹے، سید عبد الباسط

---

[1] بیک ۱۸۸۳ء۔ ۱۸۹۹ء ایم اے او کالج کے پرنسپل رہے۔ ان کے بعد ماریسن ہوئے جو
۱۹۰۵ء تک رہے۔ آرچ بولڈ پرنسپل ۱۲ر اکتوبر کو ہوئے اور اکتوبر ۱۹۰۹ء تک رہے
پروفیسر ٹول ۱۳، اکتوبر ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء تک پرنسپل رہے۔ ان کے جانے
کے بعد ڈاکٹر ولی محمد نے عارضی طور پر پرنسپل کی ذمہ داری اسی سال مارچ سے جون تک
سنبھالی۔ پھر ڈاکٹر ضیاء الدین ۷، دسمبر ۱۹۲۰ء تک پرنسپل ہوئے۔

ساتویں، منشی الطاف حسین آٹھویں، منشی محمد سلیم نویں، قمر علی ایکسٹرا ماسٹر اس
کے علاوہ خلیل احمد عربی، بخف علی فارسی اور پنڈت کیدار ناتھ ہندی کے مدرسین
تھے۔ کالج میں اس دور کے اساتذہ حسب ذیل تھے۔

ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ۔	فلسفہ کے پروفیسر
ٹی ہارلیسن	انگریزی کے پروفیسر
ایلی ٹپنگ	انگریزی کے علاوہ تاریخ کے پروفیسر
سید کرامت حسین	قانون کے پروفیسر
بابو جادو چند چکرورتی	ریاضی کے پروفیسر
ضیاء الدین	ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر
شبلی نعمانی	عربی کے پروفیسر
سید عباس حسین	فارسی کے پروفیسر
پنڈت شوشنکر ترپاٹھی	سنسکرت کے پروفیسر

اور نذیر احمد کالج لائبریری کے نگراں تھے۔

نصاب کے علاوہ طلبا کی معلومات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے علماء کے توسیعی
خطبات EXTENSION LECTURES بھی مختلف موضوعات پر کرائے جاتے لیکن اس تجویز
پر باقاعدگی سے عمل نہ کیا جا سکا۔ اکثر و بیشتر اس کی تجدید معروف اور ذی قدر شخصیت
کی آمد پر ہو جایا کرتی تھی۔

طلباء کی ہمت افزائی کے لیے اچھے نمبر حاصل کرنے پر بطور انعام کتابیں ملتی تھیں
اسکول کی بڑی جماعتوں اور کالج کے تمام درجات میں طلباء کو وظائف بھی دیئے جاتے
تھے انٹرمیجیٹ اور بی اے کے پہلے سالوں میں جونیئر اور سینیئر وظائف مقرر تھے اور
ہال میں ان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جاتا۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں سب سے
زیادہ نمبر پانے والے اور مضمون نگاری کے مقابلے میں اول آنے پر طلباء کو طلائی

اور نقرئی تمغات دیئے جاتے۔ اور بہترین مقرر کو ایک بڑا اعزاز پروفیسر ہیرالڈ ایوارڈ دیا جاتا تھا[1]

طلباء کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی نشو ونما کے لیے مختلف کھیلوں کے کلب بنے ہوئے تھے۔ جہاں وہ مختلف صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے۔ ہندوستانی نیز غیر ہندوستانی اساتذہ کی نگرانی میں وہ ادبی ذوق کے علاوہ فٹ بال، کرکٹ، گھوڑ سواری، جمناسٹک، بنوٹ لان ٹینس میں مہارت پیدا کرتے۔

سٹڈنس یونین کلب ۱۸۸۴ء میں قائم ہوا۔ اس کو پرنسپل جی ایچ بی سٹڈنس کے نام سے موسوم کیا گیا[2] جس میں مباحثے اور مختلف قسم کے جلسے منعقد ہوتے۔ کالج کا پرنسپل ہی کلب کا صدر ہوتا تھا۔ مقرر طلباء اس کے نائب صدر اور معتمد ہوتے جن کا انتخاب ہر سال عمل میں آتا تھا مگر ان استاد بحیثیت خزانچی کا عہدہ دو سال کے لئے ہوا کرتا تھا۔ یونین کی موجودہ عمارت "رام پور حامد ہال" کے نام سے ۱۹۰۵ء میں تعمیر ہوئی۔

اس کلب میں ایک کتب خانہ بھی ہوتا۔ جہاں اخبارات ور سائل طلباء کے مطالعہ کے لئے منگائے جاتے ان میں ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک کے جرائد بھی شامل تھے۔ اس کتب خانے میں اسلامیات، ادبیات، تاریخ، طب اور سیاست سے متعلق بالخصوص کتابیں تھیں جو فرصت کے اوقات میں طلباء پڑھتے مختلف زبانوں میں مہارت پیدا کرنے کے لئے بہت سی انجمنیں بھی تھیں۔ جہاں طلباء زبان پر عبور حاصل کرتے۔ اس قسم کی ایک جماعت کا نام "بجنۃ الادب" تھا جو عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت کیلئے وجود میں آئی تھی اس کے اراکین عربی میں گفتگو اور لکھنے کی مہارت پیدا کرتے۔ جدید عربی زبان کے مختلف اخبارات بھی منگائے جاتے مثلاً ثمرات الفنون طرابلس[3] الہلال[4] ترجمان حقیقت۔

---

[1] مسٹر ہیرالڈ کاکس مدرستہ العلوم میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ [2] یہی کلب یونیورسٹی کی تشکیل کے بعد ۱۹۲۱ء میں اسٹوڈنٹس یونین کے نام سے موسوم ہوا۔ [3] یہ ہفتہ وار شام سے نکلتا تھا۔ [4] بصرہ کی مشہور زنانہ انجمن کے نام پر اس کا نام رکھا گیا تھا جو سو سال قبل قائم ہوئی تھی۔

"اخوان الصفا انجمن آپس میں برادرانہ سلوک و تعلقات قائم کرنے اور علمی لیاقت کے فروغ کے لئے قائم ہوئی جس میں باہمی تعلقات کے پیش نظر دعوتیں ہوتیں علمی مضامین پڑھے جاتے۔ ان پر بحث و مباحثے ہوتے اور نئی اردو کتابوں پر نقد و تبصرہ بھی ہوتا۔ اس کے اراکین سے کوئی چندہ نہیں لیا جاتا۔ لیکن مہینہ میں ایک مرتبہ ہر رکن کو ایک مضمون پڑھنا ہوتا۔ اراکین اس کے مضمون پر سوال و جواب کرتے۔ ہر مہینے ہونے والے جلسے میں ممبر کو اعلیٰ معیار کی کسی ایک کتاب کی تفصیل پیش کرنی ہوتی جو اس نے اس عرصہ میں پڑھی تھی۔ اخوان الصفا کے صدر پروفیسر آرنلڈ اور معتمد مولوی شبلی نعمانی کی کاوشوں سے ایک فرہنگ بھی لکھی گئی جس میں نئے عربی الفاظ کے مترادف قدیم عربی الفاظ درج تھے"[1]

نومبر ۱۸۹۰ء میں "انجمن الفرض" (ڈیوٹی سوسائٹی) کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی جس کا بنیادی مقصد مادر درسگاہ کی خدمت تھا۔ اس کے سرگرم اراکین اس کے لیے چندہ فراہم کرتے۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کے سپرد اس کا حساب و کتاب تھا۔ چار سال کے عرصے میں پانچ ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔ اس انجمن کے تحت چار کمیٹیاں تھیں۔

(۱) کمیٹی اسکالرشپ
(۲) بورڈنگ ہاؤس کمیٹی
(۳) کمیٹی تجارت
(۴) کمیٹی مسجد

ان تمام کمیٹیوں کے نگراں "معیان الفرض" کہلاتے تھے۔ شروع میں مندرجہ ذیل اشخاص شامل تھے۔

مسٹر ماریسن، مسٹر ہورسٹ، سمیع اللہ خاں، مشتاق حسین، ولایت اللہ، سجاد حیدر یلدرم، محمد اسحاق، بشیر مرزا۔ "خدام الفرض" میں مندرجہ ذیل اشخاص خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---

[1] افتخار عالم۔ مدرسہ کی ہسٹری۔ مطبع مفید عام۔ آگرہ، سنہ ۱۹۰۱ء ص ۱۶۷

پروفیسر آرنلڈ، آفتاب احمد خاں، طفیل احمد، مصطفٰے خاں، محمد عنایت اللہ، سید جعفر حسین لکھنوی، خوشی محمد ناظر، ممتاز حسین، نذیر احمد، زین الدین اور شیخ عبد اللہ۔

انگریزی زبان کا ذوق و شوق بڑھانے کے لئے ایک کلب بھی قائم ہوا۔ جو انٹر نسی ڈبیٹنگ کلب "کے نام سے موسوم تھا چونکہ سید احمد خاں کے مدرستہ العلوم کا بنیادی مقصد انگریزی تعلیم تھا۔ اس لئے اس جانب طلباء اور اساتذہ زیادہ متوجہ ہوتے۔ ۱۸۹۲ء میں قائم ہونے والے اس کلب میں مضمون نویسی کے مقابلے ہوتے۔ اسکول کا ایک کمرہ جس میں انگریزی اخبارات آتے اس کلب کا کتب خانہ تھا۔ جہاں ابتداء میں تقریباً ۲۵۲ کتابیں تھیں۔ اس کے اراکین سے انگریزی میں گفتگو کرنے پر اصرار کیا جاتا لہذا وراردو بولنے والوں پر جرمانہ ہوتا ہے۔ میر ولایت حسین سیکنڈ ماسٹر مدرستہ العلوم اس کے صدر تھے۔

سٹڈنس یونین کلب کے زیر اثر محمڈن اورنیٹل کالج میگزین ۱۸۹۱ء سے نکلتا تھا۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہر مہینے کالج کے تمام حالات، جلسوں کی روودادیں، کھیل کی سرگرمیاں اور طلباء کے اعزازات و امتیازات جو انھیں وقتاً فوقتاً ملتے، شایع کیے جاتے۔ ملک کے مسلمان مدرستہ العلوم کے حالات اور رفتار ترقی سے واقف ہوتے۔ ابتداً یہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر نکلتا لیکن کچھ عرصہ کے بعد مئی ۱۸۹۴ء سے باقاعدہ طور پر علیحدہ میگزین کی شکل میں نکلنے لگا۔

۱۸۹۲ء میں ایک انجمن برادر ہڈ یا الاخوۃ (اولڈ بوائز) کے نام سے قائم ہوئی اس کے مقاصد بھی انجمن الفرض سے خاصے مطابقت رکھتے تھے۔ اس کا سکریٹری کالج کا پروفیسر ہوتا تھا۔ ہر سال مارچ کے مہینے میں اس کا سالانہ جلسہ ہوتا۔ اس انجمن کا مقصد باہمی چندہ سے کالج کی مالی حالت درست کرنا تھا۔ اور پرانے طلباء سے کالج کا تعلق باقی رکھنا یہ گویا "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" کی ابتدائی شکل تھی۔

کالج کی مختلف روودادوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمڈن اینگلو

اورینٹل کالج میں مختلف سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے جن میں سے آٹھ تاریخی حیثیت کے حامل تھے۔

(۱) کالج فاؤنڈیشن میٹنگ: ۳۰ دسمبر کو مدرستہ العلوم کی اروز تاسیس تھی۔ اس یادگار موقع پر شام میں ایک ضیافت ہوتی

(۲) پرائز اینول میٹنگ: طلباء کو انعامات وتمغات دینے کے لئے منعقد کی جاتی تھی۔

(۳) برادر ہڈ ڈنر: انجمن الاخوۃ کی جانب سے ماہ مارچ میں ایک دعوت ہوتی۔

(۴) اینورسری سٹڈنس یونین کلب: معہ ایوننگ پارٹی، کلب مذکور کے اول قایم ہونے کی یاد میں یہ جلسہ ہوتا۔

(۵) محفل میلاد شریف: یہ بارہ ربیع الاول کو ہوتا اگر تعطیل گرما واقع ہو جاتیں تو کالج کھلنے پر منعقد ہوتا تھا۔

(۶) جلسہ ختم قرآن شریف: یہ جلسہ ماہ رمضان میں ہوتا۔

(۷) اتھلیٹک اسپورٹس: نومبر میں ۲ دو دن تک ہوتے

(۸) اینول میٹنگ ڈیوٹی: سالانہ تعطیل موسم سرما سے قبل انجمن الفرض کا جلسہ ہوتا اور اسی تعطیلات کے دوران چندہ جمع کرنے کی ہدایت دی جاتی۔

کھیل کود اور ورزش کے لئے طلباء کی ہمت افزائی کی جاتی۔ خصوصیت کے ساتھ کرکٹ کا ذوق وشوق طلباء میں کالج کی ابتداء ہی سے موجود تھا۔ اس کی مشق بھی کرائی جاتی۔ اینگلو اورینٹل کالج کی کارگزاریوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ طلباء کرکٹ میں پنجاب اور شمالی ہندوستان کے کالجوں سے سبقت لے جایا کرتے انگریزوں اور فوجی افسروں سے بھی طلبائے علی گڑھ میچ جیت لیا کرتے۔ جمنا سٹک میں بھی ان کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ فٹ بال کا شوق علی گڑھ کے طالب علموں کو اتنا تھا کہ ان کی ٹیم ہندوستان بھر میں مشہور تھی۔ مختلف قسم کے کھیلوں کے علاوہ طلباء کو انگریزی

طریقے پر فوجی تربیت بھی دی جاتی۔ اتوار کے روز پریڈ ہوا کرتی۔ فوجی تربیت اور قواعد سیکھنے کے بعد سارٹی فیکیٹ بھی دیئے جاتے فوجی تربیت دینے کے لئے ایک شخص کمانڈر ان چیف ہوتا۔ یہ تربیت مختلف ٹکڑیوں میں دی جاتی جو اسکوائڈ کہلاتیں۔ ہر اسکوائڈ کا ایک لفٹنٹ ہوتا اور تمام لفٹنٹ پر ایک کپتان مقرر کیا جاتا۔ یہ لوگ طلباء میں سے چنے جاتے۔

گھوڑسواری اور نیزہ بازی کی تربیت بھی دی جاتی۔ گھوڑسواری کے لئے رائڈنگ اسکول ۱۸۹۳ء سے تھا جس میں گھوڑے اور جملہ سامان فراہم تھے۔ اس میں فیس داخلہ پانچ روپیہ تھی۔ اس میں طلباء کو انعامات بھی دیئے جاتے۔

سید احمد خاں نے اس مدرسہ کی ابتدا سے ہی وضاحت کر دی تھی کہ اگرچہ یہ مسلمانوں کا ادارہ ہے لیکن یہاں تحصیلِ علم کے لئے ہندو مسلمان طالب علموں میں تفریق نہ کی جائے گی اور ہر مذہب و ملت کے لیے یہاں کے دروازے کھلے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تعلیم پانے والے ہندو طلباء کو شروع ہی سے مساوی حقوق حاصل تھے۔ سید احمد خاں نے مدرستہ العلوم کی رپورٹ میں کہا تھا۔

> "اس وقت ہمارے کالج میں ۱۵۸ طالب علم داخل ہیں جن میں سے ۱۲۹ مسلمان ۲۷ ہندو اور ایک پارسی ہے اور ہندو مسلمان دونوں بورڈر بھی ہیں جس سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کے بانی . . .
>
> کا کبھی یہ خیال نہ تھا کہ اس کے علم کے فائدے کسی خاص فرقہ پر محدود رکھے اور جو روشنی انسانی ہمدردی کی ان کے دل میں ہے اس کو تعصب کے سیاہ دھبوں سے داغدار کرے۔"[1]

یہاں کا پہلا گریجویٹ ایشوری پرشاد تحصیل کھیر ضلع علی گڑھ کا رہنے والا تھا۔ نہ

---

[1] سید احمد خاں، رپورٹ ترقی تعلیم مدرستہ العلوم مسلمانان۔ واقع علی گڑھ ۱۸۷۷ء ص ۳

صرف طلباء بلکہ اساتذہ میں ہندو افراد شامل تھے مثلاً:

"ابنائی پرشاد، بھٹاچاریہ، برجموہن لال، بختاور لال، بینی دھر، پیارے لال، جادو چند چکرورتی، بھوانی چند چکرورتی، دانی رام، شیو شنکر کشن لال، پنڈت کیدار ناتھ، گوبند پرشاد، ماتا پرشاد، رام شنکر مصرا، ہرناتھ سنگھ وغیرہ[1]

پرنسپل کی سالانہ رپورٹ بابت ۹۹-۱۸۹۸ء میں اس طرف توجہ دلائی گئی کہ

"بانیٔ کالج کی وفات کو مناسب موقع سمجھ کر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کالج میں ایک مستقل انڈومنٹ (وقف) قائم ہو اور اس کے فوائد و اغراض کو زیادہ وسعت دی جائے۔ ہندوستان میں ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا ہماری علت غائی ہے اور جو فوائد اس قسم کی یونیورسٹی سے پیدا ہوں گے وہ اس قسم کے ہیں۔

(۱) اس کے ذریعے مسلمانوں کی قوم میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت ہوگی اور جس کے نہ ہونے سے وہ ملکی تمدنی اور دماغی ترقی میں اس درجہ پس ماندہ ہیں۔

(۲) ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان میں اس قسم کی اعلیٰ تعلیم رائج ہوگی جو موجودہ یونیورسٹی میں حاصل نہیں ہو سکی (۳) اس کے ذریعے سے علم کے بعض خاص شعبوں میں ترقی ہو سکے گی جس کو صرف محمڈن یونیورسٹی معقول طور پر ترقی دے سکتی ہے اور اس طرح اس کے ذریعے اسلام کی تہذیب اور شائستگی کو اس قسم کی ترقی مل سکے گی جو عیسائی ممالک میں یورپ کی یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے ظہور میں آئی ہے۔"[2]

---

[1] یہ اساتذہ ۱۸۷۵ء تا ۱۸۹۵ء تک تدریس سے منسلک رہے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۰ء ص ۲

[2] رپورٹ پرنسپل، مدرستہ العلوم علی گڑھ بابت ۱۸۹۹ء مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی ص ۳-۱۶

ایم۔ اے۔ او کالج کو دسمبر ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس یونیورسٹی کی پہلی چانسلر فرمانروائے بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم تھیں اور اس کے پہلے وائس چانسلر علی محمد خاں راجہ محمود آباد اور پہلے رجسٹرار سجاد حیدر یلدرم مقرر ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کا پہلا کانوکیشن ۲۸ دسمبر ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ جس میں اس کی چانسلر ہز ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کو معلوم ہے کہ یہ یونیورسٹی جس کے پہلے کانوکیشن میں آج ہم سب شریک ہیں ہماری پنجاہ سالہ کوششوں کا ثمرہ ہے۔

جن ہمدردانِ قوم نے اس کی تاسیس و تکمیل میں کوششیں کی ہیں انھوں نے حقیقت میں ہماری قوم پر احسانِ عظیم کیا ہے۔

اسی کے ساتھ یونیورسٹی کے ان شعبوں کو قائم کرنا اور ترقی دینا ناگزیر ہے کہ ایک مکمل اسکیم بنا لینی چاہیئے اور اس کے آغاز و ترقی کو گنجائشِ آمدنی پر منحصر رکھنا چاہیئے۔ ان جدید شعبوں میں قوم کی مادی اور تعلیمی بہبود کے لئے ٹکنالوجی اور ٹیچرز ٹریننگ نہایت اہم شعبے ہیں جن پر فوراً توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اکیڈمک کونسل اور تمام افرانِ تعلیم اس یونیورسٹی کی عزّت و شہرت کی حفاظت کے لئے اس کے معیارِ تعلیم کو ہمیشہ بُلند رکھیں گے کہ یہاں کا گریجویٹ ہونا ملک اور قوم میں ایک خاص اور مسلمہ قابلیت کا تمغہ سمجھا جائے گا۔"

عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ سرسید کی حیات ہی میں شروع ہو گیا تھا بہت سی عمارتیں بن کر تیار بھی ہو گئی تھیں۔ اور ان عمارتوں کی تعمیر میں سید احمد خاں کو بڑے صبر آزما حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ جس کی تفصیل چند کتابچوں میں ملتی ہے اور جب یہ عمارتیں تعمیر ہونی شروع ہوئیں تو گویا سید احمد خاں کے دل کو قرار ملا۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ:

"اب جب کہ میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہونے والا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔ مسجد کی محرابیں اور اسٹریچی ہال کے بام و در دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کی بے قراریوں نے اس کالج کا پیکر اختیار کر لیا ہے۔"[1]

۱۱ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو سرجان اسٹریچی کے نام پر اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اسٹریچی ہال کی دیواروں پر چندہ دینے والوں کے نام کی تختیاں نصب کی گئیں اور اس کا افتتاح ۱۲ر نومبر ۱۸۹۴ء کو سرچارلس کراسٹویٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب نے کیا۔ وکٹوریہ گیٹ بھی ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوا۔ اس کے مینار پر جو گھڑی نصب ہے وہ مسٹر تھیوڈور بیک کے والد نے لندن سے تحفتاً بھیجی تھی۔ جامع مسجد کی تعمیر ۱۸۷۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔ سرسید ہال میں "لٹن لائبریری" بیک منزل میں تھی۔ ۱۹۵۵ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد لائبریری کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور مکمل ہونے کے بعد ۹ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو اس کا افتتاح ہوا۔ اس عظیم عمارت کے صدر دروازے کی اندلسی محراب قابلِ دید ہے۔ لائبریری میں اس وقت تک ۷۰۴۳۰ کتابیں ہیں جن میں سائنس، مذہب، ادب اور آرٹ وغیرہ کی کتابوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، ان کے علاوہ عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کے مخطوطات کا بھی ایک نادر ذخیرہ موجود ہے۔ اہم ترین موضوعات پر مشتمل اس ذخیرے نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک ممتاز تحقیقی مرکز بنا دیا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا آزاد لائبریری کے سرسید روم میں مدرسۃ العلوم کے روز اول سے لے کر ایم اے۔ او کالج کے زمانے تک کے اہم رجسٹر، دستاویزات، تصاویر، اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے فائل بھی محفوظ ہیں۔ اس منزل کے محافظ خانے میں متعدد نایاب مخطوطات مثلاً قرآن شریف کے چند نادر نسخے (جن میں سے ایک نسخہ کی کتابت حضرت علیؓ سے منسوب ہے) اور ٹیپو سلطان کا جامۂ قرآن بھی موجود ہیں۔

---

[1] نقل اقتباس سرسید جو علی گڑھ منتھلی جنوری فروری ۱۹۱۵ء میں ۳۰ پر طبع ہوا۔

بانیٔ درسگاہ کے انتقال کے بعد سر سید ہاؤس کو بچوں کا بورڈنگ ہاؤس بنایا گیا تھا۔ جو انگلش ہاؤس کہلایا جاتا تھا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک اس کوٹھی میں وائس چانسلر راس مسعود نے بھی قیام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں سید احمد خاں کے پوتے اور راس مسعود کے بیٹے جو اس کوٹھی کے قانونی وارث تھے۔ پاکستان چلے گئے۔ اس لئے یہ متروکہ جائیداد قرار دی گئی۔ ۱۹۵۹ء میں وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی نے اس کو تاریخی یادگار کی صورت دینا طے کیا۔ انھوں نے حکومتِ ہند سے اس متروکہ جائیداد (جس میں پونے چودہ ایکڑ باغ بھی شامل تھا۔ ۱۶۲۷۸۲ (سولہ لاکھ دو ہزار سات سو بیاسی) روپے میں یونیورسٹی کے لئے خرید لیا جس میں از سر نو تعمیر کے بعد "سر سید میوزم" اور اکاڈمی بنادی گئی اور یہاں سرسید سے متعلق مخطوطات، تصاویر، اور خطوط کی نمائش ان کے یوم پیدائش پر ۱۷ اکتوبر کو ہوتی ہے۔ سائنٹی فک سوسائٹی کے پرانے فائل بھی ایک کمرہ میں محفوظ ہیں۔ ان کا ذاتی فرنیچر اور نجی استعمال کی چیزیں مثلاً گھڑی، اچکن، چھڑی وغیرہ یہاں سجے ہیں اور ہر سال سر سید یادگاری خطبہ (سر سید میموریل لکچر) بھی ہوتا ہے۔

سرسید کے نام سے رہائشی ہال ۱۹۲۵ء سے شروع ہوا۔ اس کی چند اقامت گاہیں خود ان کی زندگی ہی میں مکمل ہو چکی تھیں۔ چند عمارتوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

سالار منزل، آسمان منزل، جوبلی روم، ہدی منزل، نظام میوزیم، باب رحمت مشتاق منزل، بیک منزل، کچی بارک، پکی بارک، باب اسحاق وغیرہ۔

ابتداء میں مختلف شعبے سر سید ہال ہی میں ہوا کرتے تھے۔ بعد ازاں آرٹ فیکلٹی کی وسیع و عریض عمارت تعمیر ہوئی تو اس میں اردو فارسی، ہندی سنسکرت، لسانیات، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، تاریخ، عمرانیات اور انگریزی وغیرہ کے شعبے منتقل ہوگئے کیمسٹری زولوجی اور باٹنی اپنی پرانی سرخ رنگ کی ایک منزل کوٹھی نما عمارتوں میں اب بھی موجود ہے۔ ریاضیات اور شعبۂ فزکس (طبعیات) اور انجینئرنگ کالج بھی اپنی نئی عمارات میں ہیں ۱۹۲۷ء میں شعبۂ طب کھلا جو بعد میں "حکیم اجمل خاں طبیہ کالج کے نام

سے مشہور ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی سے متعلق جدید آلات سے مزین ایک میڈیکل کالج کھولا جائے! انھوں نے پروفیسر ہادی حسن کے ساتھ مل کر ہندوستان بھر کا دورہ کیا پھر مئی ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں ایک وفد سعودی عرب گیا۔ اور شاہ سعود نے اس مقصد کے لیے ۱۰ لاکھ روپے عطا کیے۔ ۲ ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو پروفیسر ہادی حسن نے " جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کا افتتاح کیا۔ اس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر مسعود الحسن نقوی ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی پالی ٹیکنک کا افتتاح ہوا۔ ویسٹ ایشین اسٹڈیز ۱۹۶۴ء میں قائم ہوئی۔ اس شعبہ کی لائبریری میں قیمتی مسودات اور کتب موجود ہیں۔ اب عربی اور اسلامیات کے شعبے " ظہور حسین وارڈ " میں ہیں (جو پہلے چھوٹے بچوں کی اقامت گاہ ہوا کرتا تھا) شعبۂ دینیات (شیعہ و سنی) کو علیحدہ فیکلٹی کا درجہ دے دیا گیا اور یہ ولایت منزل[1] میں ہے۔ کمپیوٹر سینٹر شعبۂ طبعیات سے ملحق خوبصورت لال عمارت میں ہے۔ اس کے لئے ایک نئی عمارت بن چکی ہے اور ۱۹۸۸ میں کمپیوٹر سائنس کا شعبہ کھل گیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایک نیا کمپیوٹر (ویکس ۱۱) خریدا گیا۔

یونیورسٹی کی دیگر عمارتوں کی طرح یونیورسٹی پریس، رجسٹرار آفس، اور وائس چانسلر آفس کی سرخ مشرقی انداز کی عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں۔ یونیورسٹی میں سرسید، محسن الملک، آفتاب، وقار الملک، سلیمان، راس مسعود، ہادی حسن، حبیب، ضیاء الدین، علامہ اقبال، عبداللہ ہال، سروجنی نائیڈو ہال، طلباء و طالبات کی اقامت گاہیں ہیں۔ ان ہالوں کے اندر کئی کئی ہوسٹل ہیں۔ جو اپنی وضع کے دلکش نمونے ہیں۔ چھوٹے لڑکوں کے اداروں میں سیف الدین طاہر ہائی اسکول، سٹی ہائی اسکول، قاضی پاڑہ ہائی اسکول اور ۱۹۲۷ء سے احمدی نابینا اسکول قائم ہوا۔

۱۹۷۵ء میں طلباء کی رہبری اور مدد کے لئے ایک کوچنگ گائیڈنس سینٹر کا قیام بھی عمل میں آیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۸۴ - ۱۹۸۵ء میں اسکو گرانٹ دینا

---

[1] ولایت حسین کی کوٹھی جو انھوں نے یونیورسٹی کو دے دی تھی۔

منظور کیا اور اس کا مقصد طلباء کو سرکاری ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانات کے لئے تیار کرنا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم بالغاں کا سینٹر اور ہابیز ورکشاپ بھی یہاں موجود ہیں۔ رجسٹرار آفس کی عمارت میں ٹیلیفون، ٹیلی گراف، اور ٹیلیکس کی سہولتیں بھی مہیا ہیں۔ ریلوے آفس کی ایک شاخ بھی پراکٹر آفس میں کھلی ہوئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند اور ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی کوششوں سے ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کے دستور دفعہ ۲۴۶ کے تحت ساتویں ضمیمہ میں مسلم یونیورسٹی کو شامل کر کے اُسے ایک مرکزی درسگاہ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم میں چھیاسٹھ طلبا زیر تعلیم تھے اور آج ۱۹۹۲ء میں یہاں کے طلباء کی تعداد سترہ ہزار سے زائد ہے جس میں متفرق مذاہب مختلف صوبوں اور بتیس ۳۲ بیرونی ممالک کے طلباء شامل ہیں اس درسگاہ کے چند نامور اساتذہ کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

پروفیسر ایں کے حیدر، خواجہ منظور حسین، غلام السدین، پروفیسر ہادی حسن، محمد شفیع، عبدالعزیز میمن پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر ڈی پی مکرجی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر بابر مرزا، پروفیسر شیخ عبدالرشید، پروفیسر گل، پروفیسر حبیب الرحمٰن، پروفیسر عمر الدین، پروفیسر حفیظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر عبدالبصیر خاں، پروفیسر فخر الدین احمد، پروفیسر ہربنس لال شرما، پروفیسر نور الحسن، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر خورشید الاسلام، ڈاکٹر ظہور قاسم، پروفیسر کیو ایچ فاروقی، پروفیسر وحید الدین ملک، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر رشید الظفر، ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر مہدی حسن، پروفیسر نسیم انصاری وغیرہ وغیرہ۔

سائنٹیفک سوسائٹی

سید احمد خاں کی تمام تر توجہ ۱۸۶۲ء سے غازی پور آنے کے بعد تعلیم پر مرکوز ہوگئی۔ اور بقول حالیؔ یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ

"جب تک ہندوستانیوں میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں باوجودیکہ وہ غازی پور میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبیین الکلام کی ترتیب اور اس کے چھپوانے کے اہتمام میں جو نہایت سخت کام تھا، صرف کرتے تھے اسی خیال میں انھوں نے ایک روز تدبیر اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کی سوچی انھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبانوں میں ترجمہ نہ کی جائیں انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا کیونکہ مسلمان انگریزی ترجمے کو گناہ سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لیے کوئی ایسی ترغیب نہ تھی کہ جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ تک کے لئے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملکۂ معظمہ کے اشتہار میں اُن کے ملنے کی ہندوستانیوں کو اُمید دلائی گئی تھی مگر ابھی تک عملی طور پر ان وعدوں کا چنداں ظہور نہ ہوا تھا۔"[1]

مغربی علوم کی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے غازی پور میں ایک ایسی علمی سوسائٹی

---

[1] حیات جاوید، الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی اگست ۱۹۳۹ء ص ۱۰۶ تا ۱۰۷

قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی جس کے لئے انگریز اور ہندوستانی حضرات سائنس اور انگریزی ادب کی کتابیں ترجمہ کرسکیں اور حاکم و محکوم کے درمیان التفات و ارتباط کی فضا پیدا ہوسکے اس انجمن کی تاسیس غازی پور میں ہوئی اور اس کا نام "سین ٹیفک سوسائٹی رکھا۔

مذکورہ سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو ہوا۔ سید احمد خاں صدر الصدور نے مجمع میں گفتگو کی کہ

"اے صاحبان ہم کو احسان مندی اور خاکساری سے اس خدائے مطلق کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہیئے جس نے یہ فرمایا ہے کہ جہاں دو یا تین آدمی نیک کاموں کے کرنے پر جمع ہوتے ہیں وہاں میں اُن میں موجود ہوتا ہوں۔ اب جس مقصد کے واسطے ہم جمع ہوئے ہیں وہ ہمارے ہمجنسوں کی ترقی سے متعلق ہے۔ اسی لئے وہ ایک نیک کام ہے۔ پس ہم کو امید کرنا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ کا فضل ہمارے کاموں پر رہے گا" (آمین)[1]

ان کے بعد ضلع سپرنٹنڈنٹ پولیس جی ایف آئی گراہم نے تقریر کی کہ:

"اے صاحبو مجھ کو امید ہے کہ تم مجھ کو معذور فرماؤ گے کہ میں اس وقت کو اس گفتگو میں صرف کر رہا ہوں میں یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ولولہ ہے اس کا سبب وہ روشن ضمیر اور مستقل مزاج شخص اس سوسائٹی کا بانی ہے جو اپنی عقل اور روپیہ دونوں سے اپنے ملک کو برسوں کے خواب سے جگانے میں نہایت کوشش کر رہا ہے اور جس کو آئندہ زمانے میں مجھ کو یقین ہے کہ اس ملک کے رہبروں کی فہرست میں ایک نامی جگہ کا ملنا ملے گا اور وہ شخص سید احمد خاں ہیں"۔[2]

اس سوسائٹی کے متعلق مزید تفصیلات دی گئی ہیں:

---

[1] روئیداد نمبر۱ سین ٹیفک سوسائٹی ۹ جنوری ۱۸۶۴ء سید احمد خاں پرائیویٹ پریس غازیپور ۱۸۶۴ء ص ۱

[2] قانون سوسائٹی ایضاً

لقب اور مقصد:

اس مجمع کا نام سین ٹیفک سوسیٹی یعنی علمی سوسیٹی کیا جاوے گا اور اس کا مقصد یہ ہوگا:

۱۔ ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یوروپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے۔ ایسی زبان میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

۲۔ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کر کے بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

سوسیٹی کو کسی مذہبی کتابوں سے سروکار نہ ہوگا۔[1]

مقام:

مستقل قیام سوسیٹی کا الہ آباد میں ہوگا مگر جب تک سوسیٹی بخوبی نہ چل نکلے اس وقت تک ان مقاموں میں ہوگی کہ جہاں جہاں صدر الصدور کا قیام ہوتا رہے گا۔

بناوٹ سوسیٹی کی:

سوسیٹی میں ممبر (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقائے سوسیٹی ہونگے۔ معاون ممبر دو قسموں کے ہوں گے (اوّل) ممبران حضوری یعنی وہ ممبر جو اسی مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسیٹی کا ہوتا ہے (دوسرے) ممبران مکاتیب یعنی وہ ممبر جو اس مقام کے نہوں جہاں سوسیٹی کا اجلاس ہوتا ہے فاصلے پر ہونے کے سبب سوسیٹی کے جلسے میں شریک نہ ہوسکیں اور بذریعہ خط و کتابت کے سوسیٹی سے

---

[1] روئیداد نمبرا۔ سین ٹیفک سوسیٹی ۹ر جنوری ۱۸۶۴ء سید احمد خاں پرائیویٹ پریس غازیپور ۱۸۶۴ء ص ۲

ارتباط رکھیں۔ ممبران حضوری اور ممبران مکاتیب کی تعداد غیر محدود ہوگی۔ آنریری ممبروں کی تعداد دس ہے۔ اور رفقائے سوسیٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ ہوگی اور صاحبان ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودھ اور پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں۔ آنریری ممبر ہوں گے۔ ....

اور سب قوموں کے لوگ سوسیٹی کے ممبر ہوسکیں گے"۔ [۱]

پھر سید احمد خاں نے ان لوگوں کے نام جنھوں نے معاون ممبر ہونے کے واسطے درخواستیں بھیجی تھیں مجمع کو سنائے اور بیان کیا کہ ایم کیمس ایم اے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے اس سوسیٹی کے آنریری ممبر ہونے کو قبول فرمایا۔

سوسیٹی کے مقامی ممبران کی تعداد مجموعی طور پر ۱۰۹ تھی جس میں ہندوستان کے ہر صوبے کے سربرآوردہ اشخاص مسلمان، ہندو اور عیسائی شامل تھے۔

مطبوعات:

سوسیٹی کی تشکیل کے بعد اس اہم اور نتیجہ خیز سوال سے دوچار ہوئی کہ وہ ترجمہ کے لئے کن کتابوں کا انتخاب کرے چنانچہ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر کے ہر ممبر کونسل کو ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیجی گئی۔ بیشتر ممبران نے اپنی رائے صدر سوسیٹی کو بھیجی اور چند کتابوں کے حق میں کثرت رائے ملنے پر ترجمہ اور تالیف کے کاموں کی تدابیر کی گئیں۔

جن کتابوں کو منتخب کیا گیا تھا ان کی مجموعی تعداد ۲۸ تھی، ان میں سائنس، ریاضیات معاشیات، سیاسیات، تاریخ، زراعت، منطق، جغرافیہ، طبقات الارض، اور فلسفہ جیسے موضوعات پر تھیں۔ مختلف وجوہ کی بناء پر یہ کتابیں ترجمہ ہوسکیں نہ اشاعت کی نوبت آئی۔ جن کتابوں کے ترجمہ ہونے کا پتہ چلتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رولن صاحب کی قدیم تاریخ یونان سے حصہ اول جو ابتدائے قائم ہونے سلطنت یونان سے اس زمانے تک جب کہ یونان میں علوم و فنون میں مشہور

---

[۱] روئیداد نمبر ۱ سین ٹیفک سوسیٹی ۹ جنوری ۱۸۶۴ء سید احمد خاں پرائیویٹ پریس غازیپور ۱۸۶۴ء ص ۳

لوگ ہوئے۔

(۲)۔ رولن صاحب کی قدیم قوموں کی تاریخ یونان سے دوسرا حصہ جو ماڈرا کے زمانے سے جب کہ یونانیوں اور ایرانیوں زرکسیز کی وفات تک ہے۔

(۳)۔ رولن صاحب کی قدیم قوموں کی تاریخ یونان سے تیسرا حصہ جو موارنادرکسیز کے حال زمانے سے اس کی وفات تک ہے۔

(۴)۔ رسالہ علم فلاحت یعنی کاشت کاری مصنفہ رابرٹ اسکاٹ برنی صاحب۔

(۵) رسالہ نیچرالفلاسفی مصنفہ چارلس ٹام لن سن

(۶) رسالہ آب و ہوا مصنفہ چارلس " " "

(۷) رسالہ علم جرّ ثقیل مصنفہ " " " " "

(۸) رسالہ درعلم قوت " " " " " "

(۹) سپینرز کی پولٹیکل اکونومی[1]

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ

"سرسید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت جس پر فی الحقیقت سوسیٹی کا دارومدار تھا ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے ذریعہ سے بھی سوسیٹی کو فائدہ پہنچایا اپنا ذاتی پریس جو انھوں نے آٹھ ہزار خرچ کرکے خرید اتبیین الکلام اور سوسیٹی کی تمام روئدادیں انگریزی اور اردو کاغذات ابتدا ہی سے اسی پریس میں چھپتے تھے جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہو گئی تو سامان پریس ایک عام جلسہ میں سوسیٹی کو دے دیا۔"[2]

سائین ٹیفک سوسائٹی کے اخبار کا اجرا ۱۸۶۶ء میں ہوا اور جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے اپنے آخری ایام تک نکلتا رہا۔ سید احمد خاں اس میں مستقل

[1] روئداد نمبر ۵ سین ٹیفک سوسیٹی ۱۸۶۴ء گورنمنٹ پریس الٰہ آباد ص ۸

[2] مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نامی پریس کانپور سنہ ۱۹۰۱ طبع اول ص ۱۴۵

لکھتے تھے۔ شاید ہی کوئی معاشرتی، اخلاقی اور علمی موضوع ایسا ہو جس پر انھوں نے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔ اخبار کی باقاعدگی کا یہ عالم تھا کہ بتیس ۳۲ سال کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا نمبر ہو جو اپنی معین تاریخ میں نہ نکلا ہو۔

سوسائٹی کے زیر اہتمام ہر مہینے متعدد لکچرز ہوتے جن میں سائنسی آلات باقاعدہ دکھائے جاتے اور لکچرز کے لئے ایسے موضوعات چنے جاتے تھے جن سے معلومات میں اضافہ ہو اور آزادیٔ فکر و عمل پیدا ہو۔ ڈاکٹر کلکی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور سائنسی آلات دکھا کر تجربے بھی کرتے تھے۔

سوسائٹی کا اپنا ایک مستقل کتب خانہ بھی تھا کتابوں کے علاوہ اس کے دارالمطالعہ میں درجنوں کی تعداد میں رسالے آتے تھے۔ سید احمد خاں نے سوسائٹی کی تنظیم اعلیٰ پیمانے پر کی تھی۔ اس زمانے میں پانچ سو روپیہ ماہوار عملہ یعنی مترجمین، مولوی، پریس میں چپراسی مالی پر صرف ہوتا تھا۔ اس کے لئے تیس ہزار کی لاگت سے ایک عمارت علی گڑھ میں تعمیر کی گئی جو موجودہ طبیہ کالج کے دواخانے کے قریب ہے اور زبانِ حال سے ملت کی بے حسی کا ماتم کرتی ہے۔

سائنٹیفک سوسائٹی سید احمد خاں کی تعلیمی مہم کی ہراول تھی اور اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی جس سے ہماری قومی زندگی میں فکر و عمل کا انقلاب برپا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کی کوئی تدبیر اس وقت تک بار ور نہیں ہو سکتی جب تک کہ عوام کے خیالات میں تبدیلی کے لئے مسلسل اور پر خلوص جد و جہد نہ کی جائے اور ان کی قائم کردہ سوسائٹی قوم میں اس مقصد کی سعی و کوشش کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

ادھر چار چھ برس پہلے یونیورسٹی میں اس سوسائٹی کی تجدید ہوئی جس کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر لکچرز ہوتے ہیں مگر آج ۱۹۹۲ء میں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم میں سائنسی مزاج (سائنٹیفک ٹمپر) کی ترویج زیادہ شد و مد سے کی جائے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

مئی ۱۸۸۶ء میں سید احمد خاں نے اپنی تعلیمی مہم کو عام اور مستحکم کرنے کے لئے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی[1]۔ اس کے پہلے معتمد وہ خود تھے اور صدر سردار محمد حیات خاں ہوئے۔ اس کا اجلاس سال میں ایک بار کسی اہم شہر میں ہوتا تھا اور اس کی روئیداد علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شایع ہوتی تھی۔ ۸ مئی ۱۸۸۶ء کے گزٹ میں اس کے متعلق تجویز بھیجی کہ

"اس بات کو ہر کوئی تسلیم کرے گا کہ ہماری قوم کی حالت اور خصوصاً اس کی تعلیم

---

[1] آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ابتدائی نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس تھا۔ پانچویں اجلاس آخر دسمبر ۱۸۹۰ء بمقام الہ آباد زیر صدارت سردار محمد حیات خاں ترمیم پیش کی تھی کہ کانگریس کی جگہ پر کانفرنس کر دیا جائے جس کی تائید سید احمد خاں نے کی اور منظور ہوئی۔

دسویں جلسہ آخر دسمبر ۱۸۹۶ء میں بمقام شاہجہان پور محسن الملک کی صدارت میں ایک ترمیم کی تحریک سید محمود نے کی کہ اینگلو اورینٹل کا اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ پورا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس" ہوگیا۔ پھر چھتیسویں جلسہ آخر دسمبر ۱۹۲۳ء بمقام علی گڑھ زیر صدارت آغا خاں احمد خاں ایک ترمیم حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ایماء پر منظور ہوئی کہ محمڈن کو مسلم سے بدل دیا جائے چنانچہ اس کا موجودہ نام "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" ہے۔

کا معاملہ نہایت توجہ کے قابل ہے۔ اسی لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اضلاع کے ان لوگوں کو جو قومی ترقی کے خواہاں اور قوم کے بھلائی اور ترقی تعلیم میں کوشش کرنا چاہتے ہیں ایک سالانہ جلسہ ہوا کرے اور اسی نام سے موسوم ہو جو اس آرٹیکل کے نام پر لکھا گیا ہے۔"[1]

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس منعقدہ علی گڑھ مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء میں انھوں نے کانگریس کا بنیادی مقصد تعلیم کو ترقی دینا اور وسعت دینا قرار دیا اور اس کے حسب ذیل مقاصد بیان کئے

مسلمانوں میں اعلیٰ مغربی تعلیم کو پھیلانا۔

مسلمانوں کے انگریزی مدرسوں میں مذہبی تعلیم کو مستحکم کرنا۔

عربی فارسی اور دینیات کی تعلیم کو جاری رکھنے کی تدابیر کرنا۔

دینی مدرسوں میں تنزلی کے اسباب دریافت کرنا اور ان کی ترقی کی کوشش کرنا[2]

اجلاس سوم منعقدہ لاہور آخر دسمبر ۱۸۸۸ء میں سردار محمد حیات خاں نے اپنے صدارتی خطبہ میں اس کے تعلیمی مشن پر زور دیا اور سیاست سے علیحدگی پر اصرار کیا:

"ہماری محمڈن ایجوکیشنل کانگریس میں جس کے مقاصد محض متعلق تعلیم مسلمانان ہیں کوئی پولیٹیکل معاملہ پیش نہیں ہوگا۔"[3]

سید احمد خاں نے سال گزشتہ کی کارگزاریوں کی روئیداد بحیثیت معتمد پڑھی اور کانفرنس کے ایک جلسہ میں انھوں نے سامعین کو مخاطب کیا کہ

"صاحبو! میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ قوم مردہ ہوگئی ہے۔ کچھ سانس

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲۱ شمارہ ۴۲ ، ۲ مئی ۱۸۸۶ء ص ۵۱

[2] خلاصہ کارروائی یازدہ سالہ محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس مرتبہ سید مہدی علی مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۷ء ص ۵

[3] خطبات عالیہ حصہ اول مرتبہ مولوی انوار احمد مارہروی مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۷ء ص ۶۴

چلتے ہیں مگر اس سے آواز آتی ہے کہ محمڈن کانفرنس کچھ نہیں کرتی"۔[1]

ان کا اشارہ قوم کی بے علمی اور غفلت کی طرف تھا چونکہ وہ خود ان تھک لگن اور محنت کے عادی تھے اس لئے انھیں قوم کی ترقی کی رفتار انتہائی سست معلوم ہوتی تھی۔ اس افسردہ دلی کی فضا کو ان کے رفیق کار محسن الملک نے اپنے جواب سے کم کرنے کی کوشش کی۔

"میرا جواب سید صاحب کی رپورٹ کے بالکل برخلاف ہے۔ اگرچہ یہ فقرے سید صاحب کی زبان سے نکلے ہیں اگر کسی مخالف کی زبان سے نکلتے تو ہم جل جاتے مگر بزرگ سید کے دل سے نکلے اور پُر درد ہیں میرے نزدیک ان کا یہ کہنا کہ قوم مردہ ہوگئی ہے حقیقت میں قوم کی زندگی کا بین ثبوت ہے۔ فقیروں کی دو حالتیں ہیں ایک جذب دوسرا سلوک۔ جذب میں جو تھا کہہ دیا ......

میرے نزدیک قوم اس عرصہ میں ترقی نہیں کر سکتی۔ کیا آٹھ برس قومی زندگی کے لئے کافی تھے؟ آٹھ برس قومی زندگی کے لئے آٹھ دن ہیں۔ اگر یہی ہے تو میرے نزدیک کانفرنس کے نتیجے نمایاں ہوتے جاتے ہیں"۔[2]

دسویں اجلاس بمقام شاہجہاں پور ۱۸۹۵ء میں سید محمود کو ان کے والد کے ساتھ جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا۔[3] اس ریزولیوشن نمبر ۶ کی تحریک برکت علی خاں اور تائید مولوی نذیر احمد نے کی۔

کانفرنس کے جلسوں میں اراکین کو اظہار رائے کی آزادی تھی جس کی تفصیل اس کی مختلف روئیدادوں سے سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر کانفرنس میں مذہبی تعلیم سے متعلق متضاد خیالات پیش کئے گئے۔ مدرسۃ العلوم کی مخالفت زیادہ تر مذہبی بنیاد

---

[1] مرقعِ کانفرنس انوار احمد مارہروی، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۵

[2] ایضاً ص ۶

[3] محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا دسواں جلسہ۔ مطبع مفید عام آگرہ، باہتمام تادر علی خاں صوفی ۱۸۹۶ء ص ۱۲۶-۱۲۷

پر ہوئی اور یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ نئی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد طلباء مذہبی اقدار سے بیگانہ ہو جائیں گے۔ یہ بات عوام و خواص سب کے لئے باعث تشویش تھی چنانچہ اس کے استحکام اور معقول انتظام کے لئے بہت سی قراردادیں رکھی گئیں۔ اس کے علاوہ مختلف تجویزوں پر کھلے طور پر رائے زنی کی جاتی تھی۔ مثلاً یہ عبارت کہ

"ایجوکیشنل کانفرنس انجمن حمایت الاسلام لاہور[1] کی درسی کتابوں کو پسند کرتی ہے اور ان کی اشاعت کی سفارش کرتی ہے۔ بڑے سخت اختلاف کے بعد یہ ریزولیوشن پاس ہوا"[2]

۱۸۹۷ء میں سید احمد خاں کی علالت کے باعث کوئی اجلاس نہ ہو سکا۔ ان کے انتقال کے بعد کا بارہواں جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۹۸ء کو زیر صدارت نواب فتح علی قزلباش لاہور میں ہوا جس میں ریزولیوشن نمبر ۳ جوش و خروش سے پاس کیا گیا کہ سید احمد خاں کی یادمیں محمڈن یونیورسٹی کے قیام کی کوشش کی جائے کیونکہ یہ یادگار بانی مدرستہ العلوم کے خواب

---

[1] انجمن حمایت الاسلام لاہور ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی جس کے تین مقاصد تھے۔

۔ مخالفینِ اسلام کے جوابات تحریری اور تقریری دیئے جائیں جس کے لئے واعظوں کا تقرر اور رسالہ کا اجراء کیا جائے۔

۔ مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا تاکہ وہ غیر مذاہب سے محفوظ رہیں۔

۔ فن کے ذریعہ اصلاحِ معاشرت و تہذیبِ اخلاق اور تحصیل علوم دینی و دنیوی اور باہمی اتحاد کا مشورہ دینا۔

دو سال کی کوششوں کے بعد ۱۸۸۶ء میں "مدرستہ المسلمین" کے نام سے پہلا مدرسہ لڑکوں کے لئے پانچ جماعتوں تک کھولا گیا جس میں ہر سال ایک درجہ کا اضافہ کیا جاتا یہاں تک کہ ۱۸۹۲ء میں یہ کالج ہو گیا

انجمن کے اس کالج کا نام اسلامیہ کالج تھا جو اب تک قائم ہے جو غریب اور اوسط درجہ کے طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کی سہولت بہم پہنچا تا رہا ہے۔ انجمن حمایت اسلام کی رہنمائی سر محمد شفیع، عبدالقادر اور اقبال نے بحیثیت صدر انجام دی۔

[2] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۲۹ شمارہ ۳۔ ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء ص ۳۶

کی تکمیل ہوگی۔ اس کی حمایت میں جسٹس امیر علی (کلکتہ) جسٹس بدرالدین طیب جی (بمبئی)، عماد الملک، سید حسن بلگرامی، آفتاب احمد خاں، مھینا، رالدین اور حالی نے پرزور تقریریں کیں اور اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹی کی تجویز کو پروفیسر مارلین نے پیش کیا جس کی تائید مولوی بدرالحسن مترجم الٰہ آباد ہائی کورٹ اور شاہ دین بیرسٹر لاہور نے کی[1] اور یہ تحریک متواتر کانفرنس کے جلسوں میں زیر بحث رہی اور اس نے یونیورسٹی کے قیام میں بڑا مثبت رول ادا کیا۔

سید احمد خاں کے رفقاء نے اُن کی قائم کردہ کانفرنس کو فعال رکھنے میں ہر ممکن کوشش کی اور مختلف علاقوں میں اس کے تحت ادارے قائم کئے گئے مثلاً اسلامیہ کالج پشاور، موڈرن عربک اسکول پٹنہ، اسلامیہ کالج اٹاوہ، بریلی، بدایوں اور میرٹھ کے اسلامیہ کالج۔ کانفرنس نے درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتراجم پر بھی توجہ دی اور بہتر اشاعت کے لئے سہولیتیں فراہم کی گئیں۔

سنہ ۱۹۰۳ء کے جلسہ میں اردو کی ترویج کے لئے ایک شعبہ "انجمن ترقی اردو" کے نام سے قائم ہوا جس کے معتمد مولوی عبدالحق مقرر کئے گئے۔ اس شعبہ کی کارکردگی نے اردو کو عام بول چال کی زبان سے علمی زبان کے درجہ تک پہنچا دیا۔ بعد میں یہ شعبہ علاحدہ ادارہ کی حیثیت اختیار کر گیا اور "انجمن ترقی اردو" اب تک برصغیر ہند و پاک میں تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنی تاسیس سے حصول آزادی تک گویا نصف صدی سے زائد مدت تک تعلیم وتربیت، تہذیب وانسانیت اور زبان وادب کی ترقی واشاعت کے کارہائے نمایاں ادا کئے اور آج بھی یہ ان علاقوں میں جہاں خواندگی اور رہنمائی کی ضرورت ہے سرگرم عمل نظر آتی ہے۔
اس کا مرکزی دفتر سلطان جہاں منزل میں اب بھی موجود ہے۔

---

[1] مرقع کانفرنس از ۱۸۸۶ء تا سنہ ۱۹۳۲ء انوار احمد مارہروی مطبع مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سنہ ۱۹۳۵ء ص ۶۰

تعلیم نسواں

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی سرگرمیاں محض لڑکوں تک محدود تھیں۔ لڑکیوں کے لئے مشنری پرائیویٹ اسکول تھے جن میں والدین اپنی بچیوں کو بھیجنے پر رضامند نہیں تھے۔ خوشحال خاندانوں کی لڑکیاں استانیوں کی مدد سے گھر پر ہی مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیتی تھیں ان کی باقاعدہ تعلیم کی طرف ابھی تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔

چند روشن خیال انگریزوں نے محسوس کیا کہ تعلیم نسواں سیکولر ہو اور اس میں خود ہندوستانیوں کو پہل کرنی چاہیئے۔ ڈیوڈ ہیر نے کلکتہ میں اپنے ذاتی مصارف سے لڑکیوں کا پہلا مدرسہ کھولا۔ الفنسٹن کالج بمبئی کے پروفیسر پیٹن نے ایک ادبی اور سائنٹیفک سوسائٹی قایم کی جس کے تحت بہت سے مدرسہ نسواں وجود میں آئے۔ کلکتہ میں بنگال کونسل آف ایجوکیشن کے صدر جے ای۔ ڈی بیتھون نے بھی لڑکیوں کا اسکول کھولا۔

اگرچہ عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ پر رد و قبول کی کشمکش جاری تھی کہ ایک طبقہ ان کی کارکردگی سے متاثر ہو کر تعلیم نسواں کے معاملہ میں ان کا ہم خیال ہو گیا۔ احمد آباد میں گجرات ورناکیولر سوسائٹی نے ۱۸۴۹ء میں لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا۔

لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں ۱۸۵۴ء میں "ووڈ ایجوکیشنل ڈسپیچ" کے ذریعہ سفارش کی گئی کہ لڑکیوں کی تعلیم مضبوط بنیاد پر ہو اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ بہت سے ہندوستانیوں نے اب اپنی بچیوں کو اسکولوں میں بھیجنا شروع کر دیا ہے۔

۱۸۶۰ء میں بمبئی کی پارسی انجمن نے بڑی تعداد میں مدارس کھولے اور دیگر اصلاحی تحریکوں نے بھی تعلیم نسواں کی حمایت کی مثلاً برہمو سماج، آریہ سماج اور

پرارتھنا سماج کی کوششوں سے مہا کنیا ودیالیہ جالندھر اور آریہ کنیا اسکول کی شاخیں مختلف شہروں میں پھیل گئیں۔

انگریز مصلح میری کارپینٹر کی ہندوستان میں آمد نے تعلیم نسواں کی تحریک میں نئی روح پھونک دی اور اس نے سب سے پہلے عورتوں کے ٹریننگ اسکول قائم کرنے کی سفارش کی چنانچہ احمد آباد اور مدراس میں نارمل اسکول کھلے پھر ۱۸۷۱ء میں کیشب چندر سین نے پونا میں نارمل اسکول اور پھر ازبیلا تھوبرن کالج لکھنؤ اور سینٹ اینی اسکول بنگلور میں استانیوں کی تربیت کے لئے وجود میں آئے اور رفتہ رفتہ لڑکیوں کی تعلیم میں ترقی ہونے لگی۔

مسلمانوں نے ابھی خواتین کے مدرسوں اور ان میں جدید تعلیم کو مروج کرنے کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ سید احمد خاں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کی تعلیم کے بھی خواہاں تھے لیکن اپنے مشن اور حالات کے پیش نظر انھوں نے اس مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔
لندن کے سفر میں جہاز پر اتفاقاً ان کی ملاقات مس میری کارپینٹر سے ہوگئی اور تعلیم نسواں پر تبادلۂ خیال ہوا۔

"جب سے میں نے ان کا نام اور ان کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورات کے سنا تھا میں بہت مشتاق ان کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ ان کی ملاقات ہوگئی"۔[۱]

پھر ان کی ڈائری پر حسب ذیل عبارت تحریر کی جس پر مختلف لوگوں کی آرا رکھی تھیں:
"میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہونی گو وہ کسی طرح ہو نہایت اچھی ہے کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو وہ خود کامیاب ہوگی .... بہر حال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارپینٹر کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے جو دونوں اصل میں ایک ہے

---

[۱] سید احمد خاں سفرنامہ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء ص ۶۱-۶۲

روشن ضمیری حاصل کریں"۔[1]

انھوں نے جب فراہمی چندہ برائے مدرسۃ العلوم پنجاب کا دورہ کیا تو وہاں کی خواتین کے ایڈریس کے جواب میں کہا:

"اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہوگئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو ۔ ۔ ۔ تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے"۔[2]

انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے جلسہ ۱۸۸۸ء بمقام لاہور کہا تھا کہ

"میں نے لنڈن میں اپنے دوستوں کی مہربانی سے ایسے زنانہ مدرسوں کو جہاں اشراف لڑکیاں پڑھتی اور رہتی ہیں دیکھا ہے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو حالت عمدگی اور طمانیت اور تعلیم اور تربیت کی ان مدرسوں میں ہے۔ ہندوستان کو وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی سیکڑوں برس درکار ہیں"۔[3]

ایک خط میں سید ممتاز علی (۱۸۶۰ء ۱۹۲۵ء) کو تعلیم نسواں کے بارے میں اپنے خیالات اور ان کے مجوزہ رسالہ کے نام کے متعلق لکھا کہ

"میری دلی آرزو ہے کہ عورات کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی جاوے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ عورات کی تعلیم قبل مہذب

---

[1] سید احمد خاں، سفرنامہ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء ص ۶۲
[2] سرسید کا سفرنامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۴ء ص ۱۰۳
تقریر بمقام گوردا سپور۔ ۲۸ جنوری ۱۸۸۴ء
[3] سرسید کے لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء ص ۶۶

ہونے مردوں کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لئے آفتِ بے درماں ہے۔
یہ ہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورتوں کی تعلیم میں کچھ نہیں کیا..... جو نام
آپ نے مجھے لکھ کر بھیجے ہیں ان میں مجھے کوئی بھی پسند نہیں آیا۔ میری رائے میں اگر
کوئی اخبار مستورات کیلئے جاری کیا جائے تو اس کا نام تہذیب النسواں ہونا چاہیئے"[1]

ان کے رفقاء بھی محسوس کرنے لگے کہ عورتوں کی جہالت قوم کی ترقی میں مانع ہے۔ کانفرنس اجلاس ششم ۱۸۹۱ء بمقام علی گڑھ خواجہ غلام الثقلین کی تحریک اور کرامت حسین کی تائید پر تجویز نمبر ۲ منظور ہوئی کہ

"اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت میں مردوں کی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کی بھی کوشش لازم ہے کیونکہ قوم کی اصلی ترقی زیادہ تر اسی پر منحصر ہے یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ عورتوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہو۔"[2]

انھیں اندیشہ تھا کہ موجودہ صورت حال میں اگر تبدیلی نہ ہوئی تو قوم کے لئے مضر ثابت ہوگی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں جلسہ آخر دسمبر ۱۸۹۲ء منعقدہ دہلی میں انھوں نے اس کا اظہار کیا کہ قوم کے لڑکوں کا تعلیم کے لئے یورپ جانا قومی ترقی کا ذریعہ ہے لیکن سید احمد خاں کی تحریک پر ریزولیوشن نمبر ۶ پاس ہوا کہ

"لیکن یہ جلسہ مسلم طلباء کے یورپ میں شادی کرنے کو قومی نقصان اور تنزل کا باعث سمجھتا ہے۔"[3]

دستور العمل سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی مورخہ ۷ ار نومبر ۱۸۹۶ء منعقدہ علی گڑھ میں ریزولیوشن

---

[1] مجموعہ ریزولیوشنہائے یازدہ سالہ محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس مرتبہ سید احمد خاں سکریٹری مطبوعہ مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی ۱۸۹۶ء ص ۲۴

[2] سرسید کے خطوط مرتبہ مولوی وحید الدین سلیم اڈیٹر معارف، حالی پریس پانی پت ص ۲۸۰-۲۸۲

[3] مرقع کانفرنس سید انوار احمد مارہروی مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۱۵۰

نمبرا کے تحت چار سیکشن تجویز ہوئے۔

سینیر سیکشن

اسکول سیکشن

تعلیم نسواں سیکشن

جنرل سیکشن

تعلیم نسواں کے پہلے معتمد مولوی کرامت حسین[۱] مقرر ہوئے اور ان کے شریک کار محسن الملک، آفتاب احمد خاں، سلطان احمد خاں، حاجی اسمٰعیل خاں اور مولوی بہادر تھے۔[۲] پھر ۱۸۹۸ء میں جلسۂ لاہور میں باقاعدہ شعبۂ نسواں کا وجود عمل میں آیا اور معتمد آفتاب احمد خاں ہو گئے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور دیگر رسایل میں اس کی مدافعت اور مخالفت میں مضامین چھپنے لگے، سید امیر علی، غلام الثقلین اور حاجی اسماعیل خاں کے نام اہم ہیں۔ کانفرنس کے تیرھویں اجلاس کلکتہ دسمبر ۱۸۹۹ء زیر صدارت سید امیر علی تعلیم نسواں سے متعلق تجویز نمبر ۷ منظور ہوئی کہ ہر صوبہ کے دارالخلافہ اور دوسرے علمی مراکز میں زنانہ مدارس احکام اسلام اور شریف خاندانوں کے رسم و رواج کے مطابق کھولے جائیں اور یہ کام تین برسوں میں مکمل ہو جانا چاہیے اور ہر صوبہ میں "کمیٹی زنانہ مدارس" اور مستند علماء کی مدد

---

[۱] کرامت حسین (۱۸۴۲-۱۹۵۲ء) کا وطن الہ آباد تھا ان کے والد سراج الحسن منصف سندیلہ ضلع ہردوئی کے زمیندار تھے۔ عربی زبان کی تحصیل اپنے چچا مجتہد لکھنؤ سید حامد حسین سے کی پھر مغربی علوم کی طرف رجوع ہوئے۔ انگلستان سے قانون کی اعلیٰ سند ۱۸۸۹ء میں حاصل کی۔ یو پی اسمبلی کے رکن اور ہائی کورٹ الہ آباد کے جج (۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۲ء) رہے ۱۹۰۰ء میں اردو کے تحفظ کے لیے ایک انجمن قائم کی۔ وہ فیملی ایجوکیشن کے بڑے مؤید تھے۔ انھوں نے مسلم طالبات کے لیے لکھنؤ میں کرامت حسین گرلس سکول کھولا جو اب کالج ہو گیا ہے۔

[۲] روداد مجلس بغرض قائم کرنے لوکل اسٹینڈنگ کمیٹی محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء۔ باہتمام قادر علی خاں صوفی۔ ص ۳۳

سے نصاب تیار کیے جائیں[۱]۔ اگلے جلسہ بمقام رامپور میں لڑکیوں کی ترقی اور توسیع معلومات کے لیے حساب، طبعیات، جغرافیہ، تاریخ اور اخلاقیات کے موضوعات پر سہل کتابیں تصنیف کی جانے کی تجویز منظور ہوئی۔ سولھویں اجلاس آخری دسمبر ۱۹۰۲ء منعقدہ دہلی بصدارت سر آغا خاں میں تعلیم نسواں سیکشن کے معتمد شیخ محمد عبداللہ[۲] نامزد ہوئے اور ایک ماہ کے اندر تجاویز کو سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی سے منظوری لینے کے بعد ان پر عمل درآمد کی سفارش کی گئی[۳]۔

سید احمد خاں کے اس شاگرد نے تحریک نسواں کو زیادہ فعال بنا دیا اور ان کے ساتھ قوم کے نوجوانوں اور ہمدردوں کا ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا اور عورتوں کے مختلف مسائل پر کھل کر اظہار خیال ہونے لگا مثلاً علی گڑھ منتھلی نومبر ۱۹۰۳ء کا شمارہ "ہم اور ہماری خواتین" کے لیے مخصوص تھا جس میں چار مضامین شایع ہوئے:

نئی تعلیم اور شادی کا مسئلہ۔ از سید غلام بھیک نیرنگ

تعلیم نسواں بذریعہ ازدواج۔ از سجاد حیدر یلدرم

تعلیم نسواں (ہماری قوم میں کیونکر ہو سکتی ہے) از ابو الکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ ایڈیٹر خدنگ نظر

۱ے مرقع کانفرنس از ۱۸۸۶ء تا ۱۹۳۴ء مرتبہ انوار احمد مارہروی، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۲

۲ے شیخ عبداللہ (۱۸۷۴ء-۱۹۶۵ء) قصبہ بھاتی ضلع پونچھ (کشمیر) میں پیدا ہوئے وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی انٹرنس کا امتحان (۱۸۹۹ء) لاہور سے پاس کیا۔ ۱۸۹۱ء سے علی گڑھ آکر ایف اے سال اول میں داخلہ لیا اور ایل ایل بی کی ڈگری ۱۸۹۹ء میں لی۔ وہ اچھے مقرر تھے سرسید کے مشورے پر یہیں وکالت شروع کی اور لڑکیوں کی پڑھائی کے لیے عملی قدم اٹھائے تعلیم نسواں سے متعلق خدمات کے صلہ میں انھیں خطاب "خان بہادر" ملا۔ پھر حکومت ہند نے ۱۹۶۴ء "پدم بھوشن" سے نوازا۔ ان کی وفات ۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو ہوئی۔

۳ے مرقع کانفرنس مرتبہ انوار احمد۔ مطبع مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۳۵ء ص ۹۰

مسلمانوں میں پردہ — از مولوی محمد اختر (حیدرآباد دکن)

نوجوان ابوالکلام آزاد نے اپنے اس مضمون میں کہا کہ آزادئ نسواں کے بغیر ملّت اسلامیہ کسی نوع کی ترقی نہیں کر سکتی:

"ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں اور اسے فیصلۂ قطعی سمجھ لو، اصول مسلمہ کی طرح مان لو کہ جب تک متعارف پردہ ہندوستان سے نہ اُٹھے گا!
جب تک عورتوں کو جائز آزادی جس کا اسلام مجوز ہے نہ دی جائے گی غلامی میں رکھ کر اور پردے کی تقلید کے ساتھ تعلیم دینی نہ صرف فضول بلکہ مضر اور اشد مضر ہے۔ اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں مل جائیں گی کہ اس قسم کی تعلیم بُرے نتیجے پیدا کرتی ہے یا کم از کم ایسی تعلیم سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔" [1]

آخر دسمبر ۱۹۰۳ء میں کانفرنس کے جلسہ منعقدہ بمبئی میں خواتین کو بھی مدعو کیا گیا کہ وہ چلمن کے پیچھے سے شرکت کریں اس میں تعلیم نسواں پر تجاویز پیش ہوئیں۔

عورتوں کے اسکول کی ضرورت اور ان کی تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر شیخ عبداللہ نے علی گڑھ سے جولائی ۱۹۰۴ء میں ایک رسالہ "خاتون" جاری کیا اس کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا کہ "خاتون کے اجراء کا مقصد عورتوں کے خیالات اور مضامین کی اشاعت کرنا ہے۔ ساتھ ہی عورتوں میں تعلیم کا رواج دینا بھی مقصود ہے۔"

یہ رسالہ ۱۹۱۴ء تک نکلتا رہا اس میں محسن الملک، ذکاء اللہ، کرامت حسین، شیخ عبدالقادر، مولوی سید احمد دہلوی، اسلم جیراجپوری کی نگارشات شایع ہوئیں خواتین لکھنے والوں میں محمدی بیگم: بنت نذر الباقر (نذر سجاد) نفیس دلہن (بیگم حبیب الرحمٰن خاں شیروانی) اور م۔ رخ۔ ش (بنت نواب مزمل اللہ خاں) قابل ذکر

---

[1] علی گڑھ منتھلی جلد اول نمبر ۱۱۔ یکم نومبر ۱۹۰۳ء ص ۲۰

ہیں۔

اجلاس کانفرنس ۱۹۰۴ء منعقدہ لکھنؤ میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے شعبۂ نسواں کا جلسہ کرنے کی تجویز رکھی۔ یہ جلسہ قیصر باغ بارہ دری کے قریب ایک لائبریری (امین الدولہ) میں ہوا جس میں ڈیڑھ سو اشخاص نے شرکت کی اور جسٹس شاہ دین اور یعقوب ڈورمارلین نے تعلیم نسواں کی ضرورت پر تقریریں کیں۔

۱۹۰۵ء کا جلسہ کانفرنس علی گڑھ تاریخ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسٹریچی ہال میں تعلیم نسواں کے صیغہ کی صدارت زہرہ فیضی نے کی اور موافقین ومخالفین دونوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جن میں مولانا محمد علی اور شوکت علی نے عورتوں کی تعلیم کی موافقت نہیں کی لیکن صدر اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس خلیفہ محمد حسین وزیر ریاست پٹیالہ کی صدارتی تقریر نے تعلیم نسواں کے بہت سے مسائل کو حل کر دیا۔ مثلاً انھوں نے پردہ شرعیہ کی پابندی کے ساتھ تعلیم کو جاری رکھنے کی تجویز پیش کی تاکہ روشن خیال افراد کے ساتھ ساتھ قدامت پسند بھی متفق ہو سکیں کہ لڑکیوں کو مدرسہ میں تعلیم دی جائے یہ ایک محصور تعلیم گاہ کی تجویز تھی جس میں اسکول، بورڈنگ ہاؤس ہو اور نگرانی کے لئے سن رسیدہ استانیاں مقرر کی جائیں اور وہیں طالبات کے لئے کھیلوں کا بھی انتظام ہو[1]

پھر شیخ محمد عبداللہ نے اپنی رپورٹ تعلیم نسواں کے شعبہ کی کارکردگی کے متعلق پیش کی اور اس سلسلے میں چھ ہزار ڈھائی سو روپیہ چندہ جمع ہونے کی خبر دی۔ زنانہ مصنوعات کی نمائش کی مقبولیت اور رسالہ خاتون کی کامیابی کا بھی ذکر کیا۔

تعلیم نسواں کا ایک وفد شیخ عبداللہ کی قیادت میں ۱۹۰۶ء میں لفٹننٹ گورنر

---

[1] خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تجاویز شیخ عبداللہ کے ذہن کی پیداوار تھیں جو خلیفہ سید محمد حسین صدر کانفرنس نے پیش کیں تھیں تاکہ شرکاء اس مسئلہ کی اہمیت سے واقف ہو جائیں اس محصور تعلیم گاہ کا تصور بعد میں اسکول وحیدیہ ہوسٹل اور گرلس کالج کی عمارات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یو پی سے جاکر ملا جس کے نتیجہ میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو لڑکیوں کا پہلا مدرسہ بالائے قلعہ علی گڑھ کے ایک مکان میں استانی اختری بیگم کی نگرانی میں قائم ہوا[1] جہاں بچیاں پردہ دار ڈولیوں میں لائی جاتی تھیں جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو قریب کے محلہ بنی اسرائیلان کے ایک مکان میں اسکول کو منتقل کر دیا گیا۔

شیخ عبداللہ نے اسکول کے لئے ۱۹۱۰ء میں چودہ بیگہ زمین خریدی جو نانک رائے باغ کے نام سے موسوم تھی اور مدرسہ کی عمارت کا سنگ بنیاد ۷ نومبر ۱۹۱۱ء کو یوپی کے لفٹنٹ گورنر کی اہلیہ لیڈی پورٹر نے رکھا۔ اس تقریب میں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی سب نے شرکت کی۔

اسی دوران فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اسی کے تحت ۱۹۱۳ء میں لیڈیز کانفرنس وجود میں آئی[2] جس کا اعلان عرصہ دراز سے متواتر رسالہ "خاتون" میں شائع ہو رہا تھا ایسوسی ایشن کے مقاصد مدرسہ کی عمارت کے افتتاح کے موقع پر واضح کر دیئے گئے جس کی صدر نواب بھوپال سلطان جہاں بیگم اور معتمد نفیس دلہن (بیگم حبیب الرحمٰن خاں شیروانی) ہوئیں۔ اس کے جلسے ہر سال ہوتے تھے جس میں شرکت کے لئے روشن خیال خواتین مثلاً زہرہ فیضی، اور محمودہ بیگم (مولوی ذکاءاللہ کی بہن) وغیرہ دوسرے شہروں سے آتیں، دوران گفتگو تعلیم نسواں اور اولاد کی تعلیم و تربیت کے مسائل اٹھائے جاتے اور خواتین تعلیم نسواں کی ترویج کے لئے مختلف جگہوں کے دورے کرتیں اور گاہ بہ گاہ مدرسوں کا معائنہ کرتیں۔ طالبات کے لئے وظائف کا انتظام کیا جاتا اور کتابیں اور رسائل فراہم کئے جاتے۔ عورتوں کے حقوق کی مانگ اور ان کو حاصل کرنے کی سعی کی جاتی تھی فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن کا بنیادی مقصد

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۹ دسمبر ۱۹۰۶ء خط شیخ عبداللہ ص ۱۰

[2] انڈین لیڈیز کانفرنس کا پہلا جلسہ دسمبر کے آخری ہفتہ ۱۹۰۷ء میں میتھوڈسٹ کالج کلکتہ میں منعقد ہوا اسی کے نمونے پر علی گڑھ میں لیڈیز کانفرنس ہوئی۔

مسلمان طالبات کی تعلیم کا انتظام، مستحق اور نادار طالبات کی امداد اور جمع شدہ رقم سے اکثر شہروں میں چھوٹے تعلیمی ادارے قائم کرنا تھا جس سے آگے چل کر خواتین کی تعلیم کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ ایسوسی ایشن اب بھی کام کر رہی ہے اور اس کا دفتر عبداللہ لوج میں ہے۔

علی گڑھ میں گرلس کالج کے قیام کو کچھ اشخاص مدرستہ العلوم کے لئے مسلسل خطرہ تصور کرتے تھے لیکن بحث و مباحثہ کے بعد طے ہوا کہ جہاں اسکول ہے وہیں کالج بھی قائم ہونا چاہیئے چونکہ گرلس اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ پردے کا معقول انتظام تھا تو اسی نہج پر کالج بھی ہوگا۔

۱۹۱۴ء میں نواب بیگم بھوپال نے بورڈنگ ہاؤس کا افتتاح کیا جو ہندوستان میں مسلمان لڑکیوں کا پہلا بورڈنگ ہاؤس تھا جہاں ان کی تربیت وتہذیب پر زور دیا جاتا تھا۔ اس میں پہلی داخل ہونے والی لڑکیوں میں خود شیخ عبداللہ کی تین لڑکیاں تین ان کی سالی کی اور دو لڑکیاں باہر کی تھیں جس میں ایک بلند شہر سے آئی جو وحید جہاں بیگم کی سہیلی میمونہ بیگم کی لڑکی تھی یوں بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والی لڑکیوں کی مجموعی تعداد نو تھی۔

مسلمانوں کے ذہن تعلیم نسواں کے لئے کچھ حد تک تیار ہو چکے تھے لیکن لڑکیوں کو گھر سے باہر رکھنے کا خیال مشکل امر تھا۔ جب بورڈنگ ہاؤس کی ابتداء ہوئی تو بقول میر ولایت حسین لڑکیوں کی تعلیم تو خود ایک مسئلہ ہے۔ کیا بورڈنگ ہاؤس ؟ کون مسلمان اپنی بچی کو بورڈنگ ہاؤس میں بھیجے گا؟ جواب میں شیخ عبداللہ نے کہا کہ آپ کی لڑکیاں بھی آکر اس میں رہیں گی اور بعد میں ایسا ہی ہوا۔

بورڈنگ ہاؤس میں وحید جہاں[1] (بیگم شیخ عبداللہ) نے خود رہنا شروع کر دیا تا کہ

---

[1] شیخ عبداللہ کی شادی دہلی کے ایک باعزت گھرانے کے رئیس ابراہیم بیگ کی چھوٹی صاحبزادی وحید جہاں سے ۲ فروری ۱۹۰۲ء کو ہوئی۔ جو ساری عمر شوہر کی مونس اور تعلیم نسواں کی حامی رہیں۔ طالبات میں وہ اعلیٰ بی کہلائی جاتی تھیں۔

لڑکیوں کی دیکھ بھال مناسب طریقے پر ہو سکے۔ گویا وہ لڑکیوں کی پہلی پھوسٹ تھیں
لورڈنگ۔ ہاؤس میں کھانے پینے، کھیل کود اور پڑھائی کے اوقات مقرر تھے اس کے علاوہ
صفائی ستھرائی اور طالبات کی گفتگو اور نشست و برخاست پر زور دیا جاتا تھا۔

بورڈنگ ہاؤس کے قیام سے اسکول کو فائدہ پہنچا کہ علی گڑھ سے باہر کی کافی لڑکیوں
کے داخلے ہوئے ۱۹۱۶-۱۷ء میں پہلی مرتبہ اس اسکول کی لڑکیوں نے گورنمنٹ مڈل اسکول
کے امتحان میں شرکت کی اور ایک طالبہ حنیفہ خاتون کو اول آنے کی وجہ سے وظیفہ ملا۔ ۱۹۱۹ء
میں یہ مدرسہ گرلس ہائی اسکول ہو گیا اور اس کا الحاق یوپی بورڈ سے ہوا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی چانسلر علیا حضرت سلطان جہاں بیگم بھوپال نے ۲۸ دسمبر
۱۹۲۲ء کو تعلیم اسناد کے پہلے جلسے میں کہا:

"ہمیں شعبۂ تعلیم نسواں سے بھی تغافل نہیں کرنا چاہیئے۔ گزشتہ زمانے میں اس کی جانب سے سخت غفلت برتی گئی ہے۔ اب جب کہ تعلیم کا انتظام آپ کے ہاتھوں میں ہے اور یونیورسٹی کو اختیار ہے کہ اپنی ضروریات کے مطابق نصاب بنائے اور طریقہ امتحان میں ترمیم کرے تو اس معاملہ میں ایک لمحہ کی دیر بھی ناقابل معافی ہے۔ آپ کے یہاں ایک اچھا اسکول موجود ہے اور آپ اس کو یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم نسواں کا عمدہ نمونہ بنا سکتے ہیں۔"[1]

گرلس ہائی اسکول ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ ہو گیا حالانکہ علی گڑھ میں لڑکیوں
کی تعلیم کے لئے یونیورسٹی موجود تھی لیکن اس سے ابتک لڑکیوں کے کالج کا کوئی تعلق
نہ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین (وائس چانسلر) کی سفارش پر اس کا الحاق
سو روپے ماہانہ امداد کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔ اب کالج کی توسیع کے
لئے کسی قابل پرنسپل کی تلاش ہوئی تو شیخ عبداللہ کی منجھلی صاحبزادی خاتون جہاں
سرکاری وظیفہ پر دو سال کے لئے انگلستان گئیں اور لیڈز یونیورسٹی میں ایجوکیشن

---

[1] ایڈریس علیا حضرت نواب بھوپال سلطان جہاں بیگم مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۲۲ء ص ۲

میں ڈگری حاصل کی اور واپس آکر گرلس کالج کی پرنسپل مقرر ہوئیں۔

۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں شیخ عبداللہ کے ایما پر لڑکیوں کے لئے بی اے کلاسوں کے انتظام کی تجویز رکھی گئی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے ۳۱ مارچ ۱۹۳۴ء بمقام میرٹھ زیر صدارت جسٹس عبدالقادر تجویز نمبر ۲ منظور ہوئی کہ مسلمان لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ میں موجودہ انٹرمیڈیٹ کالج میں بی اے کا انتظام کیا جائے اور قوم سے چندہ کی اپیل کی جائے[1] پھر ۱۹۳۵ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ رامپور میں شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کیلئے بی اے کی تجویز کو بہت پرزور طریقہ پر پیش کیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مضمون لکھا کہ اگر کالج میں بی اے کا انتظام نہیں ہوتا تو لڑکیاں نقاب میں یونیورسٹی کی بی اے کلاس میں شرکت کریں گی اور اس وقت تک باز نہیں رہیں گی جب تک استاد ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر نہ نکال دے۔ وائس چانسلر ضیاءالدین اور عظمت الٰہی زبیری رجسٹرار نے پوچھا کہ اگر لڑکے تعلیم کے لئے گرلس کالج جائیں تو کیا ہوگا؟ شیخ عبداللہ نے جواب دیا تو پھر انھیں بھی نقاب میں آنا ہوگا۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۵ء میں ایک بورڈنگ ہاؤس چھیاسی ہزار کی لاگت سے تعمیر ہوا اور سمپورن آنند وزیر تعلیم حکومت یوپی نے اس عمارت کی دیکھ ریکھ کے لئے تین ہزار سالانہ کی امداد منظور کی اور اسی سال سے بی اے کی کلاسیں شروع ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء کے سیشن میں وائس چانسلر سرشاہ سلیمان نے گرلس کالج کا لئے پانچ ہزار سالانہ کی رقم کردی اور ۱۹۳۸ء میں سائنس لیبرٹریز کے لئے وزیر تعلیم یوپی سے بیس ہزار روپے موصول ہوئے اور ۱۹۴۴ء میں گرلس کالج کے لئے حکومت یوپی نے امداد بڑھا کر اٹھارہ ہزار پانچ سو روپے سالانہ مقرر کی۔

---

[1] مرقع کانفرنس از ۱۸۸۶ء تا ۱۹۳۴ء مرتبہ انوار احمد مارہروی مطبع مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۲۰۲

حصول آزادی کے بعد مولانا آزاد ابوالکلام آزاد مرکزی وزیر تعلیم علی گڑھ ۱۹۴۹ء میں آئے تو گرلس کالج کا بھی معائنہ کیا اور اس کی کارکردگی سے متاثر ہوکر نو لاکھ روپے سالانہ کی گرانٹ کا اعلان کیا اور یہ بھی کہ جب مسلم یونیورسٹی کو سرکاری امداد ملے گی تو اس میں کالج مذکور کا مقصد یہ حصہ ہوا کرے گا۔ چنانچہ اب گرانٹ چھپن لاکھ سے زائد ہوگئی ہے۔

وحید جہاں (بیگم عبداللہ) اکثر لڑکیوں سے کہا کرتی تھیں کہ تمھارے پاپا میاں (شیخ عبداللہ) ہمہ وقت تمہارے ادارے کے متعلق سوچتے رہتے ہیں کہ

"یہاں لائبریری بنے گی، یہاں ڈراموں کے لئے اسٹیج، یہاں کالج آڈیٹوریم، یہاں بچیاں کھیلا کودا کریں گی، یہاں کورٹ ہوں گے، یہاں سوئمنگ پول بنے گا اور یہاں رائڈنگ اسکول ہوگا"۔

۱۹۵۶ء میں کالج کی جدید اور وسیع عمارت تعمیر ہوئی جس میں سائنس اور آرٹس کے مختلف مضامین کے لئے کمرے ہیں مصوری کا شعبہ بھی کھولا گیا جہاں ایم اے تک پڑھائی ہوتی ہے لڑکیوں کا اقامتی کمپلیکس "عبداللہ ہال" کہلاتا ہے اسی میں گرلس اسکول اور ویمنس کالج عمارات بھی ہیں ہوسٹل کی تعداد بڑھ کر اب پانچ ہوگئی ہے جس میں تقریباً ہزار طالبات رہتی ہیں۔ پروفیشنل کورس کی لڑکیوں کی رہائش کے لئے سروجنی نائیڈو ہال ویمنس پالی ٹیکنک سے ملحق ہیں جس میں ریسرچ اسکالرز، میڈیکل اور انجینئرنگ اکی فیکلٹی کی طالبات رہتی ہیں موجودہ صورت حال کو دیکھ کر شیخ عبداللہ کا خواب بڑی حد تک پورا ہوتا معلوم ہوتا ہے اور امید ہے وقت کے ساتھ ساتھ مزید توسیع ہوگی۔

مدرسہ قائم کرتے وقت شیخ عبداللہ کے ذہن میں جو منصوبہ تھا اس میں نہ صرف علی گڑھ بلکہ پورے ملک کی لڑکیوں کی تعلیم مقصود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ویمنس کالج اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں ہندوستان کے مختلف گوشوں اور مذہبوں کی طالبات کے ساتھ بیرونِ ملک کی لڑکیاں بھی زیر تعلیم ہیں جن کی تعداد چار ہزار سے کم نہ ہوگی بلاشبہ اس ادارے نے خواتین میں علم کی روشنی اور خود اعتمادی کی لہر پیدا کی ہے۔

مستشرقین

مغرب کے وہ عالم مستشرقین کہلاتے ہیں جنھوں نے مشرقی ممالک کی زبانوں ثقافتوں اور دیگر علوم میں مہارت پیدا کی اور تحقیق کے نئے گوشے دریافت کیے۔ مستشرقین میں کچھ کی دلچسپی تو محض تبلیغ مذہب سے تھی اور کچھ نے علمی تجسس کی بناء پر مشرق کا مطالعہ کیا۔ مثلاً گوئٹے (۱۷۴۹ء-۱۸۳۲ء) پشکن (۱۷۹۹ء-۱۸۳۷ء) اور وکٹر ہیوگو (۱۸۰۲ء-۱۸۸۵ء)

یہاں صرف ان چند مستشرقین کا انتخاب کیا گیا ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ سید احمد خاں سے وابستہ تھے۔ ان میں سے بعض کا تعلق براہ راست علی گڑھ تحریک سے تھا اور بعض نے اپنے ملک میں بیٹھ کر علی گڑھ کی تعلیمی اور علمی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

گارسین دتاسی GARCIN DE TASSY

گارسین دتاسی انیسویں صدی کا وہ فرانسیسی مستشرقین تھا جس نے ایک مختلف کلچر اور ماحول میں رہ کر اردو زبان و ادب اور تاریخ کے عصری حالات پر لکھنے کے ساتھ ساتھ تحقیق کے ایسے گوشے دریافت کیے جو خود اہل زبان کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اس نے ہندوستان کی تازہ ترین تخلیقات پر تبصرے کیے اور ان کے ترجمے بھی اس کی پیدائش ۲۰ جنوری ۱۷۹۴ء کو جنوبی فرانس کی بندرگاہ مارسیلز میں ہوئی وطن میں ہی ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ یہیں اس نے استاد جبریل طاویل سے عربی شروع کی پھر مصری عالم رفایل دموناشی سے درس لیتا رہا۔ اس زمانے میں مغلیہ اور عثمانی

دولت وثروت کی جو الف لیلوی داستانیں یورپ میں مشہور تھیں ان کی وجہ سے دتاسی کو مشرق میں دلچسپی پیدا ہوئی اس کے علاوہ چونکہ اس کا والد مارسیلز کا خوشحال تاجر تھا اس کے یہاں مشرق سے آمد ورفت کا سلسلہ رہتا تھا تو وہاں کی زبانوں کو سیکھنے کا شوق بھی فطری تھا۔

گارسین دتاسی نے ۲۲ سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے پیرس کا سفر کیا۔ اور وہاں کے مدرسۃ السنہ کے عربی عالم پروفیسر سلوستر دساسی کی رہنمائی میں، عربی فارسی اور ترکی میں مہارت حاصل کی اور ان زبانوں کا ڈپلومہ لیا۔

۱۸۲۱ء میں اس نے عزالدین مقدسی کی کتاب "کشف الاسرار من حکم الطیور والازھار" کا بعد تصحیح وتقابل فرانسیسی میں ترجمہ کیا جس سے اس کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ ۱۸۲۲ء میں پیرس کی انجمن مستشرقین "سوسیتے از یاتک" کا اسسٹنٹ سکریٹری اور لائبریرین مقرر ہوا، اسی سال اس نے مشرقی ادب پر ایک بسیط خطبہ دیا جو "یونیورسلی میموار" میں شائع ہوا۔

گارسین دتاسی نے اردو کسی استاد کے بغیر سیکھی۔ یہ ضرور ہے کہ عربی وفارسی جاننے کی وجہ سے اردو سیکھنے میں مدد ملی۔ اس سلسلے میں وہ تین بار انگلستان گیا اور ہندشناس جان شیکسپیئر سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسے اپنا اردو استاد تسلیم کیا حالانکہ کبھی باقاعدہ درس نہیں لیا۔ انگلستان میں اس کی ملاقات ڈبلیو ایف ایلن (مدیر انڈین میل) سے ہوئی۔ ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن کے سکریٹری ایڈون نورس، ڈنکن فوربز[1] اور دیگر مستشرقین سے ملنے کا ذکر اس کے خطبات میں ملتا ہے اس کی مراسلت ہندوستان کے مصنفین، ناشرین اور اخبار کے مدیروں سے تھی۔

---

[1] ڈنکن فوربز نے ہندوستانی انگریزی لغت مرتب کی اور آرنوٹ کے ساتھ مل کر لندن میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا یہ دونوں گل کرسٹ کے شاگرد تھے۔

۱۸۲۸ء میں اسے مدرسہ السنہ شرقیہ پیرس میں عارضی طور پر اردو کی معلمی تفویض ہوئی اور ۱۸۲۹ء میں اُس نے طلبار کے لئے سو صفحے کی اردو گرامر لکھی اس سے پہلے اس نے میر تقی میر کی مثنوی "تبنیہ الجہال" کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۲۵ء میں پیرس سے شایع کیا۔ دیوانِ ولی پہلی بار ۱۸۳۳ء میں بڑی تقطیع کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل مطبع شاہی پریس سے طبع ہوا اور اس کے منتخب اشعار کا ترجمہ ۱۸۳۴ء میں۔ تاریخ ادبیات ہندی اور ہندوستانی کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں شایع ہوئی۔ اس نے ژورنال ازیاتک پیرس (ایشیاٹک جرنل) ۱۸۵۶ء میں سید احمد خاں کی "آثار الصنادید" پر مفصل تبصرہ کیا جس کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

"گزشتہ چند سالوں میں ہندوستانی (اردو) میں جو مفید ترین تخلیقات شایع ہوئیں ان میں یقیناً سید احمد خاں کی کتاب "دہلی" سے متعلق بھی شامل ہے۔ وہ دہلی میں مجسٹریٹ ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں جو اسی زبان میں چھپیں جن میں پیشِ نظر کتاب ہے۔ یہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کی عام بول چال کی زبان ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق ان کے آباؤ اجداد عرب تھے جو بعد میں ہرات میں سکونت پذیر ہوئے اور اکبر بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ اس وقت سے اب تک اس خاندان کے افراد ممتاز خدمات پر مامور ہوتے رہے اور بادشاہ عالمگیر ثانی نے سید احمد خاں کے دادا کو ہزار پیدل اور سپاہیوں اور پانچ سواروں کی کمان دی تھی یہی خدمت ان کے والد کے سپرد تھی اور مصنف کو بھی تفویض ہوئی۔ ان کے نانا کو دہلی کے بادشاہ نے وزارت کے عہدہ پر مامور کیا آثار الصنادید پر بطور ماٹو یہ فارسی شعر لکھا ہے جس سے کتاب کے نام کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ

از نقشِ در و دیوارِ شکستہ آثار پدید است صنادید عجم را

جس کے معنی ہیں کہ منہدم در و دیوار کے نقش سے ایرانی النسل

حکمرانوں کے آثار نمایاں تھے۔

پیشِ نظر کتاب کا اصل حصّہ وہ ہے جو دہلی کی قدیم و جدید عمارتوں کے باب میں ہے، اس میں نقشے ہیں جو عمارتوں کو اصل شکل میں پیش کرتے ہیں اور عمارتوں سے کتبے بھی نقل کئے گئے ہیں۔

شروع کے ایک باب میں تاریخی تذکرہ ہے جو کتاب کا کام دیتا ہے جس کے مقدمہ میں دہلی کے حکمرانوں کے حالات ہیں پھر ایک باب میں دہلی کے تاریخی قلعوں کا ذکر ہے ایک اور باب میں ان عمارتوں کی تفصیل ہے جو اس شہر میں مختلف بادشاہوں اور امیروں نے تعمیر کروائی تھیں۔ ضمیمے میں ۱۶۹ نقشے مذکورہ عمارتوں کے ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر وہ نسخہ ہے جو کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء کا ہے۔ اس اشاعت کو سابقہ ایڈیشن کو مکمل نظر ثانی کے بعد قابل ذکر اضافوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس بارے میں مصنف نے جو تفصیلات دی ہیں ان میں سے چالیس ماخذات کا ذکر کیا ہے جن سے تصنیف میں مدد لی گئی ہے اور ان کا حواشی میں جا بجا ذکر ہے۔ ان میں خلاصۃ التواریخ، سلسلۃ الملوک، مہابھارت، بھگوت گیتا، تاریخ فرشتہ تو زکِ جہانگیری، توزکِ تیموری، اکبر نامہ، تاریخ کثیر، پوتھی اندر پرست اہم ہیں لیکن کتاب کے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سید احمد نے زیادہ تر انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا ہے گو وہ صرف دو کا اعتراف کرتے ہیں۔ دہلی کی انجمن آثار قدیمہ کی یادداشتیں اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی نشریات۔

میں یہاں دیباچہ کے تین صفحوں کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جو دہلی کے بادشاہوں سے متعلق ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد شاید قارئین بھی وہی رائے قائم کریں جو میری ہے۔ مصنف کا طریقۂ کار یہ ہے کہ کتاب میں ۱۲۴ عمارتوں کا بیان ہے جنھیں شروع میں بطور عنوان اور پھر جدول میں ان کی تفصیل دی ہے، مثلاً سلسلہ نمبر عمارتوں کے مختلف نام، شہر یا محلہ جہاں وہ موجود ہے، تاریخ تعمیر، ہجری اور عیسوی دونوں تقویموں میں اور عمارت کی خاص خاص خوبیاں۔

سید احمد کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس سے واقفیت حاصل کی جائے
اور میں اپنے ارادہ پر قائم ہوں کہ جیسے ہی موجودہ کاموں سے فرصت ملے گی فوراً
اس کے ترجمے کی طرف متوجہ ہونگا۔"[1]
وعدے کے مطابق اس نے آثار الصنادید کا فرانسیسی ترجمہ ۱۹۴ صفحات میں
لیتھو پر مطبع شاہی پریس سے ۱۸۶۱ء میں شائع کیا۔ نظر ثانی کا کام فیلکس
بوترو پرنسپل دلی کالج نے کیا۔ شروع کے چار صفحوں کے دیباچہ کی ابتداء میں وہ
لکھتا ہے کہ "جب سے دہلی پر سر آرچ ڈیل ولسن نے حملہ کر کے قبضہ کیا ہندوستان کے اس پرانے
پایۂ تخت میں سوائے کھنڈروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔"[2]

پھر مترجم نے ابواب ۱۲ و ر ۳ کا ترجمہ کیا جو آثارِ قدیمہ کی تشریح پر مشتمل ہیں
اس کا اصل سے مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عبارت خلاصہ ہے تاکہ فرانسیسی
قارئین کے لئے ضروری معلومات قابلِ فہم ہو سکیں۔ البتہ فارسی اشعار بعینہٖ نقل ہیں۔
اور ساتھ ہی ان کا مطلب فرانسیسی میں لکھدیا ہے۔ اس ترجمہ پر رائل ایشیاٹک
سوسائٹی لندن نے سید احمد خاں کو اپنا اعزازی رکن مقرر کیا اور ان کی خدمات کے
اعتراف میں اخبار سینٹیفک سوسیٹی علی گڑھ میں مندرجہ ذیل نوٹ چھاپا۔

گارسین ڈطاسی صاحب

(منقول از اخبار عالم)

"...... مونیشو گارسین ڈطاسی صاحب بہادر جو ممبر اعلیٰ دلا انسٹی ٹیوٹ پیرس
دار السلطنت ملک فرانس کے ہیں علوم متعارفہ اور زبان مختلفہ میں بڑی لیاقت
اور عمدہ فضیلت رکھتے ہیں۔۔۔۔ فصاحت عبارت فارسی اور اردو کی باوجودیکہ
صاحب ممدوح نے کبھی ملک ہندوستان اور فارس میں تشریف لاکر یہ زبان

---

[1] ژورنال ازیاتک پیرس۔ شمارہ نومبر دسمبر ۱۸۵۶ء ص ۵۳۲ - ۵۳۵
[2] اخبار سینٹیفک سوسیٹی علی گڑھ، ۱۹ اپریل ۱۸۶۷ء ص ۲۴۸

نہیں سیکھی ہے پھر بھی ایسی عمدہ ہے کہ جس کی فصاحت اور بلاغت قابل ہزار ہزار تحسین و آفریں کے ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ السنہ مختلف ملک یورپ میں بھی صاحب ممدوح کو استعداد کامل حاصل ہے۔ خوبی یہ ہے کہ بحالت ایسے عمدہ جوہر اور فضیلت بے نہایت کے اخلاقِ کریمہ اور اشفاقِ عمیم خداداد حاصل ہے۔ سبحان اللہ انکسار اور فروتنی صاحب ممدوح کی ذات فیض آیات میں ایسی ہے کہ جیسی بڑے بڑے بزرگوں اور تارک الدنیا اہلِ دل میں ہوتی ہے ؛؛

"خطبات گارسین دتاسی" (۱۸۵۰ء ۱۸۷۷) میں وہ ہر تعلیمی سال کے آغاز پر ہندوستان کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں لیکچر دیتا تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

" پچھلے برسوں میں ہندوستان میں جو علمی و ادبی انجمنیں قائم ہوئیں وہ برابر اپنا کام کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے اہم علی گڑھ انجمن ہے جس کے بانی ایک ممتاز مسلمان سید احمد خاں صدر الصدور بنارس ہیں ؛؛

مزید اطلاع فراہم کرتا ہے کہ

" اس انجمن سائین ٹیفک سوسائٹی نے اہم انگریزی تصانیف کے اردو ترجمے کا انتظام کیا ہے اس کے علاوہ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ پابندی سے نکلتا ہے اس پرچے سے سالانہ خطبہ کی تیاری میں مدد ملتی ہے اور اس میں ایک مدرسہ کھولنے کی تجویز ہے جہاں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوگا یہ خوشخبری بھی سناتا ہے کہ آٹھ جنوری ۱۸۷۷ء کو وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی ؛؛[1]

وہ ہندوستانیوں سے ملنے کا خواہاں رہتا۔ ۱۸۷۴ء میں جب سید محمود پیرس آئے تو ان سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ اپنے گھر مدعو کیا اور سید احمد خاں کے لئے بطور تحفہ اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" بھیجی۔ گارسین دتاسی کی وفات ۲ ستمبر ۱۸۷۸ء کو پیرس میں ہوئی اور پار سیلز کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

---

[1] مقالات گارسین دتاسی جلد دوم بہ نظر ثانی ڈاکٹر حمید اللہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نمبر ۱ ۱۹۶۴ء ص ۵۱۱

جی۔ الیف آئی گراہم G.F.I. GRAHAM

گراہم وہ انگریز مستشرق تھا جس کو سید احمد خاں اور ان کے مدرستہ العلوم سے قربت اور محبت تھی اور بارہا مختلف موقعوں پر دونوں کا ساتھ رہا تھا۔

۱۸۶۴ء میں سائینٹیفک سوسائٹی کا پہلا اجلاس غازی پور میں ہوا تو سید احمد خاں اور کرنل گراہم نے مل کر اس کے قوانین وضع کئے وہ اس وقت وہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر متعین تھا۔

ڈیوڈ لیلی ویلڈ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انجیل کی تفسیر کے کام میں سید احمد خاں نے اکثر مسائل میں گراہم سے بھی رائے لی ہو گی اور جب یہ تفسیر (تبئین الکلام) (۱۸۶۲ء ۔ ۱۸۶۵ء) غازی پور میں چھپی تو انھیں بڑی مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن گراہم نے ہمت افزائی اور تعریف کی کہ یہ کتاب حضرت عیسٰی کی پیدائش اور ان کے خاندانی شجرہ کے متعلق نئی معلومات فراہم کرتی ہے۔[1]

گراہم اور آکلینڈ کالون نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو بنارس میڈیکل پریس سے پنیسٹھ صفحات پر محیط ۱۸۷۳ء کا مطبوعہ ہے۔ اس پر نام کی جگہ صرف یہ درج ہے کہ ان کے دو یورپین دوستوں نے ترجمہ کیا لیکن گراہم نے تمہید میں وضاحت کردی ہے کہ یہ ترجمہ اس نے آکلینڈ کالون کے ساتھ مل کر کیا ہے تاکہ وہ لوگ جو اردو سے ناآشنا ہیں۔ اس ترجمہ کی وساطت سے سید احمد خاں کے سیاسی

---

1) DAVID LELYVELD : ALIGARH'S FIRST GENERATION, PRINCETON UNIVERSITY PRESS, NEW JERSEY, L978, P. 76.

خیالات سے واقف ہو سکیں۔

سید احمد خاں کے اس انگریز رفیق کا تقرر کسی شہر میں ہو وہ اکثر و بیشتر ان کے پاس علی گڑھ آجاتا تھا۔ کالج کے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ کافی وقت گزارتا۔ ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتا۔ کھیل کود اور دیگر سرگرمیوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ سید احمد خاں کے پوتے راس مسعود کی تقریب بسم اللہ پر سر جان اسٹریچی کے ساتھ اس نے بھی شرکت کی تھی۔

بانیٔ درسگاہ سے عقیدت کے پیش نظر اس نے جب اُن کی بے لوث خدمات پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ستمبر ۱۸۸۴ء میں علی گڑھ آکر اس نے ان سے ذکر کیا کہ وہ سید احمد خاں پر ایک مضمون لکھنا چاہتا ہے تو انھوں نے سختی سے منع کیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے جس کے بارے میں لکھ کر وقت ضائع کیا جائے لیکن اس کے مزید اصرار پر کہ "یہ ہندوستانی نوجوانوں کے مستقبل کے لئے مشعلِ راہ اور اہل انگلستان کے لئے سود مند ثابت ہوگا"۔ وہ راضی ہو گئے! اس سلسلے میں دوبارہ آکر اکتوبر میں اس نے کئی روز قیام کیا۔ سید احمد خاں کے خاندانی حالات، اوائل زندگی کے واقعات اور بعد کی مشغولیات کے متعلق معلومات حاصل کیں اور رفتہ رفتہ اتنا مواد جمع ہو گیا کہ اس نے مضمون کے بجائے کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

کرنل گراہم کی مجوزہ کتاب "سر سید کی حیات اور کارنامے"، ۶ر جنوری ۱۸۸۵ء کو لندن سے شائع ہوئی جو چار سو بارہ صفحات اور بارہ ابواب پر مشتمل ہے[1]

باب اول : پیدائش، خاندان، دہلی کا دربار اور اس عہد کے تاریخی حالات

باب دوم : دہلی کے آثار قدیمہ، بجنور میں سب آرڈینیٹ جج

باب سوم : قیام بجنور میں غدر، جیل پر حملہ، باغیوں سے گفت و شنید، یورپین

---

1) G.F.I. GRAHEM : THE LIFE AND WORK OF SYED AHMAD KHAN, WILLIAM BLACKWOOD AND SONS, EDINBURGH AND LONDON, L885.

افراد کا تحفظ میرٹھ کی روانگی پھر آبائی وطن دہلی جانا۔

باب چہارم: بغاوت ہند کے اسباب، لیجسلیٹو کاؤنسل میں کسی ملکی کی عدم شمولیت حکومت کی مذہبی معاملات میں مداخلت مشنری اسکول، مالیات اور آیئنِ مالگذاری، حاکم و محکوم کے مابین باہمی ہمدردی کی ضرورت۔ فوجی نظام

باب پنجم: لائل محمڈنز آف انڈیا اور تفسیر بائبل

باب ششم: علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی۔ افتتاحی تقریر، تراجم کا کام اور غازیپور اسکول۔

باب ہفتم: بدایوں میں ایجوکیشنل میٹنگ

باب ہشتم: سید احمد انگلستان میں سی ایس۔آئی کا خطاب

باب نہم: سفر کے دوران سید احمد خاں کے خطوط

باب دہم: لندن سے سید احمد کے خطوط۔

باب یازدہم: ہندوستان کی واپسی، سر ولیم میور سے بدگمانی، معاشرتی اصلاح اور مسلمانوں کی مخالفت۔

باب دوازدہم: ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" پر سید احمد کا جواب۔

باب سیزدہم: محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا سنگ بنیاد، سید احمد کی ملازمت سے سبکدوشی۔

باب چہاردہم: سید احمد وائسریگل کونسل میں۔ دکن ایگریکلچرسٹس ریلیف بل، ایجوکیشن کمیشن، سفر پنجاب

گراہم نے اپنی کتاب میں سید احمد سے انگلستان میں ملاقات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے کہ آخر مئی ۱۸۶۹ء میں دونوں ملے اور پھر یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ اس نے اپنے بزرگ دوست کو مختلف موقعوں پر مدعو کیا اور ان کی ملاقات متفرق انگریز معززین سے ہوئی۔ اسے سید احمد خاں سے قریب رہنے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب میں چشم دید واقعات بے لاگ طریقے پر بیان کئے جس کی وجہ سے ان کی یہ اولین سوانح عمری معنویت اور حقیقت پسندی کی حامل ہے۔

طامس والکر آرنلڈ
THOMAS WALKER ARNOLD

آرنلڈ کی پیدائش بمقام لندن ۱۸۶۴ء میں ہوئی اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس نے کیمبرج یونیورسٹی کے میگڈانل کالج سے بی۔اے کیا اور دسمبر ۱۸۸۸ء میں بعمر تیئس (۲۳) سال فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے علی گڑھ آیا جہاں وہ دس سال تک رہا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے دوران قیام اس نے درس وتدریس کے علاوہ مختلف ادبی انجمنوں کے ذریعے علمی وادبی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ مثلاً شبلی اور آرنلڈ کے تعاون سے ۱۸۸۹ء میں "اخوان الصفا" کا قیام عمل میں آیا تاکہ طلباء میں علمی ذوق پیدا کیا جاسکے۔ "سٹڈنس (یونین) کلب کی بنیاد ماریسن نے ڈالی تھی لیکن اس کی سرگرمیوں میں آرنلڈ نے جان ڈالی۔ "انجمن الفرض" (ڈیوٹی سوسائٹی) کی تشکیل و استحکام میں بھی پروفیسر آرنلڈ نے خاص طور پر حصہ لیا۔

سید احمد خاں کے خیالات اور منصوبوں کو بروئے کار لانے اور ان کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے طلباء کو مشرق و مغرب کے افکار، تہذیب کلچر کے منفرد اور متضاد نظریات سے واقفیت کی ضرورت تھی ان کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کے لئے آرنلڈ نے ایک انجمن "کمیونٹی آف اسکالرز" قائم کی جس کے تحت طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دیگر ممالک میں بھیجا جاسکتا تھا۔

اس نے توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ وہ اور ماریسن مختلف موضوعات پر اسٹریچی ہال میں علی گڑھ والوں کے لئے خطبات دیتے تھے اور باہر کے دیگر عالموں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ یہ اس قدر مقبول ہوئے کہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

۱۸۹۷ء میں وہ علی گڑھ سے مستعفی ہو کر اورینٹل کالج لاہور کا پرنسپل مقرر ہوا۔ لیکن مدرستہ العلوم سے اس کا ذہنی اور جذباتی تعلق برقرار رہا۔ ۱۹۰۴ء میں ڈیوٹی سوسائٹی کے جلسے میں حالی نے الوداعی تقریب میں پُر درد نظم پڑھی کہ آرنلڈ کی طرح مخلص دوست اور انسان ملنا دشوار ہے جو باوجود غیر ملکی ہونے کے ہم میں سے ایک تھا۔

دوست اور پھر دوست بھی سچّا عجب نعمت ہے یہاں
ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں
دوست اور بھائی ہیں دونوں قوت بازو مگر
جب کروگے وزن پلہ دوست کا ہوگا گراں [1]

پروفیسر آرنلڈ کو طلباء اور اساتذہ میں قبولِ عام حاصل تھا۔ استادوں کے لیے آرنلڈ کی رفاقت سرمایۂ افتخار تھی۔ شبلی نے "سفرنامۂ مصر و روم" میں لکھا کہ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے استاد[2] لندن جارہے ہیں تو وہ بھی عازمِ سفر ہوئے:

"۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو میں علی گڑھ سے چل کھڑا ہوا۔۔۔ اور تمام راہ بڑے لطف و مسرت سے گذری۔۔۔۔ راستے میں آرنلڈ نے عربی پڑھنی شروع کردی" [3]

جہاز پر جب انھوں نے دو چار دن گوشت سے پرہیز کیا کہ ذبیحہ نہ ہوگا تو آرنلڈ نے تصدیق کروادی کہ پرندے اور جانور ذبح کیے جاتے ہیں[4] پھر مزید لکھا کہ

"جہاز پر مسٹر آرنلڈ وہ نہیں رہے جو علی گڑھ میں تھے۔ وہ متانت تھی نہ وہ کم آمیزی، اکثر ہنسی مذاق کیا کرتے، بچوں سے کھیلتے اور جہاز کی چھت پر اُچھلتے کودتے چلتے" [5]

پھر انھوں نے دورانِ سفر کا ایک واقعہ کا ذکر کیا:

"اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا میں سخت گھبرایا

---

[1] حالی: آرنلڈ کی رخصت ہندوستان سے:

[2] شبلی نے فلسفہ کے استاد آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی تھی۔

[3] علامہ شبلی نعمانی۔ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ محمڈن پریس علی گڑھ ۱۸۹۵ء ص ۴

[4] ایضاً " " " " ص ۵

[5] ایضاً " " " " ص ۵

اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑتا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے کہا آپ کو کچھ اضطراب نہیں بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائیگاں کرنا بے عقلی ہے۔"[1]

شبلی نے اس سفرنامہ میں ایک اپنا فارسی قصیدہ بھی شامل کیا ہے:

آرنلڈ آں کہ رفیق است ہم استاد مرا — پس دریں عرصہ بانگلینڈ ہمی خواست سفر

گفتم ایں صحبت وایں واقعہ نادر افتد — پس بعزم سفر ازجای بجستم مضطر[2]

حالی اور شبلی کے علاوہ بالخصوص اقبال سے آرنلڈ کو تعلق خاطر تھا۔ اقبال نے ان ہی کی وجہ سے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کرنے کا تہیہ کیا۔ دونوں کا دو سال تک ساتھ رہا جس کے دوران انھیں استاد کے علم و فضل اور ان کے نئے نظریات و افکار سے واقف ہونے کا موقع ملا اور اقبال کی شاعری میں اُن ہی کی تربیت سے فلسفیانہ رنگ، نئی فکر اور عصری رجحانات کی عکاسی ملتی ہے۔ مثلاً "طلوعِ اسلام" اور "نالۂ فراق" آرنلڈ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ پروفیسر آرنلڈ کے لاہور سے رخصت ہونے پر انھوں نے حسب ذیل احساسات کا اظہار کیا کہ

"تو کہاں ہے اے کلیم ذرۂ سینائے علم — تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم

اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم — تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند — خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو — توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

---

[1] علامہ شبلی نعمانی۔ سفرنامہ روم و مصر و شام، محمڈن پریس علی گڑھ ۱۸۹۴ء ص ۲۶

[2] ایضاً " " " " " " ص ۲۹

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تیری تصویر کو کیا تسلّی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو
تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"[1]

آرنلڈ نے بڑے ذوق و شوق سے اسلام کا مطالعہ کیا اور پھر "خلافت"، المعتز لہ، اسلامی مصوری، جہاد اور مغلیہ عہد کا فن جیسے موضوعات پر ژرف نگاہی اور محققانہ بصیرت سے قلم اُٹھایا۔ ان کی کتاب "دعوت اسلام" (پریچنگ آف اسلام) ۱۸۹۶ء میں لندن سے چھپی جو انھوں نے اپنی بیوی کے نام معنون کی۔

سید احمد خاں نے تبصرہ کیا کہ

"دعوت اسلام مصنفہ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ تمام ان کتابوں میں جو فی زمانہ تاریخ اسلام انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ اس کے مصنف آرنلڈ پروفیسر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے ہیں اس کتاب سے لائق مصنف کا یہ مقصد ہے کہ وہ اشاعتِ اسلام کی تاریخ پیش کریں جس سے معلوم ہو کہ اسلام کی اشاعت محض وعظ و ترغیب کے پُر امن وسائل سے ہوتی ہے یورپ کی تصانیف میں عموماً یہ ادعا کیا جاتا ہے کہ کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا اور اگرچہ اس خیال کا بارہا انکار ہوا لیکن اب تک حقیقی طور پر اس کی تردید مسلسل واقعات تاریخی سے نہیں کی گئی۔ البتہ جس لائق مصنف نے اس امر پر اپنی کوشش مبذول کی ہے ... کہ کیونکہ اسلام اول اول دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلا اور تبلیغِ اسلام کے لئے کیا کیا ذرائع اس وقت سے ابتک کام میں لائے گئے۔ واقعات تاریخی مفصلہ ذیل زبانوں کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ انگریزی، فرنچ، جرمن، اٹلین، اسپینی، پرتگالی، ڈچ، روسی، یونانی، لاطینی، عربی، فارسی اردو، گجراتی، روم اور وینس میں جو لاطینی اور اطالی زبان کے قلمی نسخے

---

[1] علامہ اقبال۔ کلیاتِ اقبال۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۶ء ص ۷۸

مل سکے ان سے بھی تمتع اٹھایا ہے اور اس ذریعہ سے یورپ میں اشاعت اسلام کے متعلق ایک بالکل جدید آگہی کا سرمایہ اس کتاب میں اضافہ کیا گیا ہے ..... انگریزی زبان کے پیرائے میں وہ پہلی بار لایا گیا ہے۔

یہ کتاب چھپنے کے لئے لندن کے ایک مطبع میں دی گئی تھی اور جیسا کہ عموماً دستور ہے مالک مطبع نے مسٹر باسورتھ یعنی "محمد اور محمد ازم" کے قابل قدر مصنف سے اس کتاب کے متعلق رائے طلب کی تھی۔ چنانچہ مسٹر باسورتھ کی رائے کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔ آپ نے جو قلمی نسخہ پر مضمون "دعوت اسلام" مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کا میرے حوالہ کیا ہے اس کو میں نے بغور و شوق تمام پڑھا انھوں نے اس مسئلہ پر ایک نئے پہلو سے نظر ڈالی ہے جس نے اس وسیع اور پھیلے ہوئے مضمون میں ایک ہیئت مجموعی پیدا کر دی ہے۔" [1]

اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں نکلا جس کا انتساب مارلین کے نام ہے۔ مصنف نے اپنی اس تصنیف کردہ تبلیغی مساعی کو تاریخ کہا ہے جو اسلام کی اشاعت کے لئے کی گئی ہے پھر رسول کریم کو بحیثیت مبلغ پیش کیا ہے۔ آرنلڈ کی دعوت اسلام تیرہ ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ دیباچہ میں انھوں نے ذکر کیا :

"میں سر سید احمد خاں بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل ایل ڈی کا شکریہ ادا کرتا ہوں نیز اپنے فاضل دوست اور رفیق کار شمس العلما مولوی شبلی کا احسان مند ہوں جنھوں نے اسلام کی تاریخ کے متعلق وسیع معلومات سے نہایت فیاضی کے ساتھ میری مدد کی۔" [2]

---

[1] سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، جلد اول، نمبر ۱، یکم رجب ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۲ء علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ۔ ص ۱۷۳ - ۱۷۴

[2] ٹی ڈبلیو آرنلڈ۔ دعوت اسلام مترجمہ شیخ عنایت اللہ محکمۂ اوقاف پنجاب لاہور ۱۹۷۲ء دیباچہ ص ۲

اس کے چند ابواب قابلِ ذکر ہیں :

مسلمانوں کی تبلیغی انجمن

اہلِ اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان مناظرہ

الہاشمی کا تبلیغی مراسلہ الکندی کے نام

وہ نومسلم جنھوں نے مبلغینِ اسلام کی براہِ راست تبلیغ کے بعد اسلام قبول کیا مثلاً کیولم، رسل ویب وغیرہ آخر میں مختصراً تبلیغ کے جدید اصولوں اور جہاد کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے ۔

آرنلڈ کی مذکورہ کتاب کا ترکی اور فارسی میں ترجمہ ہوا ۔ اردو ترجمہ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے چارسو تیس صفحات پر مشتمل محکمۂ اوقاف لاہور سے شایع کیا ۔ ان کی دیگر تصانیف میں " مغلیہ دور کے مصوّر" "خلفائے راشدین" "اسلام میں مصوری" مشہور ہوئیں ۔

میراثِ اسلام :۔ نامی کتاب تیرہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے ۔ جس کو آرنلڈ، آربری اور الفریڈ گیوم نے ۱۹۲۴ء میں آکسفورڈ سے طبع کیا ۔ اسی دوران آرنلڈ نے وفات پائی ۔ دیباچہ میں گیوم نے لکھا کہ

"اس میں شک نہیں کہ میرے رفیق کار سر طامس آرنلڈ کے بے وقت انتقال سے اس کتاب کو شدید نقصان پہنچا وہ ہر مقالہ نگار کے ذاتی دوست تھے اور ان کی وفات سے صرف علم و استشراق ہی کا ناقابل تلافی نقصان نہیں پہنچا بلکہ ان کے احباب کے قلوب میں بھی ایسا زخم پڑ گیا ہے جسے صرف زمانہ ہی مندمل کر سکتا ہے ۔

سر طامس آرنلڈ نے اس کتاب میں "اسلامی مصوری کی میراث" پر ایک باب لکھا جو نامکمل رہ گیا حالانکہ انگلستان میں اس موضوع پر ان کا علم بے انتہا وسیع تھا ۔"[1]

---

[1] میراثِ اسلام مرتبہ الفریڈ گیوم، مترجمہ اردو عبدالمجید سالک ۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء دیباچہ ص۱

اسلامیات کے موضوع پر دیگر مستشرقین نے پروفیسر آرنلڈ سے براہِ راست یا بالواسطہ فیض اُٹھایا اور اس کے غیر جانب دارانہ اعلیٰ معیار کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس کی عالمانہ موشگافیوں نے مسلمانوں کی ثقافت، مذہبی فکر اور معاشرت ہی کو اجاگر نہیں کیا بلکہ اس کی تحریروں نے دیگر اقوام کو بھی ذہنی بالیدگی اور علمی پختگی کی طرف مائل کیا۔[1]

تھیوڈور ماریسن THEODORE MORRISON

• تھیوڈور ماریسن کی پیدائش لندن میں ۱۸۶۳ء میں ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے اور ٹرائی پوس کرنے کے بعد وہ دو سال تک حکومتِ انگلستان کے شعبۂ تعلیم سے منسلک رہا۔

وہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ۱۸۸۹ء سے انگریزی کا استاد مقرر ہوا اور دس سال تک رہا۔ اس سے پہلے وہ ہندوستان میں بُندیل کھنڈ کے چھتولوں اور چرکھری ضلع ہمیر پور کے راجکماروں کا اتالیق بھی تھا۔ سید احمد خاں نے اپنے پوتے راس مسعود کو ماریسن کی رہائش گاہ پر اس کی نگرانی میں رکھا تاکہ بچہ کی تربیت باقاعدہ طور پر ہو سکے۔

۱۸۹۹ء کے اوائل میں اس نے مدرسۃ العلوم کی پروفیسری سے استعفیٰ دیدیا کیونکہ وہ پرنسپل بیک کی اندرونی معاملات میں مداخلت کی پالیسی سے متفق نہیں تھا اسی سال آخر اکتوبر میں اس نے ایم اے او کالج (مدرسۃ العلوم) کی پرنسپلی کا عہدہ سنبھالا اور اس پر پانچ برس ۱۹۰۵ء تک فائز رہا۔

پندرہ سالہ دورانِ قیام اس نے سرسید اور کالج کے تعلیمی معاملات میں پوری دلچسپی لی۔ اس نے نصاب کو بروقت ختم کرنے اور طلباء کی کلاسوں میں شرکت

---

[1] میراثِ اسلام مرتبہ الفریڈ گیوم، مترجم اردو عبدالمجید سالک مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ء۔ دیباچہ ص ۱۱

کو ضروری قرار دیا۔ اس کی سربراہی میں کامیاب طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوا۔
اس نے اپنی یونیورسٹی کیمبرج کے نمونے پر علی گڑھ کی اقامتی زندگی کو منظم کرنے
کی کوشش کی اس کے لئے پرووسٹ، وارڈن اور نظم وضبط کے لئے پراکٹر اور
اس کا عملہ مقرر کیا۔

تدریس کے علاوہ اس نے طلباء کی شخصیت کو سنوارنے میں علمی وادبی سرگرمیوں
تحریری وتقریری مقابلوں اور کھیل کود کا شوق پیدا کیا۔ مثلاً ۱۸۹۹ء میں اس نے
"رائڈنگ اسکول" قائم کیا جس میں وہ خود شریک ہوتا تھا اس نے "تنظیم الاخوۃ"
(برادرہڈ) کے ذریعہ پرانے طلباء اور درسگاہ کے مابین تعلق استوار کیا۔ اس کے
سالانہ اجلاس ۱۸۹۳ء کے موقع پر ماریسن نے جو تقریر کی وہ سید احمد خاں کو اس
قدر موزوں معلوم ہوئی کہ انھوں نے اسٹریچی ہال کے صدر دروازہ پر کندہ کروادی کہ

"جب ایک کام کو بہت سے آدمی مل کر کرتے ہیں تو اختلاف آراء ضرور
پیش آتا ہے جب تک ایسے کاموں میں کسی خاص امر کا فیصلہ نہ ہو اپنے
دلایل برابر پیش کرو اور جہاں تک ممکن ہو اپنی رائے کی تکمیل کے
لئے پیروی کرو کیونکہ تم اپنی رائے کو اس کام کے لئے بہترین خیال کرتے
ہو لیکن جس وقت کثرت رائے تمہاری رائے کے خلاف ہو جائے تو جو
کثرت رائے سے فیصلہ ہو اُسے اب صفائی کے ساتھ تسلیم کرو اور اس
کی تعمیل میں اس طرح دل سے کوشش کرو گویا وہ رائے تمہاری ہی تھی
اور اس پر اس طرح عمل کرو کہ اس میں کامیابی ہو۔۔۔۔۔ تم سب کو چاہیئے
کہ اپنے تمام ذاتی خیالات کو قومی فلاح کے کاموں میں دخل نہ دینے دو۔
اگر تم ایسا نہ کرو گے تو جو نتیجہ ہو گا وہ تم خود جانتے ہو۔ یہ ہی ہدایت
ہر ایک اسلامی تاریخ پر جلی قلم سے لکھی ہے۔ یہ بات تم کو اس
وقت جاننی چاہیئے تھی کہ جب سے تم نے ایک دوسرے کو
بھائی کے نام سے پکارا ہے۔ ان سنجیدہ الفاظ کو ہرگز لغو، مہمل

یا بے معنی آوازیں نہ سمجھو"[1]

وہ متوازن طبیعت کا مالک تھا۔ اگر کسی معاملہ میں اس کا اختلاف کالج کے سکریٹری محسن الملک یا متعلقہ دوسرے افراد سے ہوتا تو وہ اس کو مخاصمت کی بنیاد نہیں بناتا بلکہ اس نے اخوت اور سنجیدگی کی فضا برقرار رکھی۔ وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر بھی رہا۔ ۱۹۰۵ء میں اس کو الوداعی سپاسنامے پیش کئے گئے اور مولانا حالی نے اس موقع پر نظم پڑھی کہ

ہم سے ہوتے ہیں جدا اب آنریبل مارلیسن
چھینتا ہے ان کو ہم سے جذبۂ حبِّ وطن
سایہ اپنا سر سے کالج کے اٹھانے کو ہیں وہ
جس کے سر پہ تھے ہما کی طرح وہ سایہ فگن
مارلیسن اور مارلیسن بیگم نے یہ ثابت کر دیا
محبّت کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب مرد و زن[2]

اسی طرح ایک ایرانی طالب علم مرزا جمال الدین شیرازی نے اپنے جذبات کا اظہار کیا کہ

"منبع فضل وکمال است و ادب + معدن تربیت و حلم و وقار"[3]

مارلیسن نے جواباً تقریر کی کہ

"میں نے نہایت ہی خوشی کی زندگی علی گڑھ میں بسر کی اور میں کسی وقت بھی اس زندگی کو زیادہ آمدنی کی خدمت سے نہیں بدلتا۔ میں کیوں یہاں اس قدر خوش رہا ہوں اس کی وجہ یہ خیال ہے کہ میں ایک بڑے معاملے کی خدمت کر رہا تھا اور یہ کہ جس قدر مجھ میں قابلیت تھی اور

---

[1] اسپیچ تھیوڈور مارلیسن۔ مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی ۱۸۹۳ء ص ۱۵
[2] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یکم مارچ ۱۹۰۵ء ص ۷۔۸
[3] ایضاً ص ۷ تا ۸

جو میرا عہدہ تھا اس کے لحاظ سے میں ایک بڑی تحریک کی ترقی میں مدد دے رہا تھا اور رفتہ رفتہ کالج کی فتوحات اور کامیابیاں اپنے ذاتی اور مالی فوائد سے زیادہ محسوس اور معلوم ہوتیں" [1]

اس نے وطن واپس جاکر بحیثیت کرنل ملازمت کی اور تہتر سال کی عمر میں فروری ۱۹۳۶ء میں فوت ہوا۔

ویسے تو اس سے پہلے سڈنس اور بیک بھی کالج کے پرنسپل رہے تھے مگر مارلیسن کا شمار مستشرقین میں اس لئے کیا گیا ہے کہ اس نے "ہسٹری آف ایم اے او کالج" تہتر صفحات پر مشتمل پانیر پریس الہ آباد سے ۱۹۰۳ء میں شائع کی جو مدرستہ العلوم علیگڑھ کی چشم دید مستند تاریخ ہے اس وقت تک اس ادارہ کو وجود میں آئے صرف اٹھائیس سال ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر رہا تھا یہ تاریخ ایک ایسے شخص کی زبانی ہے جو مدرسہ میں خود پروفیسر، پروووسٹ اور پرنسپل رہا تھا اس کے ابتدائی تینتیس صفحات میں مدرستہ العلوم کے سنگ بنیاد سے لے کر ۱۹۰۳ء تک کے حالات مندرج ہیں اور بقیہ صفحات میں تعلیمی حالات کو مکمل کرنے میں کالج کی سالانہ رپورٹ ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۳ء آمدنی وخرچ اور طلباء کی تعداد شامل کر دی گئی ہے۔ وہ آغاز میں اس کی وضاحت کرتا ہے کہ

"دہلی کے پہلے شاہی دربار کے بعد لارڈ لٹن ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو مدرستہ العلوم کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے علی گڑھ آئے ...... اس میں یوم تاسیس سے لے کر تادم تحریر اس کی کارگذاریوں اور سرگرمیوں کا ایک جائزہ لیا گیا ہے" [2]

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲ر فروری ۱۹۰۵ء ص ۱۱

[2] تھیوڈر مارلیسن۔ تاریخ ایم۔ اے او کالج۔ پانیر پریس الہ آباد ۱۹۰۳ء ص ۱

"حکومت علی گڑھ کو چارٹر دے یا نہ دے مسلمانانِ ہند کا فریضہ اور ان کا فایدہ سیدھا سادا اس میں ہے کہ وہ ایم اے او کالج کی ترقی اور وسعت کی کوشش کریں اس کو عمارتوں سے مزین کریں اور فیاضانہ عطیوں سے مالا مال کر دیں یہاں تک کہ اسے ہندوستان کے سب سے برتر ادارہ کی پوزیشن پر پہنچا دیں۔ یہاں بہت سی لائبریریاں اور لیبوریٹریز ہوں جس کی طرف مسلمان طلبا سارے ہندوستان سے کھنچے چلے آئیں اور خود ایک الگ چھوٹی سی دنیا ہو جائے گا۔ یہ ایشیا میں مسلم کلچر کا مرکز اور اعلیٰ افکار اور اونچے مذہبی خیالات کا گہوارہ ہو جائے گا"[1]

انتخار عالم نے ۱۹۰۱ء میں مدرسہ کی پہلی تاریخ مطبع مفید عام آگرہ سے شائع کی تھی مگر مارلیسن کے خیالات میں سید احمد خاں کے افکار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

والٹر الیگزنڈر ریلے WALTER ALEXANDER RALEIGH

ریلے ۵ ستمبر ۱۸۶۱ء بمقام لندن (ہائی بری کواڈریٹ) ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کی چار بڑی بہنیں تھیں اور وہ سب سے چھوٹا تھا۔
اس کی ابتدائی تعلیم ہائی بری اسکول سے شروع ہوئی پھر وہ سٹی اسکول لندن میں داخل ہوا۔

۱۸۸۱ء میں بی اے پاس کر کے کیمبرج کے کنگ کالج میں داخل ہوا۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے ۱۸۸۳ء میں اسے تبدیل آب و ہوا کے لئے اٹلی کے سفر کا طبی مشورہ دیا گیا جہاں سے واپس آکر وہ تاریخ میں ٹرائی پوس کے امتحان میں کامیاب ہوا۔ اسی

[1] تھیوڈور مارلیسن۔ ہسٹری آف دی ایم اے او کالج۔ پائنیر پریس الہ آباد ۱۹۰۳ء ص ۳۳۔
اس کتاب کا تازہ ایڈیشن سرسید اکاڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام چیتنا پریس لکھنؤ ۱۹۸۹ء سے طبع ہوا۔

سال تھیوڈور بیک (جو اس کی بڑی بہن جیسی کا شوہر تھا) نے اس کو مدرسۃ العلوم آنے کی دعوت دی اور وہ اگست ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس کے متعلق انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اعلان ہوا کہ

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پڑھنے والے شاید اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے جدید پروفیسر انگلش لٹریچر کا حال سننے سے خوش ہوں گے یعنی مسٹر ریلے لندن اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے گریجویٹ ہیں۔ لندن میں صاحب موصوف نے اپنے پہلے اور دوسرے امتحان بی اے میں اول درجہ معہ درجہ اول آنرز کے انگریزی لٹریچر اور زبان دانی میں حاصل کیا۔ نیز صاحب موصوف یونیورسٹی کیمبرج کی یونین سوسائٹی کے پریذیڈنٹ اور "کیمبرج ریویو" کے ایڈیٹر تھے مسٹر ریلے کیمبرج میں اپنے زمانے کی نہایت مشہور و معروف شخصیتوں میں سے ہیں اور ان کی عقل و ذہانت کے سبب سے بہت سے شخص ان کے ثنا خواں ہیں اور ان کی نیک مزاجی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے ان کے دوست ان کے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں جب کہ مسٹر ریلے نے انگلستان چھوڑنے کا ارادہ کیا تو کیمبرج کے لوگوں نے افسوس کیا۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ صاحب موصوف اختتام پر کالج کھلنے سے تھوڑے دن بعد اپنے نئے عہدے پر آجائیں گے۔"[1]

پھر اس کی آمد کی اطلاع چھپی کہ "مسٹر ریلے کل صبح کو میل ٹرین سے یہاں رونق افروز ہوئے اور کالج کے تمام طلبا ران کے استقبال کے لئے اسٹیشن گئے۔"[2]

وہ علی گڑھ میں تقریباً دو سال رہا۔ ۱۸۸۷ء میں وہ پیچش میں مبتلا رہنے کی وجہ سے چھٹی پر گھر گیا اور پھر ہندوستان واپس نہ آسکا علی گڑھ سے لکھے گئے

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد دوم شمارہ ۵۴، ۱۱ جولائی ۱۸۸۵ء ص ۷۷۱

[2] ایضاً " " ۳ اکتوبر ۱۸۸۵ء ۱۰۸۴ - ۱۰۸۵

خطوط سے اس کی اسلام اور ہندستان سے قلبی لگاؤ کی شہادت ملتی ہے ۔یہاں کے دورانِ قیام اس نے اپنی والدہ بہنوں، دوستوں اور دیگر اشخاص کو خط لکھے جن میں علی گڑھ کے ماحول، تہذیب اور تعلیمی معیار کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ سید احمد خاں اور دوسری قابلِ ذکر ہستیوں کا بھی تذکرہ ہے۔

یہ خطوط اختصار کی خوبی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے بے لاگ تبصرے ہیں کیونکہ مکتوب الیہ اس کے ہم راز ہیں وہ مصلحت کی چادر اتار کر اپنے خطوں میں حقیقتِ حال بیان کرتا ہے۔ یہ اس کے نظریات اور علی گڑھ کی جھلکیوں کے عکاس ہیں جن میں ہندوستان کے کلچر، یہاں کے تیز تہوار مثلاً، رام لیلا کا میلہ، ہولی دیوالی کے تہوار مسلم معاشرہ میں عورت کا مقام اور یہاں کے رؤسا کے تہذیبی معیار سے بحث ملتی ہے اس نے وسط اکتوبر میں اپنی والدہ کو خط میں لکھا کہ

"ہم لوگ کل شام کو شہر علی گڑھ دیکھنے نکلے اور اس کی عجیب و غریب اور پُر اژدحام سڑکوں پر سے گذرے تو تھیوڈور (بیک) نے مجھ کو اُڑتی ہوئی چڑیوں کا ایک غول دکھایا جو عام کوؤں سے قدرے بڑی تھیں لیکن درحقیقت وہ عام چڑیاں نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی اونچی اڑنے والی چڑیاں ہیں۔" [1]

ایک اور خط میں آگرہ کا حال بیان ہے کہ

"تھیوڈور اور امجد علی مجھے شام کو جبکہ ابھی کچھ روشنی باقی تھی تاج محل دکھلانے لے گئے جسے شاہجہاں نے اپنی ملکہ کی محبت کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا تھا تاج کا حسن شام کی روشنی میں اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ چمکدار سفید سنگِ مرمر کے چاروں طرف باغ کے گہرے سبز رنگ کے درخت ایستادہ ہیں جس کرسی پر تاج محل بنا ہوا ہے۔ اس سے جمنا صاف نظر آتی

---

[1] لیٹرز آف سر والٹر ریلے۔ مرتبہ لیڈی ریلے۔ جلد اول۔ میتھو اینڈ کو۔ لندن ۱۹۲۶ء ص ۶۰

ہے اور یہ لمبا چوڑا پل کھاتا ہوا دریا شہر اور اس کے وسیع و عریض علاقے کے پاس سے گزرتا ہے ہم نے ایک ہندو نوجوان کو جو دریا کے نشیب میں نہا رہا تھا ایک ایسا محبت بھرا گیت گاتے ہوئے سنا جو بڑا دردناک اور لمبا تھا۔" [1]

پھر اپنی بہن ایلس کے نام ۲۴ر اکتوبر کو خط لکھا:

"سہ پہر کو غروب آفتاب سے قبل میں ایک آدھ گھنٹہ ٹینس کھیلتا ہوں بسا اوقات میں سرسید اور ان کے لڑکے محمود سے ملنے چلا جاتا ہوں جو ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ انھوں نے مغربی بود و باش اختیار کرلی ہے وہ ہفتہ میں ایک بار بیک کے یہاں آتے ہیں اور تین چار گھنٹے تک خوب باتیں ہوتی ہیں۔" [2]

۳۰ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کو اپنی ماں کو اطلاع دی کہ

"کل رات سرسید نے کاکس اور میرے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا جس میں چھ مقامی افراد مدعو تھے۔ کچھ اراکین کمیٹی بھی شریک طعام ہوئے۔ سب ملا کر تقریباً بیس اشخاص موجود تھے۔ خواتین کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" [3]

پھر اس نے ۹ر مارچ ۱۸۸۶ء کو لکھا

"سرسید نے باجماعت نماز پڑھنا اپنے اوپر واجب کرلی ہے۔ جماعت میں ان کی شرکت سے اچھی خاصی کھلبلی مچ جاتی ہے۔ کمیٹی کے ایک رکن نے ان کی ہر شرکت کے لئے ایک دو روپیہ کی رقم مقرر کر دی ہے تاکہ وہ کہہ

---

[1] دلیٹرز آف سر والٹر ریلے۔ مرتبہ لیڈی ریلے۔ جلد اول میتھیو اینڈ کو لندن ۱۹۲۶ء ص ۶۱

[2] ایضاً ص ۲۰

[3] ایضاً ص ۳۶

سکیں کہ ان کے پاس اتنی رقم ہے کہ ایک طالب علم کو وظیفہ دیا جا سکے۔"[1]

علی گڑھ کے شب و روز کے علاوہ یہاں کی آب و ہوا اور اس کے اثرات کا حال اپنی والدہ کو ۴ ستمبر ۱۸۸۶ء کے خط میں درج کیا کہ

"موسم برسات میں علی گڑھ کا بھی تقریباً وہی حال ہوتا ہے جو بقیہ دنیا کا۔ طلباء کی ایک تہائی تعداد اس زمانے میں بیمار پڑ جاتی ہے۔"[1]

ریلے مدرسۃ العلوم میں طلباء کو انگریزی ادب کا درس دیتا تھا۔ ورڈز ورتھ اس کا محبوب شاعر تھا۔ وہ خود بھی فطرت اور قدرتی مناظر کا دلدادہ تھا اس کا اظہار اس نے اکثر خطوں میں کیا کہ

"قدرت کی جلوہ گری یہاں بھی ایسی ہی ہے جیسی وہاں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مشرق کے درباری شعراء اس کی دید سے اکثر محروم رہتے ہیں۔"[2]

اس نے خطوط میں یہاں کی زندگی اور سوانحی حالات کا ذکر کیا ہے مثلاً

"کل سید محمود یہاں تشریف لائے ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ڈیڑھ ماہ کے لئے انگلستان جا رہا ہوں تو کہا کہ آپ کیوں اپنی قیام کی مدت اور نہیں بڑھا لیتے کیونکہ تعطیل کی وجہ سے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اب میں نو ہفتہ کے لئے آؤں گا اور ۱۴ اپریل سے لے کر ۲۷ جون تک قیام کروں گا۔"[3]

ہندوستان کے دوران وہ سید احمد خاں سے بڑا متاثر ہوا اور جانے کے بعد بھی یہاں کی خوشگوار یاد اس کے ذہن سے محو نہ ہو سکی۔ ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں بیان کیا کہ

"میرے بوڑھے پیشوا اور قائد سر سید احمد خاں ایک عظیم المرتبت انسان

---

[1] دلیٹرز آف سر والٹر ریلے مرتبہ لیڈی ریلے "میتھیو اینڈ کو۔ لندن ۱۹۲۶ء ص ۵۲

[2] ایضاً " " " " " " ص ۹۷

[3] ایضاً " " " " " " ص ۹۸-۱۰۶

اور سیاست داں ہیں وہ یقیناً ایک ایسے شخص ہیں جن کو خدا نے موقع
شناسی کا بڑا ملکہ ودیعت کیا ہے بلاشبہ وہ سادہ دلی اور روشن خیالی
کی قدر و قیمت سے خوب واقف ہیں۔"[1]

اس کی یاد میں اب بھی یہاں کے شعبۂ انگریزی میں "ریلے لٹریری سوسائٹی" موجود
ہے علی گڑھ کے بعد وہ مانچیسٹر یونیورسٹی، اور لورپول اور گلاسگو میں انگریزی ادب
کا پروفیسر رہا وہ انگریزی کا باشعور نقاد تھا اس کی چند قابل ذکر تصانیف حسب
ذیل ہیں۔

دی انگلش ناول ۔ ۱۸۹۴ء میں لورپول سے شائع کی ۔
ملٹن پر تبصرہ و تنقید ۔ ۱۹۰۰ء ۔
ورڈز ورتھ پر کتاب ۱۹۰۳ء گلاسگو سے چھپی ۔
سولھویں صدی کے انگریزی بحری سفر ۱۹۰۶ء ۔
شیکسپیئر پر تنقید ۔ ۱۹۰۷ء ۔
جانسن پر چھ مضامین ۔ ۱۹۱۰ء ۔
پرنسٹن یونیورسٹی میں دیئے گئے دو خطبات بنام "رومانس"، ۱۹۱۵ء ۔
شیکسپیئر کے عہد کا انگلستان ۱۹۱۶ء ۔
انگلستان اور جنگ (کتاب) ۱۹۱۸ء ۔
فضائی جنگ (رایل فضائی فوج کی تاریخ) ۱۹۲۲ء ۔

وہ مارچ ۱۹۲۲ء کو میعادی بخار میں مبتلا ہوا اور ۱۳ مئی سینچر کی صبح اس
کا انتقال آکسفورڈ میں ہو گیا۔ تجہیز و تکفین مارٹن کالج کے کلیسا میں ہوئی اور فیری
ہکسی قبرستان میں مدفون ہے۔

---

1) THE LETTERS OF SIR WALTER RALEIGH, EDITED LADY RELEIGH, MATHEW AND CO., LONDON, L926, P. 256.

سید احمد خاں کے بعد بھی اس ادارہ سے کئی ایسے استاد وابستہ رہے جن کو علوم مشرقی میں دستگاہ حاصل تھی۔ چارلس ایمبروز اسٹوری جو انگلستان کا رہنے والا تھا پانچ سال (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء) تک یہاں کے شعبۂ عربی میں استاد رہا اور ۱۹۱۵ء میں "کتاب التفاخر" (مفضل بن ابی سلمٰی) کو بعد تصحیح ترتیب دیا پھر یہاں سے انڈیا آفس میں بحیثیت لائبریرین گیا تو وہاں فارسی ادب کے مخطوطات کی مکمل اور جامع فہرست تیار کی جس کا پہلا حصہ ۱۹۲۷ء میں شایع کیا۔

سالم کرنکو جرمن عالم علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں سر راس مسعود کی دعوت پر دو سال (۱۹۲۹-۱۹۳۰ء) وزٹنگ پروفیسر رہا۔ یہاں رہ کر اس نے تحقیق نصوص (قدیم عربی متن کی تنقیدی تدوین) پر کام کیا اس فن سے اُسے خاص دلچسپی تھی عبدالعزیز میمن اس کی علمیت کے قایل تھے دونوں نے مل کر یہاں تعلیمی کاموں کو فروغ دیا۔ وہ ۱۹۲۲ء تا دم حیات (۱۹۵۲ء) دائرۃ المعارف حیدرآباد کا رکن رہا۔

پروفیسر اوٹو اسپیس کو ۱۹۳۲ء میں وایس چانسلر راس مسعود نے شعبۂ عربی کا صدر مقرر کیا اس نے چار سال (۱۹۳۶ء) تک تدریس اور تحقیق کے فرایض انجام دیئے۔ اس نے مصری عالم شیخ ابوالعباس احمد القلقشندی کی عربی تصنیف "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء" سے ایسے اقتباسات جمع کیے جو ہندوستان اور محمد بن تغلق کے بارے میں تھے اسی طرح اوٹو اسپیس نے القلقشندی کے اصل ماخذ قاضی شہاب الدین بن فضل اللہ العمری (متوفی ۷۴۹) کی عربی تصنیف "کتاب مسالک الابصار فی ممالک الامصار" سے ہندوستان کے متعلق مواد کو نکال کر اس کا ترجمہ انگریزی اور جرمن زبانوں میں شایع کیا۔

موجودہ دور کے بعض ماہرین کا تعلق براہ راست تو یہاں سے نہیں مگر ان کو اس تحریک کے بانی کے افکار سے دلچسپی رہی اور وہ ان کی تحقیق کا موضوع ہیں:

کرسچین ڈبلیو ٹرال
CHRISTIAN W. TROLL

ٹرال (پیدائش ۱۹۳۰ء) کی ابتدائی تعلیم بون میں ہوئی اور دینی موضوعات کا مطالعہ اس نے یہیں شروع کیا پھر عربی زبان اور اسلامیات

میں ڈپلوما بیروت کی سینٹ جوزف فرنچ یونیورسٹی سے حاصل کیا اور جرمن یسوعی
جماعت (JESUITE) میں شامل ہوگیا اور مزید تحصیل علم کے لئے کچھ عرصہ میونخ
میں قیام کیا۔ وہ لندن میں دس سال (۱۹۶۶ء - ۱۹۷۶ء) تک مقیم رہا جہاں سے پہلے
تو اردو میں بی اے آنرز کیا اس کے علاوہ فارسی اور جنوبی ایشیا کی تاریخ اس کے
دیگر مضامین تھے۔ وہ ایک سال تک ایران، ہندوستان اور پاکستان میں گھومتا رہا
واپس آکر لندن کے "ہی تھراپ کالج" میں فلسفے کے کورسز کئے اور تن دہی سے
تحقیق کا کام شروع کیا اور آخر کو ۱۹۷۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری "اسکول آف اورینٹل
اینڈ افریکن اسٹڈیز" لندن سے ملی۔ وہ اسلامیات میں مہارت حاصل کرنے
کے لئے قاہرہ گیا اور اسی سال کے آخر میں "ودیا جوتی انسٹی ٹیوٹ آف ریلیجن اسٹڈیز
دلی) میں اسلامیات کا استاد مقرر ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ "ودیا پیٹھ" پونا اور
"سینٹ جوزف مشن" الہ آباد سے بھی منسلک رہا۔ وہ روم، میونخ اور واشنگٹن
یونیورسٹیوں میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے رہا۔ مل یورن اور کین برا کی
دانشگاہوں میں لیکچر دیئے۔ وہ ۱۹۸۰ء سے برمنگھم یونیورسٹی کے سینٹر فار دا اسٹڈی
آف اسلام اینڈ کرسچین ریلیشن شعبہ میں بحیثیت پروفیسر مدعو کیا گیا اور تاحال وہیں کام کر رہا ہے۔

ٹرال کے خاص موضوعات مذاہب کا تقابلی مطالعہ بالخصوص مسیحیت اور اسلام کا
تقابل اور اردو کے حوالے سے سید احمد خاں کے مذہبی خیالات ہیں اس کا فکر انگیز
مقالہ برائے پی ایچ ڈی کا موضوع "سید احمد خاں اور اسلامیات کی تعبیر نو" تھا۔ اس
کتاب کے آغاز میں اس نے لکھا کہ میں نے قرآن کے حوالوں کے لئے پکتھال کے ترجمہ کو
پیش نظر رکھا جب کہ سید احمد خاں نے فلوگیل کے ترجمہ سے استفادہ کیا تھا۔

پھر اس نے مقدمہ میں ذکر کیا کہ سید احمد خاں کے مذہبی عقاید کو سمجھنے کے لئے
غدر کے قبل اور بعد کے چالیس برسوں کا مطالعہ ضروری ہے کہ اس صدی کے بدلتے ہوئے
اقدار اور سیاسی حالات نیز غدر کے بعد کی شکست و ریخت نے ان کی فکر میں کیا تبدیلی
پیدا کی؟ انھوں نے تقلید کے بجائے زندگی کے عصر حاضر کے تقاضوں کو اہمیت دی اور

اپنی تحریروں کے ذریعے آزاد خیالی اور نئے سائنسی علوم کی اشاعت و ترویج کی[1] اس کتاب کے دو حصے ہیں:

حصہ اول میں عہد سید احمد خاں اور اس کا پس منظر، اسلام اور انجیل، توریت، اسلام کے ماخذات اور تاریخ نویسی، جدید علوم طبعی اور تفسیر، انبیاء کی وحی کی نوعیت اور ان کے باہمی ربط سے بحث کی گئی ہے۔

حصہ دوم میں سید احمد خاں کی اہم تحریروں کے تراجم دیئے گئے یہ اقتباسات جلاء القلوب، تبیین الکلام اور تفسیر القرآن سے ہیں۔

ٹرال نے اس مقالہ کے علاوہ "سید احمد خاں کے دینی مخالفین" کے تحت علی بخش خاں کے الزامات اور ان کے جوابات ۱۹۷۷ء میں شائع کئے۔

اس نے "سرسید اور احیاء العلوم" کے عنوان سے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جس کا اردو ترجمہ "فکر اسلام کی تشکیل جدید" کے نام سے پروفیسر مشیر الحق اور ضیاء الحسن فاروقی نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ دہلی سے ۱۹۷۸ء میں طبع کیا۔

اس کا ایک اور مضمون "سید احمد خاں اور اسلامی فقہ" دکوا ٹرلی نئی دہلی) سے شائع ہوا اس کے علاوہ "مولانا شبلی کے مذہبی نظریات تعقل اور وحی کا موازنہ" ۱۹۸۲ء میں رسالہ "اسلام اور عصر جدید" جامعہ نگر نئی دہلی میں چھپا اور تصانیف احمدیہ پر ٹرال کی تنقید جنوری ۱۹۸۹ء میں اسلامک کلچر دلی سے شائع ہوئی۔

ٹرال اور گیل مینو کے اشتراک سے "ابوالکلام آزاد کی فکری سوانح عمری" ۱۹۸۸ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس نے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن نیو یارک کے لئے سرسید کے آرٹ پر مضمون لکھا اب بھی اس کا اسلامیات اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ جاری ہے اور ان موضوعات پر اس کی تحریریں ہنوز آرہی ہیں۔

1) CHRISTIAN W. TROLL : SAYYID AHMAD KHAN: A REINTERPRETATION OF MUSLIM THEOLOGY, VIKAS PUBLISHING HOUSE, NEW DELHI, BOMBAY 1978, P. 16 TO 17.

ڈیوڈ لیلی ویلڈ DAVID LELYVELD

ڈیوڈ لیلی ویلڈ کا وطن نیو یارک ہے اس کے والد ربّی آرتھر لیلی ویلڈ ایک یہودی پیشوا اور والدہ ڈاکٹر ٹوبی لیلی ویلڈ انگریزی ادب کی استاد ہیں ڈیوڈ کی ابتدائی تعلیم نیو یارک کے پبلک اسکول میں ہوئی اور ہارورڈ کالج سے ۱۹۶۳ء میں بی اے کا امتحان تاریخ اور انگریزی ادب میں پاس کیا پھر اس نے فل برائٹ پروگرام کے تحت مدراس کرسچین کالج میں ایک سال انگریزی کا درس دیا۔ اس کے بعد امریکہ واپس جا کر شکاگو یونیورسٹی میں جدید تاریخ دین کا مطالعہ کیا جہاں اس کے نگراں پروفیسر برنارڈ کہن تھا، یہیں اس نے چودھری محمد نعیم سے اردو پڑھی اور "مغلوں کی تاریخ" کا مطالعہ جہاں پروفیسر عرفان حبیب کی مدد سے کیا۔ شکاگو یونیورسٹی میں تین سال قیام کیا اور ایم اے کی ڈگری ملنے کے بعد ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ آیا تاکہ 'مدرستہ العلوم کی ابتدائی پچیس سالہ ثقافتی تاریخ' مرتب کر سکے اور ۱۹۶۹ء تک یہاں فیلو شپ پروگرام پر رہا۔

علی گڑھ کے دوران اس نے پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر خلیق احمد نظامی سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد دہلی بمبئی، حیدر آباد، لکھنؤ، لاہور کراچی اور لندن سے بھی تحقیقی مواد جمع کیا اور ۱۹۷۱ء میں امریکہ لوٹ گیا جہاں مینی سوٹا یونیورسٹی میں تاریخ کا معلم (انسٹرکٹر) مقرر ہوا۔ تدریسی مصروفیات کی وجہ سے اس کا تحقیقی مقالہ چار سال کے بعد مکمل ہوا۔

ڈیوڈ لیلی ویلڈ کا یہ مقالہ "علی گڑھ کی پہلی نسل" کے نام سے کتابی صورت میں پرنسٹن یونیورسٹی پریس امریکہ سے ۱۹۷۸ء میں شایع ہوا۔ یہ ان طلبا اور اساتذہ کے حالات پر مشتمل ہے جنھوں نے مدرسہ کی تاسیس ۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۰ء کے دوران تعلیم پائی یا تدریس کے فرائض انجام دیئے گویا یہ اس درسگاہ کے ارتقا اور اس کے ابتدائی پچیس سالوں کی تاریخ ہے جس سے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور مصنف کے تاریخی تجزیہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔

آخر میں ونفرڈ کینٹ ویل اسمتھ کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو سید احمد خاں کے

کارناموں اور ان کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہے۔ اس مستشرق نے اعتراف کیا کہ

"ابتدا میں اور کافی دنوں تک روشن خیالی کی یہ فضا برقرار رہی جو فطری اور فیصلہ کن ثابت ہوئی جب تک مذہبی مخالفت شدید رہی تو کالج کے افراد کا طریق مدافعانہ تھا مگر جب روشن خیالی کا اثر بڑھا اور مذہبیت کی شدّت کم ہوئی اس وقت تک ملک میں مسلم متوسط طبقہ بنپا، نیا نقطہ نظر اور نئی اسپرٹ مقبول ہوئی تو علی گڑھ روشن خیالی اور سیکولرازم نظریہ کا علمبردار بنا۔" [1]

---

1) WILFRED CANTWELL SMITH : MODERN ISLAM IN INDIA, PUBLISHED IN ENGLAND L964, REPRINT USHA PUBLICATION 4/7 DESHBANDHU GUPTA RD., NEW DELHI, 1979, P. 64.

حاصلِ کلام

مغلیہ سلطنت کا زوال نہ صرف ایک حکومت کا زوال تھا بلکہ ایک پوری تہذیب کا خاتمہ تھا۔ یہ ایسی تہذیب تھی جس کے سائے میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی قدروں نے پرورش پائی تھی۔

سیّد احمد خاں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاسی ابتری، معاشی بحران، تعلیمی بےمائیگی اور تہذیبی شکست وریخت کا علاج مغربی تعلیم کے حصول میں دیکھا اور فکر و نظر کے پیمانوں کو جدید حالات اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھال دینے کی ضرورت کا احساس دلایا وہ راجہ رام موہن رائے اور انیسویں صدی کے دیگر مصلحین کی اس روایت سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے عملی جدوجہد اور اپنے قلم کے ذریعے ملک و قوم کے سدھار کی مہم کو سر کیا۔ فرق یہ تھا کہ ان کی تعداد کم نہ تھی اور سید احمد خاں تنِ تنہا تھے۔ انھوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی:

"اس زمانے میں مذہبی آدمی وہ سمجھے جاتے ہیں جن کے دل تعصب سے پتھر سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں سوائے اپنے اہل مشرب کے سب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تمام دنیا کو بلکہ اپنے اہل مذہب میں سے بھی ان کو جو ان کے مشرب کے برخلاف ہیں حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں غیر مذہب کے لوگوں سے دوستی و محبت اوران کے ساتھ ہمدردی کو کفر و الحاد جانتے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ سوائے اپنے اور کسی کو دیکھ نہیں سکتے۔۔۔" [1]

---

[1] ریمارک از طرف ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اہ شوال لغایت ماہ رمضان ۱۲۹۸ھ ۱۸۸۰ء مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ص ۲۷۳

انھوں نے سماج کے ہر پہلو پر غور کیا اور ان کا ذہن ہمہ وقت مذہبی، معاشرتی، اقتصادی تعلیمی اور تہذیبی اصلاح کے منصوبے تیار کرتا رہا۔ چنانچہ انھوں نے قومی فلاح کے پیشِ نظر زراعت کے طور وطریق میں انقلاب لانے کی کوشش کی۔ کاشتکاری سے متعلق یورپین کتابوں کے ترجمے کروائے سائنٹیفک سوسائٹی میں اشاعت کے لیے دو کتابیں منظور ہوئیں جن میں "رسالہ یورپ کے آلاتِ کاشتکاری" جو کئی انگریزی کتابوں سے تالیف کیا جائے اور "رسالہ علم فلاحت یعنی کاشتکاری" مصنف لائبی شامل تھیں [۱] اس موضوع پر نمائشیں بھی کروائیں اور خود ایک رسالہ قدیم نظام دیہی ہندوستان" ۱۸۷۸ء میں شائع کیا جس کے دیباچہ میں لکھا کہ

"اس رسالہ میں ہمارا مقصد اس بات کو دکھانا مقصود ہے کہ وہ نظام دیہی کس طرح پر تھے؟ تاکہ جو لوگ مال گذاری و بند و بست سے علاقہ رکھتے ہیں ان کو اپنے کام کے انجام میں ایک نوع کی زیادہ بصیرت حاصل ہو"۔[۲]

سید احمد خاں نے اس کے علاوہ کاشت کے مغربی ترقی یافتہ طریقوں کے مد نظر ایک یادداشت ترقی آراضی اور امداد کاشتکاران اور تقریب بنک ہائے زراعتی" کے عنوان سے ۹ ستمبر ۱۸۷۹ء بمقام شملہ حکومت ہند کو پیش کی [۳] جس میں مغرب میں دی گئی سہولتوں کو ہندوستان میں مروج کرنے کی سفارش کی گئی تھی وہ ملک میں ایک عام علمی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تعلیمی انجمنیں بنائیں، مدرسے کھولے، رسائل جاری کئے، دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کروائے اور اپنا پریس قائم کیا۔ دراصل وہ ہندوستانیوں کو ایک ایسی قوم بنانا چاہتے تھے جو دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی ہمسری کر سکے۔

---

[۱] نمبر ۵ روداد سینٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ ۶، جون ۱۸۶۴ء مطبوعہ گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۸۶۴ء ص ۹

[۲] مقالات سرسید احمد خاں مرتبہ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب۔ کلب روڈ لاہور ۱۹۶۵ء جلد شانزدہم ص ۵۱۷

[۳] ایک یادداشت ترقی، آراضی امداد کاشتکاران اور تقرر بنک ہائے زراعتی اخبار سینٹیفک سوسائٹی مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ شمارہ ۲، جنوری ۱۸۸۳ء میں چار سال بعد طبع ہوئی ص ص ۶۱۹ - ۶۲۲

انیسویں صدی کے انگریزی انشائیہ نگار (ایسے الیسٹ) ان کے موڈل تھے اور جس شائستگی (اربینٹی)، تمدن اور اعلیٰ ذہنی تہذیب کو سید احمد خاں نے اپنا نصب العین بنایا تھا اسے وہ علی گڑھ کے طالب علموں میں دیکھنا چاہتے تھے جو کالج سے نکل کر تجارت، زراعت، قانون اور دوسرے پیشوں میں مہارت حاصل کر کے معاشرہ کی قیادت کر سکیں اور یہ ہی خیال مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں مضمر تھا ایک خط بنام مولوی عبدالحق دہلوی لکھا کہ

"اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پا جائیں کہ بلا ذریعہ نوکری خود اپنے قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں"۔[1]

انھوں نے قوم میں سائنتی نقطۂ نظر مروج کیا، اردو صحافت کو ایک نیا موڑ دیا اور نثر کو اس قابل کیا کہ سنجیدہ مسایل کو اپنی گرفت میں لا سکے۔ اس نئی علمی نثر کی بنیاد ڈالنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختصر مضمون نگاری کو فروغ دیا اور نثر میں وزن و وقار پیدا کیا وہ ایک ایسی جدید اور عام فہم اردو زبان کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے تھے جو صحیح معنوں میں عصر حاضر کی لسانی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اردو کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کو انھوں نے موضوع سخن نہ بنایا ہو۔ مثلاً تجوید یعنی اردو علامات قرأت پر اظہار خیال کیا۔ وہ اردو قواعد، جامع لغت اور تاریخ ادب کا خاکہ مرتب کرنا چاہتے تھے اس کے علاوہ اردو کتابوں کی توضیحی فہرست (ببلوگرافی) بھی تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان مختلف کاموں کے نمونے انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اخبار سین ٹیفک سوسئٹی) میں شائع ہوئے مگر افسوس کہ وہ اپنے ارادوں کو پورا نہ کر سکے طباعت کے لئے انھوں نے اردو ٹائپ کو اپنایا اور اس لئے ترجیح دی کہ اس میں کتابیں جلد اور صحیح چھپ سکتی ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق + ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سید احمد خاں اور ان کے رفقا میں بالخصوص الطاف حسین حالی نے حقیقت نگاری کو ادب کے لئے سنگ بنیاد قرار دیا اور ان کی تحریک کے اس اصول کو عموماً تسلیم کیا گیا کہ ادب اخلاق کی تعمیر اور قوم کی اصلاح میں معاون ہوتا ہے لیکن ابتدائی بیسویں صدی کے علی گڑھ کے

---

[1] مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۵۹ء ص ۲۲۶

ادیبوں نے ایک نیا زاویۂ نگاہ اختیار کیا جسے سرسید کے نظریات سے انحراف کہا جا سکتا ہے۔ ان نوجوانوں نے تخلیقات میں عقلیت پسندی کے مقابلے میں جذبات کی کارفرمائی پر زور دیا اور یہ خیال عام ہوتا رہا کہ لطف اندوزی کا عنصر خارج از مبحث نہیں بلکہ جدید ادب کا مقصد مسرت اور بصیرت دونوں کا حصول ہے۔

اس رجحان کا اثر مشرق میں سب سے پہلے ترک ادیبوں نے قبول کیا تھا۔ سید احمد خاں نے عثمانیہ ترکی کو اپنے کالج کے طلبا کے لئے آئیڈیل سمجھا کہ ترک جری، آزاد اور باقی اہل مشرق کے مقابلہ میں یورپ کے قرب کی بدولت کولونیل ایشیا میں ایک زیادہ ترقی یافتہ قوم تھی ان کے ایک ساتھی حاجی اسماعیل خاں رئیس دتاولی ٹرکش عربیہ میں رہ چکے تھے اور ترکی زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے علی گڑھ واپس آکر ترکی رسالہ "ثروت فنون" کے نمونہ پر رسالہ معارف "کا اجرا ۱۸۹۸ء میں کیا جس میں ترکی ناولوں کے ترجمے خود کئے اور چھاپے اور اپنے اسسٹنٹ سجاد حیدر یلدرم (جو اس وقت بی اے کے طالب علم تھے) سے افسانوں اور مضامین کے ترجمے کروائے جو ان سے ترکی بھی سیکھتے تھے۔ "یہ عصری ترکی ادب زیادہ تر رومانی تھا اور اسی اثر سے اردو میں رومینٹک خیالات کی ترویج ہوئی۔ یہ طرز تحریر "ادب لطیف" کے نام سے موسوم ہوا جس میں سادگی کے بجائے رنگین بیانی ہوتی تھی۔ یلدرم نے کئی ترکی ناولوں کا آزاد اور تخلیقی ترجمہ کیا لیکن ان کے طبعزاد افسانوں کا اسٹائل حقیقت پسندانہ تھا۔"[۱]

اس رومانی تحریک کے بیشتر اشخاص علی گڑھ کے پروردہ تھے جیسے سجاد انصاری، عبدالرحمن بجنوری، ظفر عمر اور قاضی عبدالغفار جن کے "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی خدوخال دیکھے جا سکتے ہیں۔ علی گڑھ سے متاثر افراد میں ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، امتیاز علی تاج اور شاعروں میں عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی قابل ذکر

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے قرۃ العین حیدر کا مضمون "داستانِ عہدِ گل" مطبوعہ سجاد حیدر یلدرم مرتبہ ثریا حسین، اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ۔ ۱۹۸۵ء

ہیں۔

رومان پروری کا دور جب ختم ہوا اور "ادب برائے زندگی" کا نعرہ بلند ہوا تو ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز "انگارے" (۱۹۳۲ء) کی اشاعت سے ہوا۔ اس مجموعہ کے افسانہ نگاروں میں ایک خاتون ڈاکٹر رشید جہاں بھی تھیں جو بانیٔ ویمنز کالج شیخ عبداللہ کی بڑی بیٹی تھیں اور جنھوں نے ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں پائی تھی۔ انھوں نے ایک ایسے زمانے میں جب عورت کا باہر نکلنا بھی محال تھا اپنے ترقی پسندانہ افسانوں کے ذریعے جدید خیالات پیش کئے یہ اور بات ہے کہ کہانی کار کی حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت علی گڑھ کے ساختہ احمد علی کو ملی "انگارے" کے انقلابی مصنفین کی اپنے زمانے میں بڑی مخالفت ہوئی اس تحریک کے فروغ میں جن ادیبوں نے حصّہ لیا ان میں اکثریت علی گڑھ سے وابستہ تھی اس لئے اسے سرسید تحریک کی ایک ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں اسرارالحق مجازؔ، جاں نثار اخترؔ، علی سردار جعفری، اختر انصاری، معین احسن جذبیؔ اختر الایمان، مجنوں گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری۔ آل احمد سرورؔ، ممتاز حسین، خورشید الاسلام، سعادت حسن منٹو خواجہ احمد عباس۔ حیات اللہ انصاری اور عصمت چغتائی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں علی گڑھ کے لکھنے والوں نے اہم رول ادا کیا۔ ابتدائی دور میں ولایت علی بمبوق کی ظریفانہ کاوشیں، سلطان حیدر جوشؔ اور عظیم بیگ چغتائی کی ہلکی پھلکی کہانیاں، میر محفوظ علی بدایونی کے مزاحیہ مضامین "ہمدرد"۔ "نقیب" اور علی گڑھ میگزین میں فرضی ناموں سے شایع ہوئے مگر قارئین ان کی شگفتہ طرز نگارش پہچان لیتے تھے۔ رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر مزاحیہ نگار تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی متنوع زندگی کو اپنی سحر آفریں تحریروں میں قلمبند کر دیا گویا وہ علی گڑھ کا دوسرا نام ہیں۔

دانشوروں میں بانیٔ ادارہ کے علاوہ حالیؔ، شبلیؔ، عبدالحق، عبدالعزیز میمن عبدالماجد دریابادی، ذاکر حسین، عابد حسین، غلام السیدین اور دیگر صاحب فکر اشخاص شامل ہیں۔ اسی روایت کو موجودہ دور میں قرۃ العین حیدر نے فکشن کے ذریعہ

وسعت دی۔

یہاں کی تربیت یافتہ نسلوں نے پے بہ پے نہ صرف ادب بلکہ سیاست، علم و فن اور کھیل کے میدان میں اپنا مقام پیدا کیا اور اس ہمہ جہت جدوجہد کا سلسلہ اب بھی جاری ہے مگر آج ہمیں بقائے اصلح (SURVIVAL FOR THE FITEST) کے تحت زندگی کے مختلف شعبوں اور جدید تر علوم میں اعلیٰ مہارت کے لئے پیہم اور منظم کوشش کی ضرورت ہے تاکہ توسیع کی مہم کو فروغ حاصل ہوتا رہے۔

ہندوستان کو اس تاریخ ساز اور مردم خیز دانش گاہ سے توقع ہے کہ سید احمد خاں کی روشن خیالی اور مصلحانہ خیالات کو عصری تقاضوں کے پیش نظر نئے سانچوں میں ڈھالا جائے گا۔

۱۔ سرسید احمد خاں کی مطبوعات کے پہلے ایڈیشن کے سرورق (علاوہ اسباب بغاوت ہند)
۲۔ محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج کا کلکتہ یونیورسٹی سے الحاق
۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی پہلی پروگریس رپورٹ

جواد الدولہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ
کی تالیف کی ہوئی ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۲۵۹
ہجری میں جناب سید محمد خان بہادر کے
چھاپہ خانہ کے لیتھوگرافک پریس میں سید
عبد الغفور کے اہتمام سے دلی میں چھپی

الحمد للہ کہ کتاب مستطاب مسمیٰ بہ
آثار الصنادید
نبیرہ نواب دبیر الدولہ
بموجب اقرارنامہ مورخہ بست و یکم ستمبر سنہ ۱۸۴۷
بمطبع سید الاخبار باہتمام سید عبد الغفور بقالب طبع درآمد
سنہ ۱۲۶۳ ہجری
سنہ ۱۸۴۷ عیسوی

THE BIJNOUR REBELLION

BY

SYUD UHMUD KHAN,

SUDDER AMEEN OF BIJNOUR.

AGRA:

PRINTED AT THE MOFUSSILITE PRESS.

1858.

رسالہ

اسباب بغاوت ہند

مصنفہ

ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر مرحوم ومغفور کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل ایل ڈی

جسکو

سر سید مرحوم نے ۱۸۵۷ء کے اسباب بغاوت ہند کے

متعلق لکھا تھا اور صرف ایکمرتبہ ۱۸۵۸ء مین طبع ہوا تھا

بار دوم

حسب فرمایش منیجر صاحب ڈیوٹی بک ڈپو مدرستہ العلوم علی گڈہ

مطبع مفید عام آگرہ مین طبع ہوا

۱۹۰۳ء

امنا بالله وما انزل علينا وما انزل على ابراهيم و اسمعيل و اسحق و يعقوب والاسباط وما اوتي موسى و عيسى
والنبيون من ربهم لانفرق بين احد منهم و نحن له مسلمون — سورة آل عمران آية ۸۴

"We believe on God, and that which hath been sent down unto us, and that which was sent down unto Abraham, and Israel, and Isaac, and Jacob, and the tribes, and that which was delivered to Moses, and Jesus, and the Prophets from their Lord; we make no distinction between any of them, and to Him we are resigned."——HOLY KORAN.

THE
MOHOMEDAN COMMENTARY
ON THE
HOLY BIBLE,
BY
SYUD AHMUD.
PART FIRST.

تبئین الکلام

فی

تفسیر التوراة والانجیل علی ملة الاسلام

الفه

المفتقر الی الله الصمد سید احمد

حصۂ اول

GHAZEEPORE,
PRINTED AND PUBLISHED BY THE AUTHOR AT HIS PRIVATE PRESS.
1862 A. D. 1279 H.

جلد ۱ ۶ اپریل سنہ ۱۸۶۶ع روز جمعہ نمبر ۲

LIBERTY OF THE PRESS IS A PROMINENT DUTY OF THE GOVT. AND A NATURAL RIGHT OF THE SUBJECTS.

ازادي چهاپہ كي هى ايک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ايک اصلي اور جبلي حق رعيت کا

اطلاع

یہہ اخبار سیں ٹیفک سوسئیٹي علیگڈہ سے هفته وار جاري هوتا هى قیمت اسکي حسب تفصیل ذیل هى مگر جو لوگ سیں ٹیفک سوسئیٹي کے ممبر هیں أنکو بلا قیمت ملتا هى •

سالانه قیمت اخبار ۱۲ روپیه

سالانه محصول ۳ روپیه

جو لوگ هماري سوسئیٹي کے ممبر هوتے هیں أنکو چوبیس روپیه سالانه دینا پڑتا هى اور کل کتابیں اور اخبار جو سوسئیٹي چهاپتي هى بلا قیمت أنکو ملتي هیں •

NOTICE

This Paper will be issued weekly by the Scientific Society.

The rates of subscription will be as follows.

Annual subscription.	12	,,	,,
Do. with postage.	15	,,	,,

The paper will be distributed gratis to members of the Society.

Members of the Society pay an annual subscription of Rs. 24 and are entitled to receive, without further payment, all the Society's publications, books, lectures, and newspapers.—

جلد اول] یکم شوال سنہ ۱۲۸۷ ہجری یوم المبارک عیدالفطر نمبر ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اطلاع

جسقدر روپیہ بابت اس پرچہ کے بطور چندہ خواہ بطور قیمت وصول ہو وہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہوگا بلکہ اس پرچہ کے ترقی میں صرف کیا جاویگا ۔

مسلمانوں میں سے جو شخص ساٹھ روپیہ سالانہ پیشگی بطور چندہ دے وہ اس پرچہ کے متعلق معاملات میں ممبر متصور ہوگا ۔ علاوہ اس کے جو شخص کچھ روپیہ بطور ڈونیشن دے وہ بشکریہ قبول کیا جاویگا ۔

یہ پرچہ ہر مہینہ میں ایک بار یا دو بار جیساکہ مقتضاے وقت ہوگا چھپا کریگا قیمت فی پرچہ دو آنہ اور مع محصول ڈھائی آنہ ہوگی مگر خریداروں کو کم سے کم تین روپیہ قیمت اور ایک روپیہ آٹھ آنہ محصول جملہ چار روپیہ آٹھ آنہ پیشگی بھیجنے ہونگے ۔

اگر کوئی شخص کوئی خاص پرچہ خریدنا چاہے گا اُس کو فی پرچہ دو آنہ قیمت اور ایک آنہ محصول دینا ہوگا ۔

ممبروں کو بلا قیمت یہ پرچہ ملیگا اور اُن کو اُس کے تقسیم کا بلا قیمت جسکو وہ چاہیں اختیار ہوگا ۔

اس پرچہ میں ہر قسم کے مضامین متعلق تہذیب اخلاق و حسن معاشرت کے جہاں تک کہ وہ مسلمانوں سے متعلق ہیں اور کچھ... مندرج ہوا کریگا ۔

مضمون نمبر ۱

تمہید

اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلیزڈ یعنی مہذب قومیں انکو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں ۔

سویلیزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اُس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہونچانا اور اُن کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے ۔

تصانیف احمدیه

حصه اول — جلد سوم

مشتمل بر کتب و رسایل مذهبی

تفسیر القرآن

جلد اول

تفسیر سورة الفاتحة — تفسیر سورة البقرة

سنه ۱۳۱۰ نبوی

انسٹیٹیوٹ پریس میں باهتمام شیخ علوم الله چهپی

سنه ۱۲۹۷ هجری — سنه ۱۸۸۰ ع

تحریر فی اصول التفسیر

محررہ

المفتقر الی اللہ الصمد السید احمد

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خان صوفی طبع شد

۱۸۹۲ء

۱۳ا۴

ابطال غلامی

المسمیٰ بہ

تبریۃ الاسلام عن شین الامۃ والغلام

معہ ایک آرٹکل کے کہ

غلامی فطرت انسانی کے برخلاف ہے

صنفہ

المفتقر الی اللہ الصمد سیّد احمد

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علیخان صوفی طبع شد

۱۸۹۳ء

سیرۃ فریدیہ

یعنی

حالات زندگی

نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ

وزیر

ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی

مؤلفہ

ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی

موروثی خطاب شاہی

جواد الدولہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علیخان صوفی طبع شد

سنہ ۱۸۹۶ء

۱۵ الم

رجسٹری شدہ ہے

یَا اَہلَ الکِتَابِ تَعَالَوا اِلیٰ کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَینَنَا وَبَینَکُم اَن لَا نَعبُدَ اِلَّا اللہَ

الخطبات الاحمدیہ

فی

العرب والسیرۃ المحمدیہ

من تصنیف

جناب فضیلت مآب حکیم امت وحامی ملت جواد الدولہ عارف جنگ نواب

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب بہادر

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ یف۔ آر۔ ایس

بانئے مدرسۃ العلوم للمسلمین علیگڈھ

جس کو

منشی محمد فضل الدین صاحب ککے زئی تاجر کتب قومی مالک اخبار اشاعت

بازار کشمیری لاہور نے

مطبع مصطفائی لاہور میں چھپوائے

وازواجہ مطہرۃ

سرسید کا سب سے آخری مضمون

یعنی

جوابِ اُمّہات المومنینؑ

جو مرحوم نے وفات سے (۹) روز پہلے ایک عیسائی کے رسالہ امہات المومنین کے جواب مین حضرت رسالت مآب کی ازواج مطہرات کی حمایت مین لکھا تھا اور اسکے بعد کچھہ لکھنے کا اتفاق نہین ہوا۔ ہم اس مضمون کو بطور یادگار اخیر عمر سرسید کے طبع کرا کر شائع کرتے ہین۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ سرسید نے مرتے دم تک اسلام کی حمایت مین زندگی بسر کی ہے۔

مطبوعہ تجارتی پریس علی گڈہ

AFFILIATION TO THE UNIVERSITY OF CALCUTTA.

Considering the rule of the University a copy of which is given on the margin, and the aid which the Government N. W. P. and Oudh has granted to the M. A. O. College, the Committee thinks it proper to submit the said application with a view that after obtaining the permission of His Honor the Lieutenant Governor you will countersign it, and hopes you will kindly return the same after its being countersigned.

Every application must be countersigned by two Members of Senate, and if thought necessary in the case of distant Institutions, by the Secretary to the Government of the province in which the institution is situated.

I beg to remain,
Sir,
Your Obedient Servant,
(Sd) SYED AHMED,
Secretary, M. A. O. C. Fund Committee.

Aligarh,
The 23rd January 1878.

No. 36 of 1878.

OFFICE MEMORANDUM.

EDUCATIONAL DEPARTMENT OF THE N. W. P. & OUDH.
Dated Allahabad, the 15th of February 1878.

In compliance with the request contained in his letter, No. 16, dated 23rd January 1878, undersigned is directed to return (duly countersigned) to the Secretary, Mahammadan Anglo-Oriental College Fund Committee, Aligarh, the application for the affiliation of the College to the Calcutta University, up to the F. A. Standard, and to invite the attention of the Committee to the rule requiring the countersignature of two members of the Senate before submission of the application to the Registrar.

(Sd.) C. J. O'CONNELL,
For Junior Secretary to the Government
of N. W. P. & Oudh.

To,
The Secretary, Mahammadan Anglo-Oriental
College Fund Committee,
Aligarh.

Copy forwarded to the Director of Public Instruction of the N. W. P. & Oudh.

No. 109 of 1878.

From,
CHARLES H. TAWNEY, Esquire,
Registrar, Calcutta University.

To,
SYED AHMED KHAN, BAHADUR, C. S. I.,
Secretary, M. A.-O. C. F. Committee,
Aligarh.

Senate House, the 2nd March 1878.

Sir,

I have the honour to acknowledge the receipt of your letter No. 15 of 1878 and in reply I beg to inform you that the Syndicate have recommended the affiliation of the M. A. O. College Aligarh to His Excellency the Governor-General in Council for approval.

I have the honour to be,
Sir,
Your most Obdt. Servant,
(Sd.) CHARLES H. TAWNEY,
Registrar.

EDUCATION.

The 15th March 1878.

No. 70.—Under Section 12, Act II of 1857, the Governor-General in Council is pleased to authorize the affiliation to the Calcutta University of the Mahammadan Anglo-Oriental College at Aligarh, with effect from the 1st January 1878, up to the standard for the First Examination in Arts.

(Sd.) J. O'KINEALY,
Offg. Secy. to the Govt. of India

مدرسۃالعلوم واقع علیگڈہ

اشتہار

اسکالرشپ واسطے ایف اے کلاس کے

کمیٹي مدرسۃالعلوم نے اُن طالب علموں کو جنہوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کر کر ایف اے کلاس میں پڑھنا شروع کیا هی حسب تفصیل ذیل اسکالرشپیں مقرر کي هیں *

اسکالرشپ دینے والے کا نام	نام اُس طالب علم کا جسکو اسکالرشپ دي گئي	ماهواري تعداد اسکالرشپ
کمیٹي اسکالرشپ	... محبوب عالم ...	عـــہ مگر اس میں یہہ شرط هی کہ جسقدر گورنمنٹ اسکالرشپ اُن کو ملیگي وہ اس تعداد میں سے کم هوجاویگي *
هِز هائینس مہاراجہ مہندر سنگہہ مہندر بہادر جي سي ایس آئي مہاراجہ مرحوم پٹیالہ	هرنانہہ سنگہہ ...	عـــہ
ایضا	... عترت حسین ...	عـــہ
هِز هائینس مہاراجہ وزیانگرام بہادر کے سي ایس آئي	... عبدالمجید خاں ...	عـــہ

علاوہ ان اسکالرشپوں کے کمیٹي کا ارادہ هی کہ ایف اے کلاس کے طالب علموں کے لیئے پانچ نوي اسکالرشپیں ابتداے مارچ سنہ ۱۸۷۸ ع سے لغایت دسمبر سنہ ۱۸۷۹ ع تک کے لیئے اور جاري کرے ایک آٹہہ روپیہ کي اور دو چہہ چہہ روپیہ کي اور دو پانچ پانچ روپیہ کي *

یہہ اسکالرشپیں اُن طالب علموں کو دي جاسکتي هیں جنہوں نے سال گذشتہ میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا هو اور مدرسۃالعلوم علیگڈہ میں داخل هوکر پڑھنا چاہتے هیں پس جو طالب علم ان اسکالرشپوں کے خواهاں هوں اُن کو لازم هی کہ فی الفور اپني درخواست راقم کے پاس بہیجدیں اور قبل یکم مارچ علیگڈہ میں حاضر هوں یکم مارچ کو پرنسپل صاحب کالج اُن میں سے جن پانچ طالب علموں کو منتخب کرینگے اُن کو اسکالرشپ دي جاوینگي — ممکن هی کہ سالانہ امتحان کے بعد ان اسکالرشپوں میں اضافہ بهي هوجاوے *

شرایط اسکالرشپ یہہ هیں کہ اُس طالب علم کو ایف اے کے امتحان تک پڑھتے رهنے کا اقرار کرنا هوگا اور ایک اقرار نامہ اسٹامپ کے کاغذ پر حسب مضمون مندرجہ ذیل داخل کرنا هوگا *

مضمون اقرار نامہ

میں جس کے دستخط نیچے ثبت هیں طالب علم جماعت ایف اے کلاس کا اسقدر روپیہ ماهواري اسکالرشپ کو جو محمدن اینگلواورینٹل کالج فنڈ کمیٹي نے مجہے عطا فرمایا هی قبول کرتا هوں اور اقرار کرتا هوں کہ میں ایف اے کے امتحان تک اس کالج میں پڑھتا رهونگا اور اُن تمام شرایط کو جو اسکالرشپ کي بابت قواعد سنہ ۱۸۷۸ ع میں مندرج هیں بجا لاؤنگا اور درصورتیکہ میں اُن قواعد سے تجاوز کروں یا میرا نام مدرسہ سے بوجہہ غیر حاضري یا قصوروں مندرجہ قواعد مذکور یا دیگر قواعد متعلق مدرسہ کے خارج هوجاوے تو میں اور فلاں شخص میرا ضامن کل روپیہ اسکالرشپ کا جو میں پاؤں معہ سود کمیٹي کو واپس کرونگا *

بتاریخ فلاں ماہ فلاں سنہ فلاں کو میںنے اس پر دستخط کیا *

دستخط طالب علم مقر

راقم
سید احمد خاں
سکرٹري کمیٹي محمدن اینگلواورینٹل کالج فنڈ کمیٹي
مقام علیگڈہ

کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت

محمد عنایت اللہ خاں صاحب پریسڈنت

مولوي محمد سمیع اللہ خاں بہادر سکرٹري

ممبران

محمد عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکم پور

مولوي محمد اسمعیل صاحب

محمد اسمعیل خاں صاحب رئیس دتاولي

محمد مسعود علي خاں صاحب رئیس دان پور

سید فضل حق صاحب

کمیٹی مدبران تعلیم مذہب شیعہ اثنا عشریہ

تاج العلماء مجتہدالعصر مولوي سیدعلي محمد صاحب پریسیڈنت

مولوي چراغ علي صاحب سکرٹري

ممبران

جناب خلیفہ سید محمد حسن خاں بہادر

راجہ سید باقر علي خاں صاحب

مرزا عابد علي بیگ صاحب

نواب سید ولایت علي خاں صاحب

مولوي سید حسن رضا صاحب

مولوي تفضل حسین صاحب

منشي سبحان حیدر صاحب

میر سید تراب علي صاحب

حاجي نواب نوازش علي خاں صاحب

منشي محمد امجد علي خاں صاحب

مولوي محمد عباس حسین صاحب

کمیٹی منتظم مدرسۃالعلوم

مولوي محمد کریم صاحب ڈپٹي کلکٹر بہادر
پریسیڈنت

مولوي سید فریدالدین احمد خاں بہادر
وئس پریسیڈنت

مولوي محمد سمیع اللہ خاں بہادر
لیف آنریري سکرٹري اور ممبر

سید احمد خاں بہادر سي ایس آئي
سکرٹري اور ممبر

ممبران

محمد عنایت اللہ خانصاحب رئیس بھیکم پور

راجہ سید باقر علیخاں صاحب رئیس پنڈراول

مولوي محمد اسمعیل صاحب

سید محمد فضل حق صاحب

قاضي محمد لطافت حسین صاحب

منشي محمد مسعود شاہ خاں صاحب

مولوي آل علي صاحب

محمد ظفر یاب خاں صاحب

راجہ جیکشنداس بہادر سي ایس آئي

ٹھاکر گرپرشاد سنگھ بہادر رئیس بیسواں

لالہ لوکمن‌داس صاحب

محمد عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکم پور

محمد مسعود علي خاں صاحب رئیس دان پور

سید محمد محمود اسکوئیر

منشي محمد ذکاءاللہ صاحب

مولوي خواجہ محمد یوسف صاحب

محمد نورخاں صاحب

منشي محمد صدیق صاحب

منشي غلام حیدر خانصاحب

پنڈت رادھا کشن صاحب

بابو جگندرناتھ صاحب

بابوجارطا رام صاحب

اگرچہ اس مدرسہ کو قایم ہوئے دو برس اور سات مہینے ہوئے مگر یہہ پہلا جلسہ ہی جو مدرسۃالعلوم میں واسطے ... انعام کامیاب طالب علموں کے منعقد ہوا ہی *

۴۲۰م

رپورٹ

ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علیگڈھ

بابت

سنہ ۱۸۷۷ عیسوی

اس مدرسۃ العلوم میں تعلیم کے دو صیغے ہیں *

اول — انگلش ڈپارٹمنٹ جسمیں تمام علوم انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں اور عربی یا فارسی بطور سکنڈلینگوج کے تعلیم ہوتی ہی *

دوم — اورینٹل ڈپارٹمنٹ جس میں علم ادب عربی یا فارسی زبان میں اور تاریخ و جغرافیہ و حساب و ریاضی وغیرہ علوم و فنون اُردو زبان میں پڑھائے جاتے ہیں اور انگریزی کی بطور سکنڈ لینگ وج کے تعلیم ہوتی ہی *

۲۴ مئی سنہ ۱۸۷۵ ع کو مدرسہ کھولا گیا اور یکم جون سنہ ۱۸۷۵ ع سے اسکول کلاس اور یکم جنوری سنہ ۱۸۷۸ ع سے کالج کلاس قائم ہوئی — اس کالج کا انتظام چار کمیٹیوں کے تحت میں ہی جن سے علاحدہ علاحدہ کام متعلق ہیں *

(۱) کمیٹی مدبران تعلیم السنہ مختلفہ و علوم دنیویہ ہی جو درحقیقت اس مدرسہ کی جان ہی اور جسکی ہدایت و رہنمائی پر مدرسۃ العلوم کی کل ترقی منحصر ہی *

(۲) کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت *

(۳) کمیٹی مدبران تعلیم مذہب شیعہ اثناعشریہ *

ان دو نوں کمیٹیوں کا صرف یہہ کام ہی کہ جن مذہبی کتابوں کا پڑھانا مناسب سمجھیں انکو تجویز کریں اور اسبات کی نگرانی کرتی رہیں کہ تعلیم مذہب اُنہی اصول پر ہوتی ہی جو عموماً شیعہ و سنی مذہب میں مسلم چلے آتے ہیں *

(۴) کمیٹی منتظم مدرسۃ العلوم جس کے ذمہ میں مدرسۃ العلوم اور بورڈنگ ہوس کے اندرونی انتظام کا اختیار ہی — ان چاروں کمیٹیوں کے ممبر و افسر حسب تفصیل مندرجہ ذیل ہیں *

کمیٹی مدبران تعلیم السنہ مختلفہ و علوم دنیویہ

کے ڈبلیو اسکوئر پریسیڈنٹ سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی وایس پریسیڈنٹ

مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سکرٹری

اوفشیل ممبر

ایچ جی آئی سڈنس اسکوئر پرنسپل مولوی محمد اکبر صاحب مدرس عربی سنی

مولوی محمد عباس حسین صاحب مدرس عربی شیعہ

دیگر ممبران

ڈبلیو ایچ اسمتھ اسکوئر ڈی سی ایل	جان الیٹ اسکوئر ایم اے
ایچ جی کین اسکوئر	آکلنڈ کالون اسکوئر
نواب محمد ضیاءالدین احمد خاں بہادر	مولوی عنایت رسول صاحب
منشی محمد ذکاءاللہ صاحب	سید محمود اسکوئر
مولوی عبیداللہ صاحب عبیدی	سید حسین صاحب بی اے
مولوی محمد کریم بخش صاحب	مولوی الطاف حسین صاحب
مولوی محمد اسمعیل صاحب	منشی چراغ علی صاحب
مولوی محمد حسین صاحب	مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب

مولوی سید مہدیعلی صاحب

مولوی محمد احسن صاحب ممبر کمیٹی نے ۱۲ فروری سنہ ۱۸۷۷ ع کو ممبری کمیٹی سے استعفا دیدیا

کتابیات

ابوالحسن ندوی - اظہار الحق - قطر - ۱۹۸۶ء

ابوالکلام آزاد - کانوکیشن ایڈریس سالانہ جلسہ تقسیم اسناد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۰ فروری ۱۹۴۹ء باہتمام سید اعجاز علی بریلوی، مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ

اسماعیل پانی پتی - مکتوبات سرسید - مجلس ترقی ادب کلب روڈ - لاہور ۱۹۵۹ء
" مقالات سرسید حصہ ہفتم " " " " ۱۹۶۳ء
" مضامین تہذیب الاخلاق حصہ اول و مابعد ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۵ء

اصغر عباس - سرسید کی صحافت - انجمن ترقی اردو ہند - دہلی - ۱۹۷۵ء
سرسید کی تعزیتی تحریریں - ایجوکیشنل بک ہاؤس - ایم یو مارکیٹ علی گڑھ ۱۹۸۹ء

افتخار عالم - مدرسہ کی ہسٹری - مطبع مفید عام - آگرہ - ۱۹۰۱ء
الطاف حسین حالی - حیات جاوید - مطبع نامی پریس - کانپور ۱۹۰۱ء
" مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۲۳ء مطبع انجمن ترقی اردو ہند - دہلی ۱۹۳۹ء
مطبع ترقی اردو بیورو - نئی دہلی ۱۹۸۲ء
سید امیر علی - اسپرٹ آف اسلام لندن ۱۸۹۱ء سیکنڈ ایڈیشن کلکتہ - تاریخ سارا سین لندن ۱۹۲۶ء
" مسدس حالی مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۷۸ء

اقبال - کلیات اقبال - ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۶ء

امداد العلی اکبر آبادی - امداد الاحتساب علی مداہین فی احکام طعام - مطبع بہاری لال کانپور ۱۸۷۸ء
" منظاہر الحق - مطبع نور - کانپور - ۱۸۶۸ء

امام الدین گجراتی - مکمل مجموعہ لکچرز اور اسپیچز - مطبع نول کشور پرنٹنگ ورکس لاہور ۱۹۰۰ء
امام الدین گجراتی اور مولوی احمد بابا مخدومی لاہوری - آخری مضامین - منزل نقشبندیہ
بازار کشمیری منصور پریس لاہور ۱۹۲۳ء .

امداد صابری - روح صحافت - مکتبہ شاہ راہ دہلی ۱۹۶۷ء

انوار احمد مارہروی۔ خطبات عالیہ حصّہ اول مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۶ء
" مرقع کانفرنس۔ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۵ء

امین زبیری۔ تذکرہ سرسید۔ یونائیٹڈ پبلشرز۔ لاہور۔ ۱۹۶۱ء
" حیات محسن مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۴ء

بپن چند جین۔ جدید ہندوستان۔ وزارت تعلیم حکومت ہند نئی دہلی ۱۹۷۵ء

بشیر احمد ڈار۔ سید احمد خاں کا مذہبی رجحان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر کلب روڈ لاہور ۱۹۵۷ء

تھیوڈور مارسین۔ اسپیچز۔ مفید عام آگرہ باہتمام قادر علی خاں صوفی ۱۸۶۳ء
" تاریخ ایم۔ اے۔ او کالج۔ پائنیر پریس الہ آباد ۱۹۰۳ء

ٹی ڈبلیو آرنلڈ۔ دعوت اسلام مترجمہ شیخ عنایت اللہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور ۱۹۷۲ء

ثریا حسین۔ گارسین دتاسی، اردو خدمات علمی کارنامے۔ اتر پردیش اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء
" سجاد حیدر یلدرم " " ۱۹۸۵ء

جی۔ ایس مینویل۔ رہنمائے دہلی۔ مطبع فینکس کشمیری گیٹ۔ دہلی ۱۸۷۴ء

محمد حمید اللہ۔ مقالات گارسین دتاسی جلد اول و دوم بنظر ثانی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۴۔ ۱۹۷۵ء

خلیق احمد نظامی۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۲ء
" سرسید البم۔ ادارہ ادبیات دلی۔ ۱۹۸۳ء

ذکاء اللہ۔ تاریخ ہندوستان ۸ جلدیں مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۸۷۵ء و مابعد

رفیق ذکریا۔ ہندوستانی سیاست مسلمانوں کا عروج۔ ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی ۱۹۸۵ء

سید احمد خاں جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ لیتھو گرافک پریس دہلی ۱۸۴۲ء۔
" جام جم ۔ لیتھو گرافک پریس اکبر آباد ۱۸۴۰ء
" آثار الصنادید مطبع سید الاخبار دہلی ۱۸۴۷ء
" " مطبع سلطانی قلعہ معلی دہلی ۱۸۵۴ء
" " مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء

سید احمد خاں ۔ آثار الصنادید ۔ مرتبہ رحمت اللہ رعد ۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۴ء

" سلسلۃ الملوک ۔ اشرف المطابع ۔ دہلی ۱۸۵۲ء

" تصحیح آئینِ اکبری ۔ مطبع اسماعیلی دہلی ۱۸۵۵ء

" تصحیح تاریخ فیروز شاہی ۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی پریس کلکتہ ۱۸۶۲ء

" تصحیح توزک جہانگیری ۔ پرائیویٹ پریس ۔ غازی پور ۱۸۶۳ء

" رسالہ اسباب بغاوت ہند ۔ مفصلائٹ پریس آگرہ ۱۸۵۹ء یا بعد ایڈیشن

" سرکشی ضلع بجنور ۔ مفصلائٹ پریس آگرہ ۱۸۵۸ء و مابعد ایڈیشن

" مسودہ خط سیکریٹری مجلس خزینۃ البضاعۃ بنام سکریٹری حکومت مغرب و شمال نینی تال

" ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کی ۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۹ء

" النظر لبعض مسایل الامام الہمام ابوحامد غزالی ۔ مطبع فیض عام ۔ علی گڑھ ۱۸۸۹ء

" ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم ۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۸۹ء

" خلق الانسان علی مافی القرآن ۔ مطبع مفید عام آگرہ ۔ ۱۸۸۹ء

" الدعا والاستجابہ ۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۲ء

" ازواج مطہرات انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۸۹۸ء

" سفرنامہ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء

" سرسید کا سفرنامہ پنجاب مولفہ سید اقبال علی ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۴ء

" سید جمال الدین حسینی (افغانی) حقیقت مذہب ۔ نیچری و بیان حال نیچریاں

حیدر آباد دکن ۱۸۸۰ء

سید عبداللہ ۔ میرامن سے عبدالحق تک چمن بک ڈپو ۔ اردو بازار ۔ دہلی

" سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء تیسرا ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

سلطان جہاں بیگم نواب بھوپال ۔ ایڈریس مطبع مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۱۱ء

سید طفیل احمد منگلوری ۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل طبع اول دہلی ۱۹۳۷ء

شبلی نعمانی ۔ المامون ۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۹ء

شبلی نعمانی۔ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ محمڈن پریس علی گڑھ ۱۹۰۵ء
〃 مقالات شبلی (تعلیمی جلد سوم) مطبع معارف ندوۃ المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۱۳ء
〃 〃 دیگر جلدیں 〃 〃 〃 ۱۹۵۰ء
شیخ عبداللہ۔ مشاہدات و تاثرات۔ فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ ۱۹۶۹ء
عنایت رسول چریاکوٹی۔ لیشرلی۔ مرتبہ محمد امین چریاکوٹی۔ شیروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ ۱۹۶۶ء
عبدالحلیم شرر۔ سرسید کی دینی برکتیں۔ مطبع کریمی لاہور ۱۹۲۱ء
عبدالمجید سالک۔ مترجم میراث اسلام (اردو) مرتبہ الفرید گیوم مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء
محمد عتیق صدیقی۔ اٹھارہ سو ستاون کے اخبار اور دستاویزیں۔ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۱۹۶۶ء
شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ لاہور ۱۹۶۳ء
راجہ شیو پرشاد۔ جام جہاں نما۔ الہ آباد ۱۹۸۱ء
غلام مرسلین۔ مولانا عبدالحیئ فرنگی محلی۔ مرکز دراسات الشیائے غربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۵ء
غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ جلد اول۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور ۱۹۶۸ء
〃 خطوط غالب 〃 〃 ۱۹۶۲ء
عبداللہ یوسف علی۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ الہ آباد ۱۹۳۶ء
لالہ لاجپت رائے۔ آریہ سماج کی تاریخ۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۷ء
فاروق انصاری سوانح عمری سید احمد خاں۔ ترجمہ مصری عالم کی تحریر سے۔ مطبع احمدی علی گڑھ ۱۹۰۲ء
مجیب رضوی۔ تاریخ دیوبند۔ نئی دہلی ۱۹۷۲ء
مرزا غلام احمد قادیانی۔ برکات الدعا۔ مطبع ریاض ہند۔ قادیان ۱۸۹۲ء
منشی محمد سراج الدین۔ سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ معہ مختصر سوانح عمری کتب قومی کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء

مولانا محمد سعید۔ تردید مسودہ قانون وقف خاندانی۔ مطبع محمدی پٹنہ۔ ۱۸۷۵ء

میر ولایت حسین۔ آپ بیتی۔ علی گڑھ ۱۹۷۰ء

نادر علی خاں۔ اردو صحافت کی تاریخ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۷ء

ناصرالدین ابوالمنصور۔ رسالہ تنقیح البیان۔ نصرت المطابع دہلی ۱۸۷۹ء

〃 تریاق 〃 ۱۸۸۰ء

وحیدالدین سلیم۔ سرسید کے خطوط۔ حالی پریس پانی پت۔

〃 سرسید کا سب سے آخری مضمون۔ تجارتی پریس علی گڑھ ۱۸۹۸ء

رسائل

۱۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ سید احمد خاں پرائیویٹ پریس علی گڑھ۔ ۳ مارچ ۱۹۶۶ء۔
۵ جنوری ۱۹۲۱ء سے نام کی تبدیلی کے ساتھ "مسلم یونیورسٹی گزٹ" تاحال

۲۔ تہذیب الاخلاق انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء تا ۱۹۰۷ء۔
〃 احیاء وائس چانسلر سید حامد کے دور میں ۲ فروری ۱۹۸۲ء۔
لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ۔

۳۔ انڈوایرانیکا

۴۔ اخبار رفیق ہند، جلد نمبر ۱۔ لاہور، ۵ جنوری ۱۸۸۴ء

۵۔ رسالہ خاتون۔ مدیر شیخ عبداللہ علی گڑھ ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۴ء

۶۔ علی گڑھ منتھلی جلد ۱۔ نمبر ۱۱۔ یکم نومبر ۱۹۰۲ء و بیجاپور

۷۔ سین ٹیفک سوسائٹی "ایک یادداشت ترقی آراضی امداد کاشتکاران اور تقرر بنک ہائے زراعتی" مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔ شمارہ ۲ جنوری ۱۸۸۳ء

روداد التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند برائیویٹ پریس غازیپور

حب وطنی و ضرورت ترقی علم در بیان اہل ہند۔ پرائیویٹ پریس غازی پور ۱۸۶۳ء

روئیداد نمبر ۱ سینٹیفک سوسائٹی ۹ جنوری ۱۸۶۴ء پرائیویٹ پریس غازی پور ۱۸۶۴ء

روئیداد نمبر ۲ " " " " " " " "

" نمبر ۳ " " " " " " "

" نمبر ۴ " " " " " " "

" نمبر ۵ علی گڑھ ۶ جون ۱۸۶۴ء مطبوعہ گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۸۶۴ء

روداد اجلاس ترقی علم در بیان اہل ہند۔ پرائیویٹ پریس، غازی پور ۱۸۶۳ء

رپورٹ ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بابت آخر ہفت ماہ ۱۸۷۵ء مطبوعہ

" " " میڈیکل ہال پریس بنارس ۱۸۷۶ء / ۱۸۷۷ء

روداد مجلس بغرض قائم کرنے لوکل اسٹینڈنگ کمیٹی محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۷ء

خلاصہ کارروائی یازدہ سالہ محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس مرتبہ سید مہدی علی مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء

کرسچین۔ ڈبلیو۔ ٹرال۔ سید احمد خاں اور ان کے مذہبی معترضین۔
اسلامک کلچر حیدر آباد اکتوبر ۱۹۷۷ء اور دوسری قسط جنوری ۱۹۷۸ء

BIBLIOGRAPHY

Andrews, C.F. and Mukerji, G.: The rise and growth of the Congress in India, Allen and Unwin, London, 1938.

Azad, A. Kalam : English Translation of the Convocation address at Aligarh University, 1949.

Aziz Ahmad : Islamic modernism in India and Pakistan Oxford, London, 1967.

Studies in Islamic Culture in the Indian environment, Clarendon Press, Oxford. 1964

The conflicting heritage of S. Ahmad Khan and Jamaluddin Afghani in the Muslim political thought, 1960.

Baljon, J.M.S.: Reforms and religious ideas of Sir Syed Ahmad Khan 2nd ed. Orientalia, Lahore, 1958.

Bashir Ahmad Dar: Religious thoughts of Syed Ahmad Khan, Institute of Islamic Culture, Lahore, 1957.

Bhatnagar, S.K.: History of the M.A.O. College, Aligarh, Asia Publishing House, Bombay, 1969.

Chaudhri, Nizade: Aligarh Muslim University, Aligarh Law Soc., Reviewed, 1970.

Graham, G.F.I.: Life and Work of Syed Ahmad Khan, C.S.I., William Blackwood, Edinburgh and London, 1885.

Hafeez Malik: Religious liberalism of Syed Ahmad Khan, 1964.

Lalyveld, David: Aligarh's first generation, Princeton Univ. Press, New Jersey, 1976.

Mahmood Syed: A History of English Education in India, Baptist Press, Calcutta, 1895.

Morison, Theodore: Founder's Day Address by Theodore Morison, Principal, M.A.O. College, Magazine, April 1901.

Mushirul Hasan: Problem of Identity at Aligarh, Secular Democ. Sept. 1969.

Mujeeb, M.: The Indian Muslims, Allen and Unwin, London, 1965.

Nath, R. : Monuments of Delhi, Indian Institute of Islamic Studies, New Delhi, 1979.

Nehru, J.L.: Autobiography, Allied Publisher, New Delhi, 1962.

Nizami, K.A.: Sayyid Ahmad Khan, Ministry of Inf. and Broad-casting, N. Delhi, 1966.

Prem Narain : Sir Syed Ahmad Khan and Muslim Political Thinking, Modern Review, July, 1970.

Perceval Qurratulain Hyder: Muslims and their heritage, Illustrated Weekly, Bombay, 14th Dec., 1969.

Ram Gopal : How India struggled for freedom, Book Centre, Bombay, 1967.

Sadiq. Mohd.: A History of Urdu Literature, 2nd ed. Oxford Press, Delhi, 1984.

Shan Muhammad: Sir Syed Ahmad Khan, A political biography, Meenakshi Press, Meerut, 1969.

Successor of Sir Syed Ahmad Khan - Their role in the growth of Muslim political consciousness, Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi, Delhi 6, 1981.

Smith, W. Canwell: Modern Islam in India, published in England, 1964.

Reprint Usha Publication, 4/7, Deshbandhu, G. Road, New Delhi, 1979.

Syed Ahmad Khan: Strictness upon the present educational system in India, London, 1969.

12 Essays on the life of Mohammad consist of 12 topics, published by Trubner and Co., 8 and 60 Paternoster Road, London, 1869-1870.

Review on Dr. Hunter's Indian Musalmans, are they bound in conscience to rebel against the Queen, Benaras, 1972.

Reply to our Indian Musalmans, Henry King and Co., 65 Corn Hill, London, 1872.

Translation of the report of the Select Committee for the better diffusion and advancement of learning among Muhammadans of India, Benares, 1872.

Speech by Syed Ahmad Khan on the institution of the British Indian Association. N.W. Provincy Aligarh, 1867.

Article on the public education of India and correspondance with the British Government concerning the education of the natives of India through the Vernaculas Aligarh, 1869.

British Indian Association, N.W.P., Relative to the department for encouraging travel to Europe together with the correspondence of the Association with the government North Western Provinces on the same subject, Aligarh, 1869.

Syed Ahmad Khan: Scientific Society: By-laws for the Scientific Societv Ghazeepore, 1864.

Proceedings of the Scientific Society, Ghazeepore, 1864.

An account of the Loyal Mahomedans of India, Part I and IInd 1960 printed by J.A. Gubbons, Mofussilite Press, Meerut, Part III, 1961.

Tara Chand : History of the freedom movement in India, Ministry of Information and Broadcasting, New Delhi, 1967.

Troll, Christian, W.: Savved Ahmad Khan, a reinterpretation of Muslim theology, Vikas publishing House, New Delhi, 1976. Bombay, 1976.

Yusuf Husain Khan: Selected documents from the Aligarh Archives Asia, Bombav, 1967.

The letters of Walter Raleigh, edited by Ladv W. Raleigh. Mathew and Co., London, 1926.

Journal Societe Asiatioue, Paris, November-December, 1856.

Journal Asiatic Societv, Royal Asiatic Society Press, London, 1876.

کچّی بارک

کچی بارک، پکی بارک
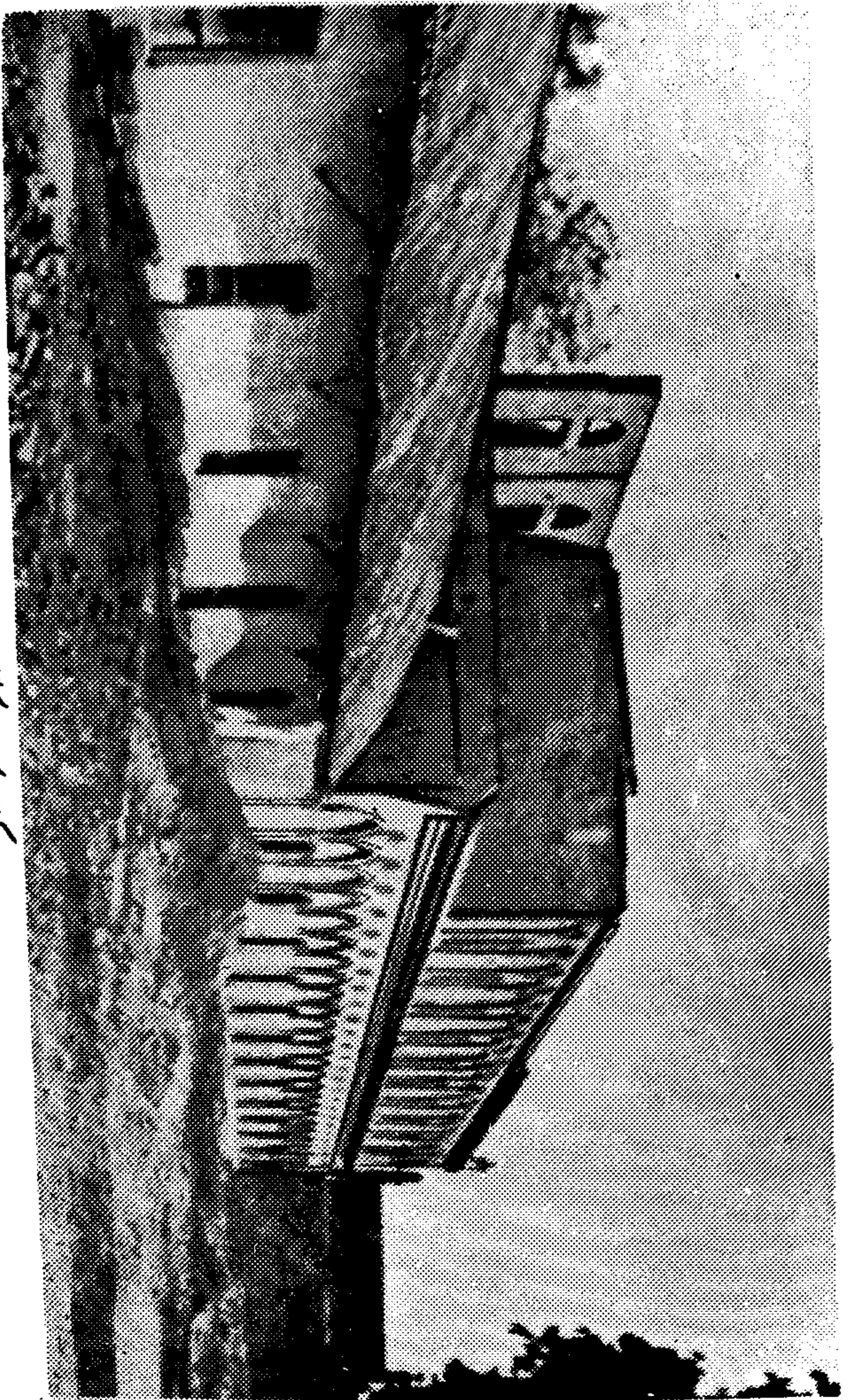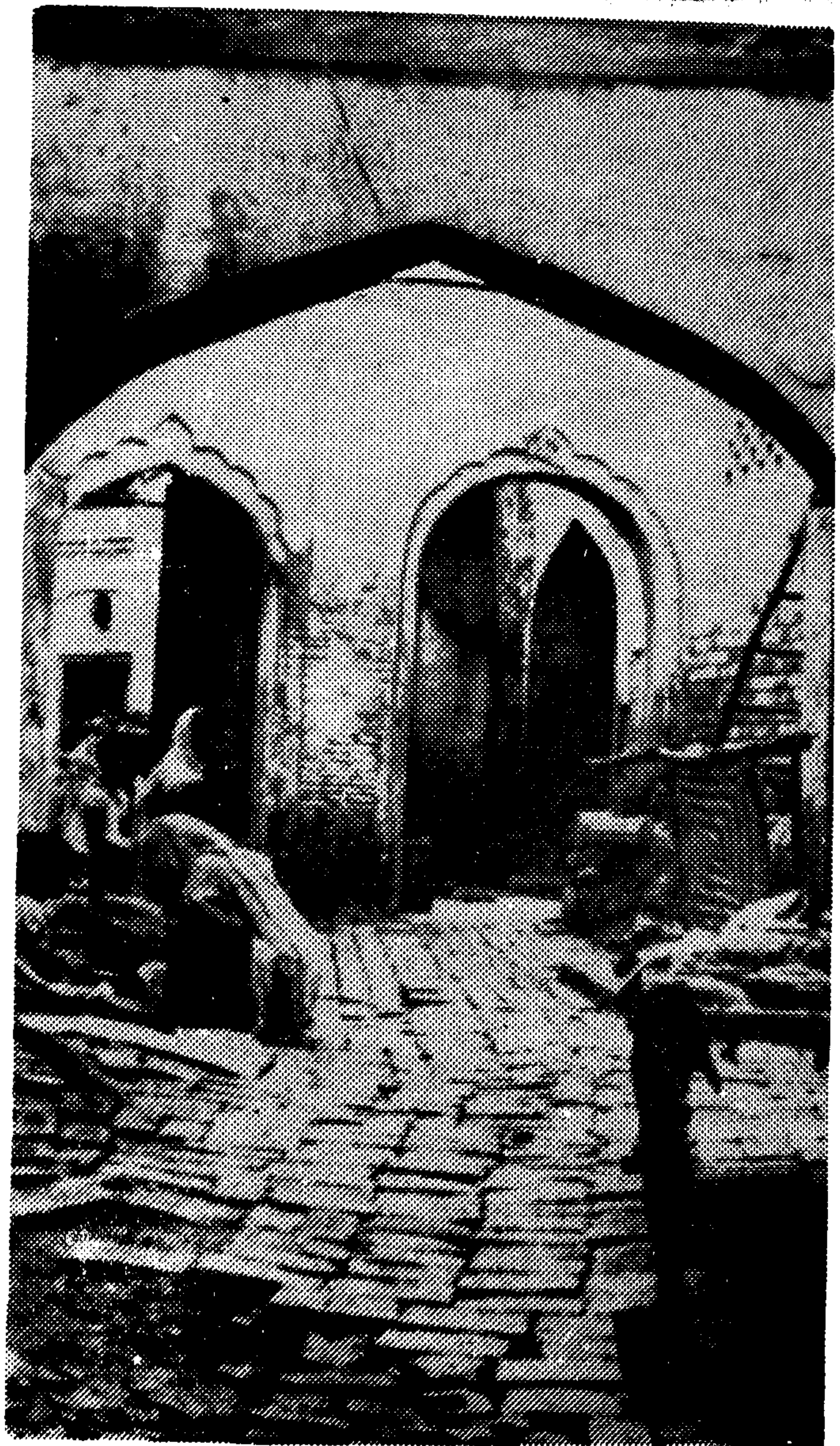
سرسید احمد خاں کا آبائی گھر (دہلی)

سرسیّد احمد (۱۸۹۵ء)

سرسیّد کا صوفہ سیٹ اور رحل

سرسیّد کی چھڑی اور قطب نما

سرسیدؒ کی میز اور کرسی

سرسیّد کا تحریر کردہ خط

مونوگرام

علم الانسان ما لم یعلم
THE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مونوگرام
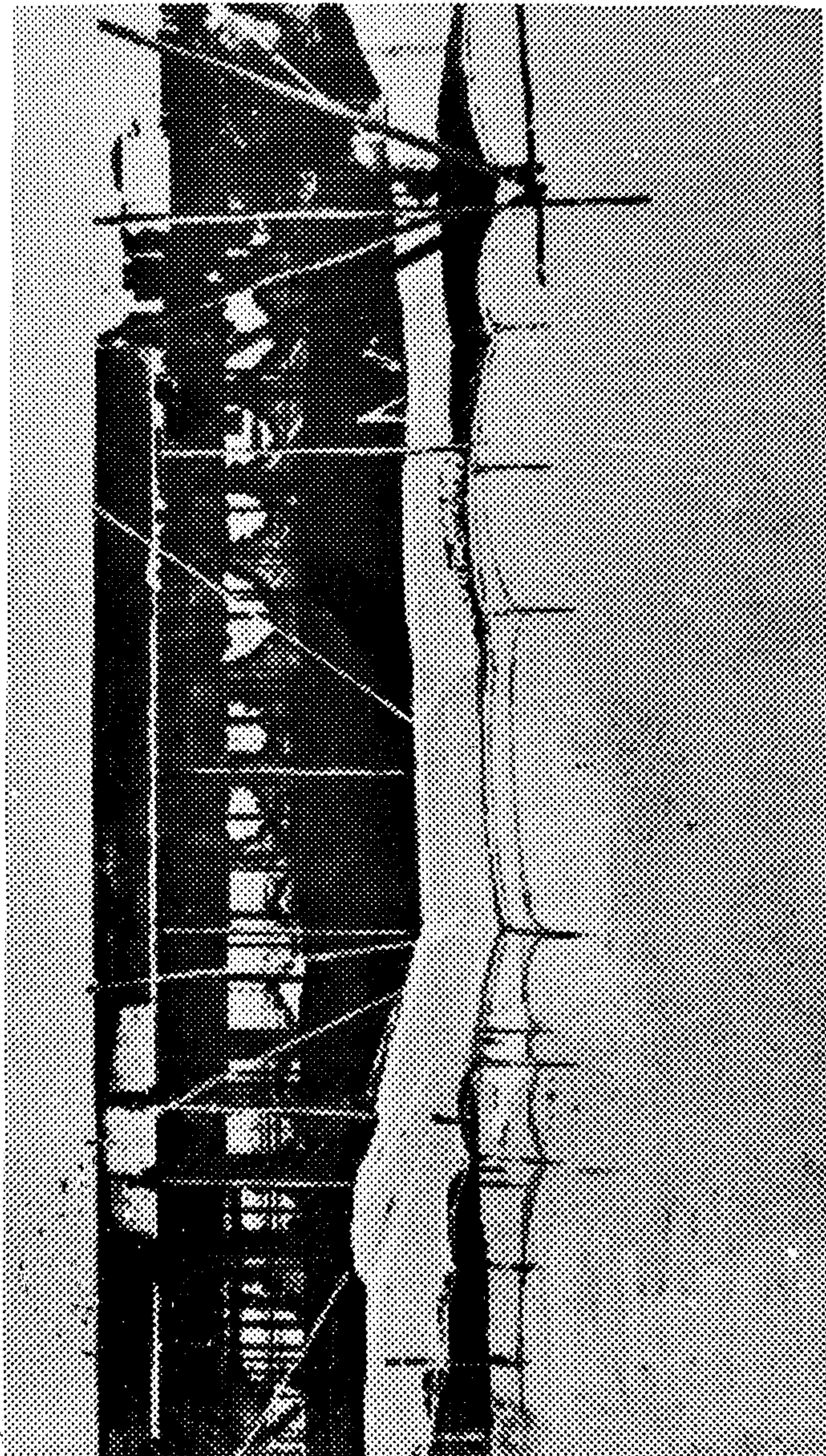
شامیانہ برائے تقریبِ سنگِ بنیاد

لارڈ لٹن مرحوم اینگلو اورینٹل کالج کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے
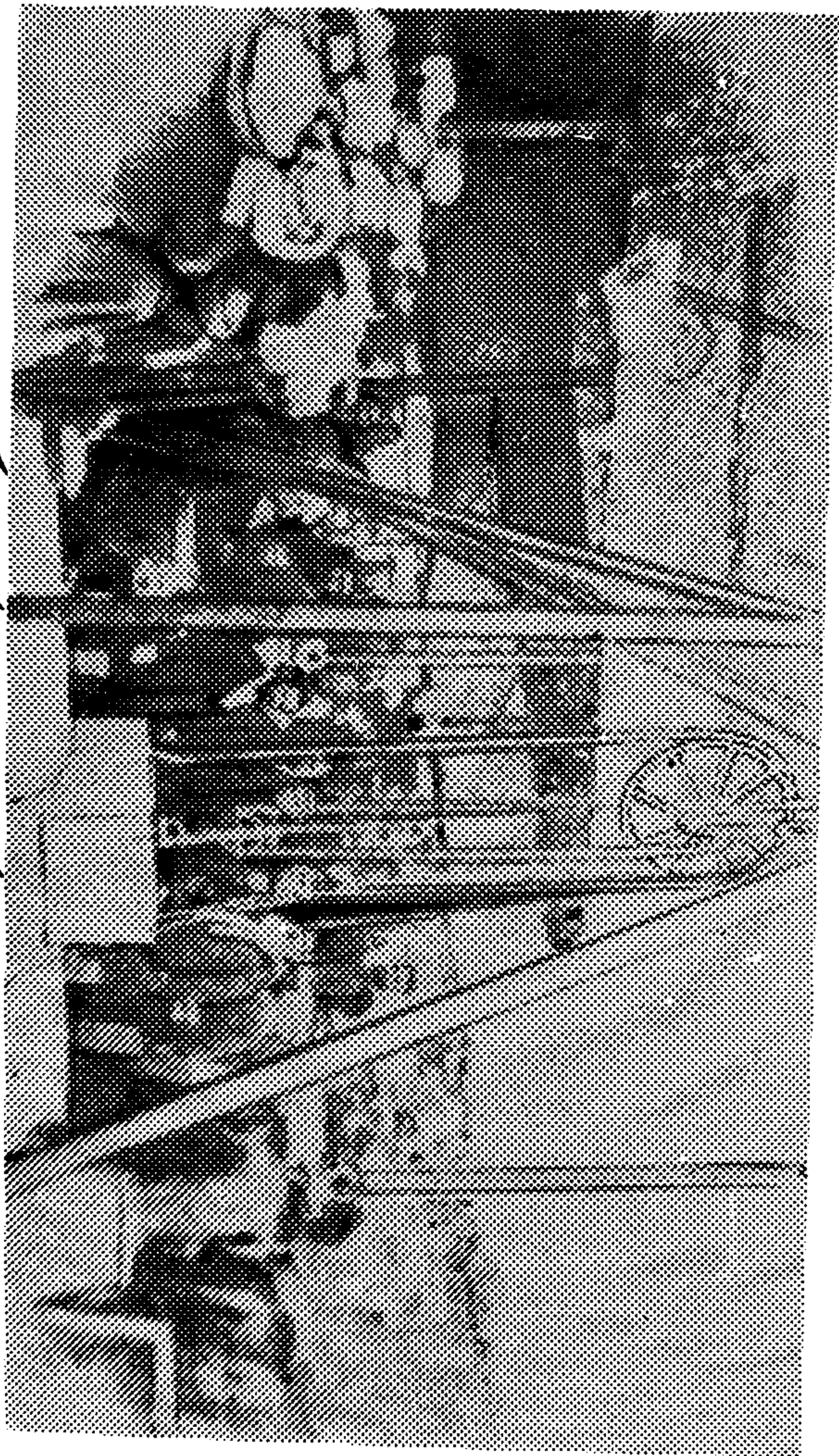
سرسیّد کی نمازِ جنازہ

سرسیدؒ کا مقبرہ
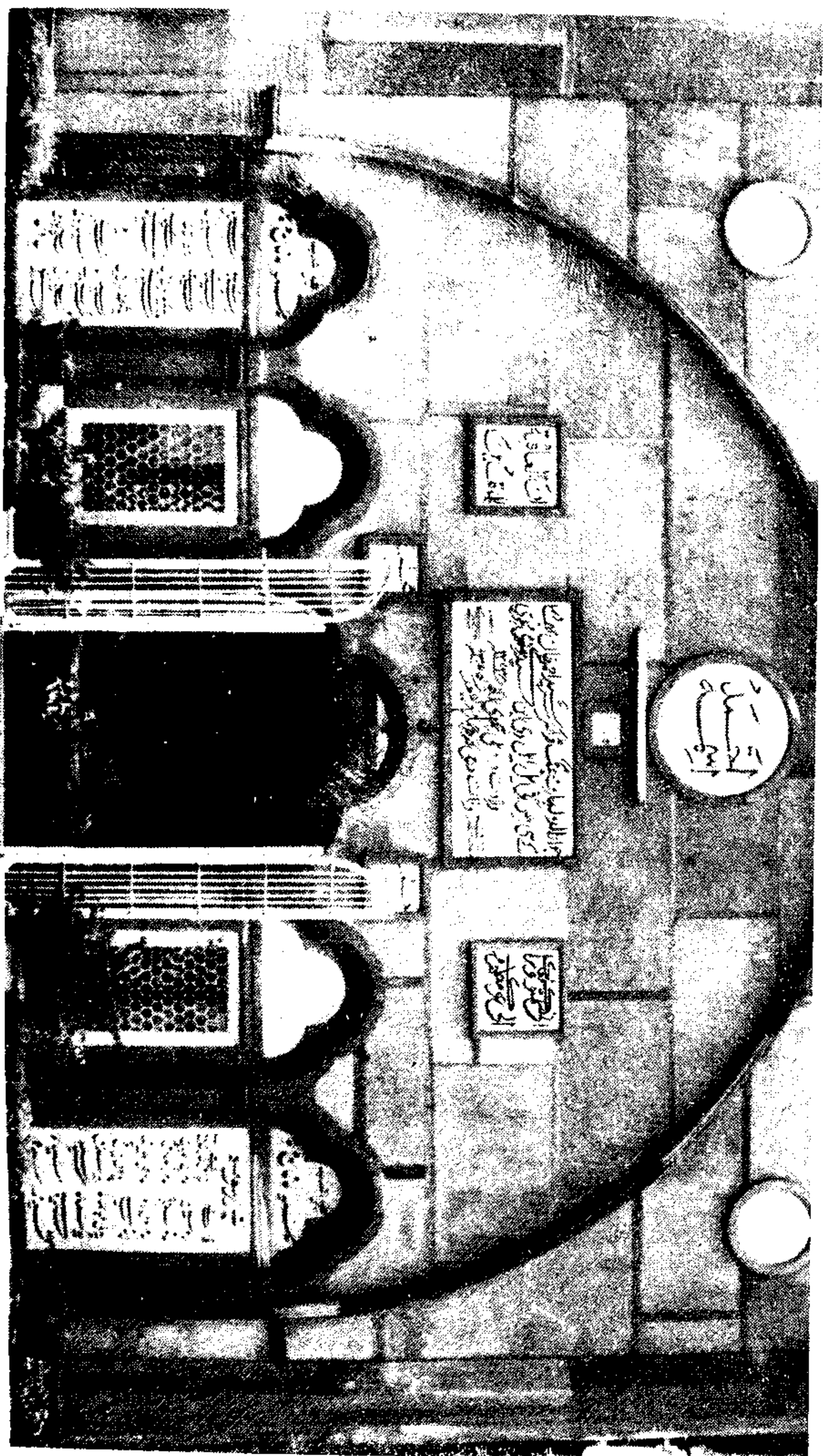
مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

اقبالیات

کتاب	مصنف	قیمت
کلیاتِ اقبال اردو	صدی ایڈیشن	۸۵/۰۰
فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۲۰۰/۰۰
دانشورِ اقبال	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
اقبال بحیثیت شاعر	رفیع الدین ہاشمی	۷۵/۰۰
اقبال شاعر و مفکر	نورالحسن نقوی	۸۰/۰۰
اقبال فن اور فلسفہ	نورالحسن نقوی	۳۰/۰۰
شکوہ جوابِ شکوہ مع شرح	علامہ اقبال	۶/۰۰
بانگِ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۳۰/۰۰
بالِ جبریل (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/۰۰
ضربِ کلیم (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/۰۰

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
دیوانِ غالب	مقدمہ نورالحسن نقوی	۵۰/۰۰
غالب شاعر اور مکتوب نگار	نورالحسن نقوی	۴۸/۰۰
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۴۰/۰۰

سرسید

کتاب	مصنف	قیمت
سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین	۲۰۰/۰۰
سرسید اور ان کے کارنامے	نورالحسن نقوی	۱۵/۰۰
مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	۶۰/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	۶۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۲۰/۰۰
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تصویروں کی زبانی	افتخار عالم	۳۰۰/۰۰

فیض

کتاب		مصنف	قیمت
کلامِ فیض	عکسی	فیض احمد فیض	۶۰/۰۰
نقشِ فریادی	عکسی	فیض احمد فیض	۱۵/۰۰
دستِ صبا	عکسی	فیض احمد فیض	۱۵/۰۰
دستِ تہِ سنگ	عکسی	فیض احمد فیض	۱۵/۰۰

لسانیات

کتاب	مصنف	قیمت
مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۶۰/۰۰
اردو زبان کی تاریخ	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۱۰۰/۰۰
اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۷۵/۰۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵۰/۰۰
ہندوستانی لسانیات	محی الدین قادری زور	۵۰/۰۰

ادب و تنقید

کتاب	مصنف	قیمت
ترجمہ کا فن اور روایت	قمر رئیس	۲۰۰/۰۰
ساحر لدھیانوی حیات و کارنامے	انور ظہیر	۲۰۰/۰۰
خواب باقی ہیں (خود نوشت)	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
فکرِ روشن	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
کچھ خطبے کچھ مقالے	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
رشید احمد صدیقی کے خطوط	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
اردو تحریک	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
افکار کے دیئے	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	۱۵۰/۰۰
شیر دریا	رضا علی عابدی	۱۵۰/۰۰
شاعری کی تنقید	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	۱۵۰/۰۰
محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک	نورالحسن نقوی	۳۰۰/۰۰
مجنوں گورکھپوری: حیات و ادبی خدمات	شاہین فردوس	۲۵۰/-
نذیر احمد کے ناول	ڈاکٹر اشفاق محمد خاں	۸۰/۰۰
تصویریں اُجالوں کی (خاکے)	نورالحسن نقوی	۱۲۰/۰۰
اردو میں ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۰۰/۰۰
فن تنقید اور تنقید نگاری	نورالحسن نقوی	۴۵/۰۰
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	۶۵/۰۰
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	۸۰/۰۰
انشائیہ اور انشائیے	سید محمد حسنین	۵۰/۰۰
غزل کی سرگزشت	اختر انصاری	۲۰/۰۰
غزل و درسِ غزل	اختر انصاری	۳۰/۰۰
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	۴۰/۰۰
اردو داستان: تحقیق و تنقید	قمر الہدیٰ فریدی	۵۰/-
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۳۰/۰۰
تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی	۵۰/۰۰
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	۶۰/۰۰
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	۱۵۰/۰۰
اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	۶۰/۰۰
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	۲۰/-
اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	۴۵/۰۰

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
اردو مرثیہ نگاری	مرتبہ امّ ہانی اشرف	۳۵/۰۰
ناول کا فن	مترجم ابوالکلام قاسمی	۳۰/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۲۰/۰۰
اردو ادب میں طنز و مزاح	وزیر آغا	۶۰/۰۰
ناول کیا ہے	محمد احسن فاروقی	۵۰/۰۰
جدید شاعری	عبادت بریلوی	۱۵۰/۰۰
غزل مطالعہ غزل	عبادت بریلوی	۱۵۰/۰۰
اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	۷۵/۰۰
فن افسانہ نگاری	وقار عظیم	۴۰/۰۰
نیا افسانہ	وقار عظیم	۴۰/۰۰
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۶۰/۰۰
اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	۳۵/۰۰
اردو کیسے پڑھائیں	سلیم عبداللہ	۳۰/۰۰
آئیے اردو سیکھیں	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۱۵/۰۰
قاری اساس تنقید	پروفیسر گوپی چند نارنگ	۱۵/۰۰
فکر و آگہی	انجمن آراء	۶۰/۰۰
اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ	امّ ہانی اشرف	۱۵۰/۰۰
داستان، ناول اور افسانہ	دردانہ قاسمی	۴۰/۰۰
آل احمد سرور شخصیت اور فن	امتیاز احمد	۱۵۰/۰۰
فروغ تنقید	عبدالمغنی	۷۵/۰۰
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش	عبدالمغنی	۵۰/۰۰
پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی)	خالد حیدر	۱۵۰/۰۰
مقدمہ کلام آتش	خلیل الرحمٰن اعظمی	۳۰/۰۰
شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی	حسن احمد نظامی	۱۷۵/۰۰
افکار و انشاء	وارث کرمانی	۸۰/۰۰
مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱۵/۰۰
مضامین مسعود	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۱۲۵/۰۰
باغ و بہار	مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی	۳۵/۰۰
موازنہ انیس و دبیر	مقدمہ ڈاکٹر فضل امام	۴۰/۰۰
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی	۳۵/۰۰
امراؤ جان ادا	مقدمہ تمکین کاظمی	۴۰/۰۰
مجموعہ نظم حالی	مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۵/۰۰
مثنوی گلزار نسیم	مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی	۲۰/۰۰
مثنوی سحر البیان	مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی	۲۰/۰۰
انار کلی	مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن	۲۰/۰۰

سیاسیات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن)	محمد ہاشم قدوائی	۹۰/۰۰
اصول سیاسیات (پرنسپل آف پالیٹیکل سائنس)	"	۸۰/۰۰
جمہوریۂ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	"	۶۰/۰۰
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس)	"	۶۰/۰۰

متفرق

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
اصول تعلیم	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۴۰/۰۰
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۴۵/۰۰
تعلیم اور اس کے اصول	محمد شریف خاں	۲۵/۰۰
تنظیم مدارس کے بنیادی اصول	محمد شریف خاں آفاق احمد	۲۵/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	مسرت زمانی	۵۰/۰۰
جدید تعلیمی نفسیات	محمد شریف خاں	۵۰/۰۰
سائنس کی تدریس	وزارت حسین	۵۰/۰۰
علم سماجیات تصورات و نظریات	ضیاء الدین علوی	۲۰/۰۰
جدید علم سائنس	وزارت حسین	۳۰/۰۰
رہبر تندرستی	مسرت زمانی	۳۵/۰۰
رہبر صحت	مسرت زمانی	۲۵/۰۰
علم خانہ داری	مسرت زمانی	۴۰/۰۰
بچوں کی تربیت	مسرت زمانی	۳۵/۰۰
گلدستۂ مضامین و انشاء پردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۴۰/۰۰
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی	۲۰/۰۰
اردو شکشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے)		۱۰/۰۰
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم اے شہید	۴۰/۰۰

ناول اور افسانے

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
چار ناولٹ (ناولٹ)	قرۃ العین حیدر	۷۵/۰۰
آخر شب کے ہمسفر (ناول)	قرۃ العین حیدر	۱۰۰/۰۰
روشنی کی رفتار (افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/۰۰
ضدی (ناولٹ)	عصمت چغتائی	۲۵/۰۰
آنگن (ناول)	خدیجہ مستور	۷۵/۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور انکے افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۴۵/۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے	"	۶۰/۰۰
ہمارے پسندیدہ افسانے	"	۶۰/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	"	۶۰/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	"	۵۰/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	قمر رئیس	۶۰/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲